مُصنفہٗ

(سید العلماء) السید علی نقی النقوی

[illegible] نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک

"ادارۂ علمیہ" لکھنؤ کی قابلِ قدر کتابیں

- **کشف النقاب عن عقائد ابن عبد الوہاب** (عربی) یہ وہ گرانقدر کتاب ہے جس پر علمائے عراق و ایران و شام نے بہترین الفاظ میں تبصرہ کیا، اور نجف اشرف میں شائع ہوئی، صرف چند کاپیاں باقی ہیں ... ... قیمت علاوہ محصول ۸ر
- **اقالۃ العاثر فی اقامۃ الشعائر** (عربی) مطبوعۂ نجف اشرف، شعائر عزاداری کے متعلق بعض فقہی مباحث پر عالمانہ تبصرہ ہے ... ... قیمت علاوہ محصول ۵ر
- **نقد الفرائد فی اصول العقائد** (عربی) مطبوعۂ طہران، اس میں اصول دین کا مختصر اور لطیف پیرایہ میں بیان ہے ... ... قیمت علاوہ محصول ۳ر
- **حجج و بیّنات** (عربی و اردو) اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اس میں سنہ ۱۳۵۰ھ میں مشاہد مشرفہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے جو حیرت انگیز معجزات ظاہر ہوئے ہیں ان کے مستند تفصیلی واقعات ذاتی تحقیقات اور کاوش کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں قیمت علاوہ محصول ... ... عمر
- **مقدمات تفسیر القرآن** (عربی) یہ کتاب لکھنؤ یونیورسٹی کے نصاب فاضل تفسیر میں داخل ہے ... ... قیمت علاوہ محصول ... ... عمر
- **تفسیر سورۃ الفاتحہ** (عربی) قیمت علاوہ محصول ... ... عمر
- **النجعۃ فی اثبات الرجعۃ** (عربی) عقیدۂ رجعت پر اہم تبصرہ، قیمت علاوہ محصول ۲ر
- **وجیزۃ الاحکام** (اردو) مسائل فقہیہ کا مختصر مجموعہ، قیمت علاوہ محصول ۴ر
- **روح الادب شرح لامیۃ العرب** (عربی و اردو) مشتاقین علم ادب اور بالخصوص یونیورسٹی کے طلاب کے لیے نہایت مفید کتاب ہے ... قیمت علاوہ محصول ۶ر
- **تلخیص عماد الاسلام** (کتاب التوحید عربی) مجدد مائۃ ثالثہ عشر حضرت غفرانمآب طاب ثراہ کی مشہور گرانقدر کتاب کا بہترین خلاصہ ہے ... قیمت علاوہ محصول ۱عمر
- **البیت المعمور فی عمارۃ القبور** (اردو) اس رسالہ میں قبۂ و قبور کے متعلق عام اسلامی نقطۂ نظر سے فیصلہ کُن بحث کی گئی ہے اور وہابی خیالات کا تار و پود بکھرا گیا ہے قیمت علاوہ محصول ۴ر
- **المتحف العربی من الادب العصری** (عربی) یہ کتاب عربی زبان کے جدید نظم و نثر کے بلند پایہ انتخابات کا مجموعہ ہے، لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل ادب اور بی اے کے نصاب میں داخل ہے قیمت علاوہ محصول ... ... عمر

(مذکورہ بالا کتابیں حضرت سید العلما دام ظلہ کی تصنیف ہیں)

مقدّمہ

تفسیر قرآن

مصنّفہٗ

(سیّد العلماء) السیّد علی نقی النقوی (دام ظلہ)

باہتمام "ادارۂ علمیّہ" لکھنؤ

نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا

اعتراف و شکریہ

قابل قدر ہیں وہ افراد جو اپنے سرمایۂ حیات کو کار باقی میں صرف کر کے حیات جاودانی کا سامان مہیا کریں۔

یہ گرانقدر سلسلہ "تفسیر قرآن" جس کی اشاعت کا شرف "ادارۂ علمیہ" کو حاصل ہو رہا ہے بہت پہلے منظر عام پر آچکا ہوتا مگر سرمایہ کی کمی سد راہ تھی۔

فخر کے قابل ہے عالیجناب حاجی ببر سید حسن صاحب قبلہ رئیس آگرہ کی ذات کہ آپ نے اس کار خیر کو انجام دیا اور ایک گرانقدر عطیہ کے ساتھ اس جلد کی اشاعت کا سامان مہیا فرما دیا۔ اب اسی جلد کی قیمت سے دوسرے حصص انشاء اللہ شایع ہونگے اور سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہونچے گا۔

والسلام

ناظم "ادارۂ علمیہ"

نمبر ۲۵۹۲ عبد العزیز روڈ ــــ لکھنؤ

جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۹ھ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ایک اردو زبان کی مکمل تفسیر قرآن کی ضرورت ہے یا نہیں؟
اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ روزانہ نئے نئے اعتراضات قرآن مجید کے اوپر کئے جاتے ہیں جنکے جوابات یا تو عربی زبان کی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں لیکن عام افراد کو انکی اطلاع نہیں اسلئے وہ ان سوالات سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور یا وہ اعتراضات خود نئے زمانہ کی پیداوار ہیں اسلئے قدما کو ان کے جواب کی طرف توجہ نہ ہوئی تھی۔

فلسفہ کے نئے نئے نظریے جو یورپ سے سمندر پار ہو کر اس سرزمین پر آتے ہیں اور مختلف افراد کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں وہ انکے دلوں میں مذہب کے ہر شعبہ کے متعلق ایسے شبہے پیدا کرتے ہیں جنکا حل اگر انہی کی ذہنیتوں کے موافق اور مذاق کے مطابق پیدا نہ کیا جائے تو وہ اس شبہہ کے گرویدہ بنکر اس کو عقیدہ کی حیثیت سے اختیار کریں گے اور مذہب سے دور ہو جائینگے۔

خاص ہندوستان کے ملک میں فرقہ سازی و مذہب تراشی کا وہ طوفان ہے کہ اللہ کی پناہ۔ روزانہ نئے نئے مذہب پیدا ہوتے رہتے ہیں نئے نئے پیغمبر اور امام ڈھلتے رہتے ہیں۔ نئے نئے اصول اور عقیدے بنتے رہتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر قرآن کے آیات کو معنی بدل کر مفہوم میں تغیر دیکر عوام کے گوش گذار کرتے ہیں اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اسکے علاوہ وہ لوگ جو اپنی "قرآن فہمی" کے بلند بانگ اظہار کو مکمل کرنیکے لئے یہ دعویٰ

کرتے ہیں کہ ہم ہر چیز قرآن سے ثابت کرسکتے ہیں وہ ایسے ایسے تاویلات آیات قرآن کے کرتے ہیں کہ انسان عش عش کرنے لگتا ہے لیکن حقیقۃً الفاظ قرآن سے انکو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مناظرین، واعظین اور ذاکرین نے اس دائرہ کو بہت وسعت دی ہے اور اس دروازہ کو پاٹوں پاٹ کھول دیا ہے۔

اس سب کے بعد مسلمانوں کے قدیم تفاسیر میں وہ عربی زبان میں کیوں نہوں یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ تفسیر قرآن کے روایات میں نقد و تبصرہ سے کام نہیں لیا ہے۔

اُنھوں نے وہ تمام خیالات آنکھ بند کرکے نقل کر دئے ہیں کہ جو مختلف لوگوں نے بعض آیات قرآن کی تفسیر کے متعلق بیان کئے ہیں حالانکہ نہ تو وہ ظاہری الفاظ قرآن کے معانی ہیں جن میں ہر اہل زبان کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہو نہ وہ رسالتمآب سے بواسطہ یا بلاواسطہ منقول ہیں تاکہ اُن کی ذمہ داری اسلام اور مسلمانوں پر عائد ہو مثلاً قیامت کی بات ہے کہ ہماری اسلامی تفسیروں میں حضرت داؤد کے واقعہ والے آیات کے ذیل میں وہ تمام واقعات درج کردئے گئے ہیں جو توریت میں حضرت داؤد اور اوریائے حتی کی زوجہ کے معاملہ میں درج ہیں جس کی وجہ سے عیسائیوں کو یہ موقع ملے کہ وہ قرآن کی طرف بھی حضرت داؤد کی طرف زناکاری کے نسبت کی (معاذ اللہ) نسبت دیں حالانکہ جو شخص قرآن مجید کے آیات کا اس موقع کے اوپر بغور مطالعہ کرے اُسے پتہ چلے گا کہ قرآن مجید کے الفاظ اس الزام سے حضرت داؤد کی برائت کرنے والے ہیں نہ اُن پر یہ الزام عائد کرنے والے۔

ان تمام مصائب کا واحد علاج یہی ہے کہ تفسیر قرآن صحیح طریقہ سے مکمل جانچ پڑتال کے ساتھ اُردو زبان میں پیش کیجائے جس سے عام افراد کو فائدہ پہونچے اور وہ ان تمام دشواریوں سے محفوظ رہیں اور پھر قرآن کی نسبت مسلمانوں کی مذہبی کتاب رسول کا اعجاز، معارف کا خزانہ، حقائق کا

گنجینہ ہونیکی بنا پر بھی مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اُسکے معانی کو سمجھیں، غور کریں، سبق حاصل کریں اور دوسرے علم دوست حقیقت پسند، انصاف پرور افراد کو اُن پر صبر وسکون اور سنجیدگی کیساتھ غور کرنے، رائے قائم کرنے اور مستفید ہونے کا موقع دیں۔

قرآن کی تفسیر کی صحیح خدمت ادا کرنا صرف مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش منفعت رساں نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام اقوام کے لئے یکساں طور سے فائدہ بخش ہے اور کم از کم جس زبان میں وہ تفسیر کی جائے اُس زبان والوں کے لئے تو بلا تفریق مذہب و ملت وہ ایک مفید خدمت سمجھی جاسکتی ہے اور اسکے بعد یہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں منتقل ہو کر دوسرے افراد کیلئے بھی فائدہ بخش ثابت ہوسکے۔

یہ فرض انتہائی اہم ہے اور میں تو اس کو کسی حیثیت سے ادا کرنیکے قابل ہی نہ تھا اسلئے باوجود مدت مدید سے اس فرض کے احساس کرنیکے میں نے اپنے قلم کو خاموش رکھا لیکن احباب کے پیہم اصرار اور ضرورت کے ناقابل برداشت احساس نے بہزار دقت اپنی سیکڑوں مصروفیتوں کے باوجود اس کام کو شروع کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اور اس عظیم مقصد کو پیش نظر رکھکر جسکے پورا کرنے کے لئے ایک عمر کی ضرورت ہے صرف خدا کی تائید پر بھروسا کرتے ہوئے اس افتتاحیہ کو تحریر کر رہا ہوں۔

کامیابی و کامرانی اُسی کی توفیق اور تائید پر موقوف ہے۔

قرآن کی تفسیر کے اصل موضوع کو شروع کرنے کے قبل چند تبصرے ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا تبصرہ

پہلا تبصرہ

قرآن کی لفظی تشریح

قرآن مجید اور حدیث قدسی میں تفرقہ

ن" کی تشریح

"قرآن" "قراءۃ" سے ماخوذ ہی۔ اسکے اصلی معنی لغت اور محاورہ کے اعتبار سے جمع کرنیکے ہیں کتابت کے عام طور پر رواج پانے کے پہلے کسی انشا نظم یا نثر مجموعہ کے جمع کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اسکو سینہ میں محفوظ یعنی از بر یاد کر لیا جائے اسی بنا پر صدر اسلام میں "قراءت" بمعنی "حفظ" مستعمل ہوتا تھا اور حافظ قرآن کو "قاری" کہتے تھے۔

چونکہ یہی حفاظ حروف قرآن کے طریقۂ ادا، اور اُن کے مخارج و کیفیات سے واقف ہوتے تھے اور اُس کو لحن کے ساتھ پڑھتے بھی تھے اسلئے رفتہ رفتہ "قراءۃ" بمعنی علم مخارج حروف ہو گیا اور "قاری" یعنی مخارج کا جاننے والا اگرچہ "حافظ" نہو لیکن یہ بعد کے زمانہ کا محاورہ ہی صدر اسلام میں ایسا نہیں تھا پھر چونکہ جمع کا ایک ادنیٰ درجہ یہ بھی ہی کہ انسان پوری کسی تحریر پر نظر ڈال لے اور اُس کو ذہن نشین کر لے اسلئے "قراءت" کے معنی مطلق "پڑھ لینے" کے بھی عام زبانوں میں رائج ہو گئے اور یہ محاورہ بھی صدر اسلام کے شروع ہی سے نظر آتا ہی۔

"قرآن" خداوندی محاورہ میں نام بن گیا ہی اُن الفاظ و کلمات کا جو بطور وحی جبرئیل امین کے توسط سے حضرت خاتم النبیینؐ پر بحیثیت معجزہ اتارے گئے ہیں۔

قرآن اور حدیث قدسی میں فرق

اور اسی آخری قید "بحیثیت معجزہ" سے فرق ہو گیا ہے "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں کیونکہ حدیث قدسی بھی خدا کی طرف کے پیغام ہیں جو فرشتہ کے ذریعہ سے رسالتمآبؐ تک پہونچے

ہیں لیکن وہ خاص آپکے دعوئے نبوت کی دلیل بناکر یعنی معجزہ کی حیثیت سے نازل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ وہ خاص خاص مواقع اور حالات میں خاص خاص خطابات ہیں جو براہ راست رسول ؐ کی طرف متوجہ ہیں یا آپکے توسط سے اُمت تک پہونچائے گئے ہیں جیسے لولاك لما خلقت الافلاك ۔ عبدی اطعنی حتی اجعلك مثلی ۔ لا یزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتیٰ اکون سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ الخ ۔ لا الٰہ الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

یہ کھلا ہوا اور صاف فرق ہے جو عام طور سے زبان زد بھی ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں ایک دوسری حیثیت سے بہت بڑا فرق ہے جسکی بنا پر دونوں کی نوعیت ہی جداگانہ اور مختلف ہو جاتی ہے ۔ اسکے سمجھنے کے لئے انسان کو اپنے درمیانی نامہ و پیام کی نوعیت پر نظر ڈالنا چاہیئے ، اسوقت حقیقت حال کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہوگی ہم کسی اپنے عزیز کے پاس اپنے دوست خاص یا معتمد ملازم کے ذریعہ سے کوئی پیغام بھیجتے ہیں پیغام کے معنی ؟ یعنی ہم اپنے مقصد ۔ اپنے دل کی بات ، اپنے مافی الضمیر ، اپنے منشا ، اپنے مفاد کو اُس دوست یا ملازم کے ذہن نشین کر دیتے ، خوب سمجھا دیتے ہیں تاکہ وہ اُس مقصد ، مراد ، منشا کو صحیح طور سے ہمارے اُس عزیز تک پہونچا دے ۔ اس مقام پر سفارت کا مقصد ۔ پیغام رسانی کا مفاد صرف ہمارے دلی منشا اور مراد کا اُس مرسل الیہ تک پہونچ جانا ہے ۔ اگر قلبی مفاد کوئی مجسم شکل رکھتا ہوتا تو یقیناً ہم اسے خود اپنے سفیر کے ہاتھ اس کے ذریعہ سے مخاطب اصلی تک پہونچانے کی

ع ۵ اگر تم نہ ہوتے (اے رسول) تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا ع ۵ میرے بندہ میری طاعت کر تاکہ میں تجھ کو اپنا نمونہ بنا دوں ۔ ۵ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میری درگاہ میں قریب ہوتا جاتا ہے یہانتک کہ میں اُس کا سننے والا کان بنجاتا ہوں ، دیکھنے والی آنکھ بنجاتا ہوں الخ ۵ لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو میرے قلعہ میں داخل ہوا میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا ۔

کوشش کرتے مگر مشکل یہ ہے کہ قلبی مفاد اپنے معنوی دائرہ کے اندر دیکھنے کے قابل شکل نہیں۔ سننے کے قابل آواز نہیں۔ پکڑنے کے قابل جسم نہیں۔ غرض کسی حیثیت سے ظاہری حواس میں آنیکے لائق نہیں، نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونیکے قابل۔

اسلئے ہم بھی مجبور ہیں کہ اپنے نمایندہ تک "الفاظ" کے ذریعہ سے اپنے مقصد کو پہونچائیں اور وہ بھی مجبور ہے کہ ہمارے مخاطب اصلی تک اُس مقصد کو "الفاظ" ہی کے ذریعہ سے پہونچائے۔

الفاظ اس موقع پر ناگزیر صورت سے استعمال ضرور کئے جاتے ہیں لیکن حقیقۃً مفاد سفارت کا تعلق الفاظ کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ درمیانی سفیر الفاظ میں تغیر و تبدل کر دے جس سے کچھ کا کچھ ہو جائے لیکن مطالب میں تبدیل نہ ہونے پائے، مقصد میں کمی نہ ہو تو وہ ایک کامیاب سفیر، صحیح پیغام رساں سمجھا جائے گا۔

الفاظ کے تبدیل سے اُسپر کوئی الزام عائد نہ ہوگا اور نہ وہ اس میں مجرم قرار دیا جائیگا۔

بلکہ اکثر اوقات اُسے الفاظ کی تبدیل ضروری ہوگی۔ جیسے اُس وقت کہ جب ہماری اور ہمارے اصلی مخاطب کی زبان مختلف ہو اور ہمارا پیغام رساں دونوں زبانوں سے واقف تو ہم اُس سے اپنا مقصد اپنی زبان میں کہیں گے لیکن اُسے اصلی مخاطب سے ہمارا مقصد اُسکی زبان میں کہنا ہوگا۔

وہ اس موقع پر ہمارے ہی الفاظ کو نقل کر دے تو یہ اسکی حماقت اور عقلی کوتاہی سمجھی جائیگی اسی طرح ایک زبان کے جاننے والوں میں ہمارا پیغام رساں ذہین ہے مختصر لفظوں میں مطلب ذہن نشین کرتا ہے لیکن جسے پیغام دیا گیا ہے وہ جاہل، کند ذہن، نافہم ہے۔

ہمیں اپنے مخاطب یعنی پیغام رساں سے مختصر لفظیں کہدینا کافی ہے لیکن اُسکے عقل و تدبر کا

تقاضا ہے کہ وہ اپنے مخاطب یعنی مرسل الیہ سے اتنا کھول کے اس مطلب کو کہے کہ وہ سمجھ جائے

اس کا نام ہے پیغام جس میں "نقل بالمعنی" یعنی اصل مقصود کو جداگانہ لفظوں میں بیان کرنیکی سفیر کو گنجائش حاصل ہے۔

دوسری صورت ہے "نامہ" کی اسکی نوعیت مختلف ہے یہاں معانی کو الفاظ سمیت نقوش کے طلسم میں محفوظ کیا جاتا ہے اور انہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہونچانیکی ذمہ داری عائد ہوتی ہے

یہاں اگر ہمارا قاصد۔ نامہ بر۔ سفیر خط کو پھاڑ ڈالے، دوسرا خط اسی مضمون کا تحریر کر دے یا اس کے مطلب کو بلا کم و کاست زبانی جا کر بیان کر دے تو وہ کسی طرح اپنے فرض کو انجام دینے والا، سفارت ادا کرنیوالا نہیں سمجھا جا سکتا، وہ خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہے اور بددیانتی کا ملزم

زبانی پیغام میں بھی یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ غرض کسی نہ کسی طرح الفاظ سے متعلق ہو جائے مثال کے طور پر ہمارے دوست نے ہم سے ایک دعا دریافت کی تھی کہ وہ صبح اُٹھکر پڑھ لیا کرے ہم نے کسی شخص سے جو وہاں جا رہا تھا کہا کہ تم اُن سے کہدینا کہ آپ صبح اُٹھکر یہ دعا پڑھ لیا کیجئے۔

یہاں اس جملہ تک کہ "آپ صبح کو اُٹھکر یہ دعا پڑھ لیا کیجئے" پہلی قسم کے پیغام کی حیثیت ہے جسمیں درمیانی شخص کو الفاظ میں تغیر و تبدل کا حق ہے لیکن جہاں سے وہ دعا شروع ہوئی ہے پھر درمیانی شخص کو کسی زیادتی کا اختیار نہیں ہے اگر اُس نے اسمیں کوئی کمی یا زیادتی کی تو وہ ناقابل اعتبار سمجھا جائیگا۔

دوسری مثال ہمارے کسی شاگرد نے کوئی شعر سنایا تھا، اصلاح چاہی تھی یا ہم نے خود اُس کا شعر سنکر اُسے پسند نہیں کیا، ترمیم ضروری سمجھی ایک درمیانی شخص جو جا رہا تھا شعر یاد رکھنے اور سمجھنے کے قابل تھا۔ ہم نے اُس سے کہا کہ فلاں شخص سے کہنا کہ آپ اپنے

شعر کو اس طرح بنا لیجئے"

یہاں اتنے الفاظ ہیں کہ" آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے" درمیانی شخص کو تغیر و تبدل کا حق ہے مثلاً وہ کہدے کہ آپ اپنے خط میں اس طرح اصلاح کر لیجئے، اسطرح ترمیم کر دیجئے وغیرہ وغیرہ لیکن اصل شعر میں وہ کچھ تغیر و تبدل کر دے یہ جائز نہوگا۔ اس کو اُسے انہی الفاظ میں پہونچانا چاہیئے جو ہم نے اسکے لئے بتلا دیے ہیں۔

جب یہ دو نوعیتیں معلوم ہوگئیں تو اب "حدیث قدسی" اور "قرآن" کا تفرقہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

"حدیث قدسی" خدا کا پیغام ہے جو جبرئیل امین یا کسی اور ملک مقرب کے ذریعہ سے رسالتمآبؐ تک پہونچتا تھا، اسکی نوعیت پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔

یعنی ملک مقرب۔ فرشتہ سماوی یا "روحانی ذی شعور طاقت" کے اوپر مبدء فیض یعنی حضرت احدیت کی طرف سے مراد الٰہی، منظور حضرت احدیت کا القا بطور معانی ہوتا ہے اور وہ اُسے رسالتمآبؐ تک بطور پیغام پہونچاتا ہے اور رسولؐ اسکو اپنی امت سے بطور اعلان و اظہار بیان فرماتے ہیں جس میں درحقیقت اصل پیغام کا انتساب خدا کی طرف بحیثیت معانی ہے۔ الفاظ اُس کے نقل و انتقال اور اظہار و بیان کا لازمی خاصہ ہیں جنکو کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں ہے۔

اس قسم کے احادیث کے الفاظ اگر رسولؐ سے براہ راست سنے جاتے تو انکیں کسی قسم کا شک و شبہہ ممکن نہیں تھا۔

اسلئے کہ ناقل یعنی مراد الٰہی اور پیغام خداوندی کے ملک۔ اور رسولؐ دونوں معصوم

سلہ یہ ملک کے مفہوم کی تشریح جدید مذاق کے مطابق کی جاسکتی ہے

جنپر کسی قسم کی غلطی کا شک وشبہہ نہیں ہوسکتا لیکن ان احادیث کے بوسائط نقل ہونے میں جیسا کہ موجودہ نسلوں کیلئے ضروری اور ناگزیر ہے رسالتمآبؐ کے علاوہ دوسرے رواۃ اور محدثین کے بھی نقل بالمعنی کا امکان ہے جس کے بعد اُن کے متعلق وہ یقین حاصل نہیں ہوسکتا جو خود رسالتمآبؐ کی زبان سے ان الفاظ کے سننے میں ہوتا یا موجودہ زمانہ میں قرآن مجید کے آیات کے متعلق حاصل ہے۔

قرآن کی نوعیت دوسری قسم کے نامہ وپیغام کی ہے۔ یہاں اصل الفاظ ہیں جو حضرت احدیت کی طرف سے نفس ملک ورا اُسکی زبان پر خلق ہوئے ہیں اور وہ الفاظ اس کی زبان سے رسولؐ کے گوش گذار ہوئے اور رسول کے ذریعہ سے امت تک پہونچے اور امت میں سینہ بسینہ اور نقش وکتابت کے علامات کے ذریعہ سے ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوئے۔

اُن میں نہ نقل بالمعنی کی گنجائش ہے نہ کسی قسم کی تغیر وتبدل کا اختیار۔ بیشک ترجمہ کی اجازت ہوتا کہ اسکے معنی سمجھ میں آسکیں لیکن اس ترجمہ کو کلام الٰہی سمجھنا اور اُسپر احکام قرآن کا مرتب کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں الفاظ کی خصوصیت مدنظر ہے اور اسی بنا پر اُس سے جو یقین حاصل ہوسکتا ہے وہ حدیث قدسی سے نہیں۔ حدیث قدسی کی حیثیت دوسرے احادیث کی سی ہے جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے مروی ہیں کہ ان میں سلسلۂ سند کے دیکھنے کی ضرورت ہے جس کے اعتبار سے صحیح، حسن، موثق، ضعیف کے اقسام پیدا ہونگے اور جن میں سے بعض معتبر قابل عمل ہونگے اور بعض معتبر نہ ہونگے۔

ان احادیث قدسیہ کا بڑا ذخیرہ شیخ حر عاملی صاحب وسائل نے اپنی کتاب "جواہر سنیہ فی الاحادیث القدسیہ" میں جمع کیا ہے جو بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔

قرآن مجید کے مذکورہ بالا معنی یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ الفاظ جو رسولؐ پر بطور معجزہ بذریعہ

جبرئیل امین وحی کی صورت میں پہونچائے گئے" ایسے معنی ہیں کہ جس کے اعتبار سے کل اور جزو کم اور زیادہ یہانتک کہ ایک آیت بلکہ بعض اجزائے آیت پر بھی "قرآن" کا اطلاق صحیح ہے بلکہ ایک لفظ پر بھی جبکہ اسکا لکھا جانا بالقصد جزو قرآن ہونے کے معلوم ہو۔ لیکن نظر غور یہ بتلاتی ہے کہ "قرآن" کی لفظ صرف مذکورہ بالا مبہم اور عام مفہوم سے مخصوص نہیں ہے جو جزو کل، قلیل اور کثیر پر برابر سے صادق آتا ہے بلکہ وہ اس کے ساتھ اس مکمل کتاب کا نام بھی ہے جو اس وحی کے اجزاء کا مکمل پورا مجموعہ کہی جا سکے جیسے توریت۔ انجیل۔ زبور۔ اسی طرح "قرآن" اور اس معنی سے ارشاد ہوا ہے

لقد اٰتینٰک سبعا من المثانی والقراٰن العظیم"

"ہم نے تم کو عطا کیں سات دو رنگ والی آیتیں (سورۂ حمد) اور قرآن عظیم"

دوسرا تبصرہ

دوسرا تبصرہ

نزول قرآن کی حقیقت

اور

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے معنی

بیرونی کے معنی

"ہمارا کلام" ہمارے لب و دہن سے نکلتی ہوئی آواز ہے جو مختلف مقاطع پر رکتی ٹھہرتی، بڑھتی گھٹتی ہوئی مختلف حروف کی تشکیل کرتی اور انسے مختلف الفاظ کی صورت گری کرتی ہے۔ اسکی سیال ہستی ہے وہ بے ثبات وجود رکھتا ہے۔ اسکا ہر دوسرا جزو بغیر پہلے جزو کے

فنا ہوئے آ نہیں سکتا اُسکا ہر حاضر بات کہتے کہتے غائب اور ہر حال زبان ہلانے کیساتھ ہی ماضی بن جاتا ہے۔

ہمارا وجود غیر مستقل ہے ہماری ہستی خود نفس کے آمد وشد کی رہین احسان ہے اسلئے ہمارا کلام بھی یہ ہوسکتا ہے، ہم اعضاء وجوارح کے پابند ہیں، ہم جسم وجسمانیات سے بے نیاز نہیں ہیں اس لئے ہمارے زبان بھی ہوتا لو بھی حلق بھی ہے اور حنجرہ بھی۔ دہن کی فضا بھی ہے اور آہیں آواز بھی حادث ہیں تو محل حوادث بھی اسلئے ہمارا کلام وہی ہے کہ جو خود ہمارے دہن سے نکلے، ہماری زبان سے صادر ہو اور ہماری آواز کے ساتھ مخاطب کے گوش گذار ہو۔

"خدا کا کلام" بھی اگر اسی حیثیت سے سمجھا جائے تو اُس میں اور ہم میں فرق کیا رہا۔ غیر مستقل، وجود کے ساتھ فوراً ہی سپرد عدم ہوجانے والے الفاظ، آواز کے اُتار چڑھاؤ کی پیداوار اُن کا مرکز ذات احدیت ہو تو وہ خود قدیم تغیر سے بری جو حوادث کے دسترس سے بلند و برتر کب رہ جائیگا؟ وہ محل حوادث ہو تو اُسکے حادث ہونے میں کسر کیا رہ گئی؟

اس لئے کسی با ہوش انسان کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ خدا کے کلام کے معنی اُسکے دہن سے نکلے ہوئے الفاظ وکلمات کی حیثیت میں قرار دے۔

فرقۂ اشاعرہ[۱] نے اس مشکل کا واحد حل "کلام نفسی" کے الفاظ میں تجویز کیا۔

"کلام نفسی" کیا ہے؟ علم کے علاوہ، ارادہ کے علاوہ، مشیت کے علاوہ تمام اُن صفات کے علاوہ جو خدا کی ذات کے لئے انسانی عقل میں آئیں اور الفاظ سے ادا کیجا سکیں وہ مرتب معانی نہیں استغفر اللہ کلمات، جملوں کا مجموعہ ہے جو نفس میں پیدا ہوتا ہے اور الفاظ اپنے تدریجی وجود سے اُسی مجموعہ کے آئینہ بردار، ناقل اور حاکی ہوتے ہیں۔

وہ خدا کی ذات میں ازل سے ثابت ہے۔ قدیم ہے۔ اسمیں تجدد اور تدریج نہیں ہے

---

[۱] سواد اعظم یعنی اہلسنت کی اکثریت

یہ انتہائی توضیح ہے "کلام نفسی" کی لیکن اس سے سمجھ میں کیا آیا ؟ کچھ نہیں۔

علم سے الگ۔ ارادہ سے الگ مشیت سے الگ جو چیزیں عقل میں آنے کی ہیں اُن سب سے الگ۔ پھر یہ کیا ؟ کلمات اور جملوں کا مجموعہ نفس میں ! یعنی جی ؟

کیا اس کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ جس طرح انسان بات کرنے کے پہلے سوچتے کہ مجھے کیا کہنا ہے، وہ دل ہی دل میں الفاظ تجویز کرے کہ میں یہ کہونگا۔ یہ کہونگا۔ بیشک یہاں ایک مجموعہ الفاظ وجمل کا دل میں پیدا ہوتا ہے جس کو زبان ودہن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا یہی ہے "کلام نفسی"؟ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ کلمات والفاظ کا یہ تصور بھی بالکل وہی تدریجی وجود کی کیفیت رکھتا ہے جو خود الفاظ کے دہن سے نکلنے میں ہوتی ہے۔

یعنی ایک لفظ کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا یہ الفاظ ایک مسلسل نظام کیساتھ پیدا ہوتے ہیں جن کو مستقل بقا اور ثبات نہیں ہے۔

پھر اس کو قدیم، ازلی، ثابت الذات اور برقرار رکھنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے ؟

یہ بھی غور کے قابل ہے کہ "کلام نفسی" میں تمام اجزاء اور حصص ایک درجہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ حاصل ہیں تو کلام لفظی میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر ترتیب وتنظیم کہاں سے پیدا ہوجاتی ہے جبکہ کلام لفظی ایک آئینہ ہے جو اُسی "کلام نفسی" کی حکایت کرتا اور اُسی کا ناقل ہے۔

پھر وہ کلام نفسی ازل سے موجود۔ قدیم خدا کی ہستی کے ساتھ یعنی اُس کی ذات کا ایک جزو ہے اُسے حضرت موسیٰ کے ساتھ کوہ طور پر کیا تعلق پیدا ہوتا ہے جو ارشاد ہوا کلم اللّٰہ موسیٰ تکلیما "خدا نے موسیٰ سے بات کی پوری پوری طرح" وہ پیغمبر آخر الزمان پر کس طرح نازل ہوا اور امت کے ہاتھ میں کس طرح پہونچا جو یہ کلام اللہ "خدا کا کلام" کہلاتا ہے۔

ہم تو ذات الٰہی کو قدیم ہونے میں یکتا اور ازلی ہونے میں بھی لاشریک خیال کرتے ہیں۔

ہم اُس کی ذات کے لئے صفات قرار ہی نہیں دیتے جو اس کی ذات کے علاوہ قدامت کا درجہ رکھتے ہوں

ہم خدا کے متکلم ہونے کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کلام کا خالق ہے اور کلام بحیثیت مخلوق اسکی طرف نسبت رکھتا ہے۔

وہ لوگ جو خداوند عالم کو بندوں کے تمام افعال کا ذمہ دار اور اُنکے ہر قول و عمل کا خالق مانتے ہیں، اُنکو اس میں کوئی ندرت معلوم نہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خدا ہر اُس بات چیت رگفتگو کا جو کسی انسان کی زبان سے صادر ہوتی ہے خالق ہے لہذا یہ سب ہی کلام اللہ قرار پاتا ہے لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم انسانوں کے ذاتی افعال کا ذمہ دار خود انسانوں کو سمجھتے ہیں اور بندوں کے افعال و اقوال کا موجد خود بندوں کو، ان کو خدا کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اعضاء و جوارح۔ آلات و ذرائع جن سے یہ اعمال و اقوال صادر ہوتے ہیں خدا کے مخلوق ہیں لیکن اُن افعال و اقوال کا خود صدور، وہ ہرگز خداوند عالم کی ایجاد و خلقت کا نتیجہ نہیں۔

اس طرح یہ دائرہ بہت تنگ ہوجاتا ہے۔ خدا کا کلام وہی کلام سمجھا جائیگا جو انسانی ارادہ و اختیار، کارگذاری و صناعی سے خارج ہو اور جس کی خداوند عالم نے اپنی طرف نسبت بھی دی ہو۔ ایسے اشیاء جو ذاتی حیثیت سے قوت نطق سے محروم ہیں جیسے نباتات، جمادات، اکثر حیوانات ان میں جب آواز پیدا ہوگی تو وہ ضرور بالضرور خداوند عالم کے ارادۂ خاص کا نتیجہ ہوگی، اب اگر خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا ہے بلکہ اُس آواز کی نوعیت ایسی ہی ہے کہ گویا وہ خود اس شئے ہی کا کلام ہے، جیسے سنگریزوں کا دست رسالتمآبؐ میں تسبیح پڑھنا (جیسا کہ بعض روایات میں ہے) بچہ کا پاکدامانی یوسف کی گواہی دینا (جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے) حضرت داؤد کے ساتھ دیوار و در، صحرا و فضا کا مشغول حمد و تسبیح ہوجانا تو اُسے کلام الٰہی کہنا درست نہوگا بلکہ اُسے یوں کہنا پڑے گا کہ سنگریزوں نے قدرت خدا سے تسبیح کی۔ بچہ نے قدرت خدا سے گواہی دی۔

دیوار و در نے قدرت خدا سے حمد و تسبیح ادا کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اس شئے میں عارضی طور سے سہی قوت گویائی عطا کر دی جس کے بعد جو کلام ہو وہ پھر اسی شئے کا خود کلام ہے، خدا کا کلام نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس کلام کو اپنی طرف منسوب بھی کیا ہو یعنی حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے اس شئے کو اپنا ترجمان قرار دیتے ہوئے جو بات کہنا تھی اسے بطور آواز اس شئے میں خلق کر دیا ہو جیسے درخت کی آواز موسیٰ کو انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی۔ بے جان چیز کی آواز۔ ہو نہ ہو خدا کی قدرت سے پھر طرز کلام، لب و لہجہ عنوان تخاطب سے ظاہر کہ آواز درخت کی سہی مگر کلام کسی اور کی طرف سے ہے نہیں تو درخت خود خدا ٹھہرتا۔ موسیٰ کا پروردگار خود درخت بنجاتا لیکن حضرت موسیٰ معرفت رکھتے تھے درخت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔

سمجھے کہ درخت مجازی پردہ ہے جس میں متکلم حقیقت اپنی خلق کی ہوئی آواز کیساتھ مصروف کلام ہے۔ یہ خدا کا پہلا کلام تھا جس کے بعد موسیٰ کلیم اللہ قرار پائے جب گفتگو ہوئی ایسے ہی پردہ میں طور پر کی گفتگوئیں زیادہ تر ابر کی صورت میں ہیں جیسا کہ توریت میں تذکرہ ہے۔

وہ لوگ جو خدا کو کلام نفسی کی بنا پر متکلم قرار دیتے ہیں انھیں بھی اسکے اعتراف سے گریز نہیں اسلئے کہ خدا کا قدیم ازلی کلام نفسی حدود میں اپنے اس قابل نہیں ہے کہ وہ موسیٰ کے گوش زد ہو نہ وہ اپنے ازلی و قدیم وجود سے موسیٰ کے کلیم اللہ بننے کا باعث تھا۔ موسیٰ کلیم خدا جو ہوئے تو وہ اسی کلام سے جو درخت یا ابر کی صورت میں انکے گوش زد ہوا۔ اب اگر یہ خدا کا کلام نہ تھا تو موسیٰ اس کی بنا پر کلیم اللہ کیونکر ہوگئے اور اگر یہ خدا کا کلام تھا تو کس طرح جبکہ وہ الفاظ و کلمات کا مجموعہ اور گوش زد ہونے والی آواز ہے جسکے لئے نہ بقا ہے نہ ثبات۔ وہ حادث ہے اور اگر حادث

نہ ہو تو ذات آلہی کے لئے خود اُسکے ثابت ہونے میں کیا مضائقہ تھا جو کلام نفسی ماننے کی ضرورت ہوئی۔
جب حادث ہو تو اس کا خالق کون ؟ ظاہر ہے کہ خدا، خدا کے سوا کون خالق ہو سکتا ہو؟
تو اس کلام کا تعلق خدا کے ساتھ کیا ہوا ؟ یہی نا کہ وہ مخلوق خدا ہے۔ پھر اگر مخلوق خدا کلام کی جہت سے
موسیٰ کا کلیم اللہ تبجانا صحیح ہے تو اسی کے اعتبار سے خداوند عالم کا متکلم کہا جانا بھی صحیح ہو جاتا ہے
کلام نفسی ماننے کا کیا سبب ہے ؟
یہ وہ صورت تھی کہ جہاں کلام کا مظہر بے شعور وارادہ ناقابل تکلم شے یعنی نبات، جماد
حیوان کی کوئی قسم تھی۔
دوسری صورت یہ ہو کہ کلام کسی ذی شعور با ارادہ و اختیار قابل نطق و تکلم انسان کی زبان
پر آئے اور ہمارے گوش زد ہو مگر کلام ایسا ہو کہ جو اُس انسان کے ذاتی حدود ارادہ و اختیار
کے باہر اور ناقابل صدور ہو اور پھر اُسکے تصریحات، نصوص وغیرہ سے اُس کا انتساب خدا کی
طرف ظاہر ہوتا ہو۔ وہ خود بھی بتلادے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اُس کلام کے خصوصیات و
امتیازات بھی اُسے عام انسانی سطح سے بلند ثابت کر رہے ہوں۔
یہ کلام بھی خداوند عالم کا کلام قرار پائیگا جس کے معنی یہ ہونگے کہ اُس نے جس طرح کسی
وقت میں درخت کو اپنا ترجمان، اپنے کلام کا محل مرکز قرار دیا اس طرح اب اس انسان کو اپنے
کلام کا حامل مبلغ ترجمان قرار دیا ہو۔ اسکی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ براہ راست
اپنے رسولؐ کی زبان پر وہ اُس کلام کو خلق فرمائے لیکن اسکے معنی یہ ہوں گے کہ کچھ عرصہ تک
رسولؐ کی زبان، اُنکے دل و دماغ سے ذاتی ارادہ و اختیار کو سلب کر کے انھیں مسخر بنا لیا جائے
اور قہری غیر اختیاری طور پر کچھ اقوال کے ساتھ متکلم بنایا جائے۔
اسلئے کہ اگر ارادہ و اختیار باقی رہا اور اُس کی شرکت سے کلام ظہور میں آیا تو وہ انسان کا

اختیاری کلام ہوگا خدا کی طرف منسوب ہونے کی صلاحیت نہ رکھے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر ذی روح ہستی دیوار درخت پتھر وغیرہ میں خلق کر کے رسول کے گوش گذار ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام قدرت کی طرف سے عالم اعلیٰ کے کسی محل میں خلق ہو اور پھر ملک مقرب یعنی آسمانی فرشتہ کے ذریعہ سے رسالتمآب تک پہونچایا جائے۔

پہلی صورت ایک کامل انسان مصلح خلق کے لئے کسی طرح لائق نہیں ہے اسلئے کہ رسولؐ کی تبلیغ اور تعلیم کلام الٰہی اس صورت میں اختیاری نہیں بالکل جباری ہو جاتی ہے اور ایک صاحب شعور و اختیار شخص کا ایک وقت میں اپنی زبان پر بالکل بے قابو ہو جانا کمال انسانی کے خلاف بھی ہے، اسکے علاوہ حکمت الٰہی کے اقتضا سے رسول کی تبلیغ و تعلیم مصلحت وقت کے لحاظ سے مناسب موقع و محل ہونا ضروری تھی اسلئے کلام الٰہی کے اجرا کے لئے ایسی صورت ہونا چاہیئے تھی کہ اس کا پہونچنا رسول تک تو ہر وقت و ہر موقع پر ہو سکتا ہو لیکن حضرت کی زبان پر اس کا اجرا موقع و محل کی مناسبت سے ہو۔ یہ بات پہلی صورت میں نہیں ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جو حضرت موسیٰ کے لئے حاصل تھی لیکن امت بنی اسرائیل کے ضروریات محدود تھے۔ موسیٰ نے ایک خاص محل تخلیہ کا (طور کی چوٹی) خاص اوقات مقرر کر لئے تھے۔ وہ وہاں جاتے۔ ابر آتا اور ان سے ہم کلام ہوتا۔ وہ آکر جن جن باتوں کے تبلیغ کی ضرورت ہوتی اپنی امت کو تعلیم دیتے۔ یہ صورت ہمارے رسولؐ کے لئے کافی نہیں تھی۔ ان کو جامع و مکمل قانون، باقتضائے وقت و محل احکام ملنا تھے۔ آپکے پاس طرح طرح کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا۔ خلوت جلوت سفر حضر منزل۔ راہ مختلف مقامات پر کلام الٰہی کے پہونچنے کی ضرورت تھی۔ کوئی جسمانی چیز دیوار، در، درخت، پتھر، ہوا ابر میں آواز پیدا ہونا جو ہر شخص کے گوش گذار ہونیکے قابل ہو حکمت الٰہی کے خلاف تھا۔ اسلئے ہمارے رسولؐ پر کلام الٰہی کے القا کے لئے تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔

الفاظ کی خلقت ملأ اعلیٰ میں جہان کی کائنات، موجودہ اشیاء کی نوعیت سے ہم کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے اسلئے کہ انکی مثال ہماری نظر کے سامنے نہیں آئی۔ ہندوستان کے باہر دوسرے ملک کے آدمی سے جس نے آم آنکھ سے نہ دیکھا ہو نہ اسکا مزہ چکھا ہو آم کا وصف بیان کیجئے، وہ سوائے حیران و ششدر رہنے کے یا ظاہری الفاظ کے ذہنشین کر لینے کے کبھی اُس حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا جو ہمیں ظاہر کرنا منظور ہے۔

بس یہی صورت عالم علوی کے موجودہ کائنات کی ہماری نسبت ہے کہ ہمیں الفاظ سے کتنا ہی سمجھایا جائے ہم کبھی اُس حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے جو وہاں کے اشیاء کیلئے مضمر ہے۔

قرآن کی خلقت کہاں ہوئی لوح محفوظ میں! لوح محفوظ کے کیا معنی؟ یہ مجھ سے سمجھنے کی بات نہیں ہے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ اس مادّی عالم کے اشیاء سے مختلف ہے۔ وہ لکڑی۔ تانبے۔ لوہے۔ پیتل سونے چاندی کی کوئی تختی نہیں ہے جس پر ظاہری نقوش سے عبارتیں درج کی گئی ہوں۔ دواتیں رکھی ہوں قلم ڈبوئے جا رہے ہوں۔ لکیریں بن رہی ہوں بلکہ وہ معنوی چیز ہے۔ روحانی چیز ہے۔

عالم ملکوت کے قابل آسمانی فرشتوں کے پڑھنے کے لائق تختی اُس میں عجیب جامعیت ہے۔ عجیب وسعت ہے، احکام قضا و قدر اُس میں ہیں۔ احکام وجوب و حرمت یعنی تکالیف شرعیہ اُس میں ہیں۔

قرآن کا بھی اول مرکز وہ ہے۔ پھر موقع و محل کے اقتضاء سے جیسی ضرورت پیش آئی جیسا موقع درپیش ہوا ملک مقرب یعنی جبرئیل امین کے زبان و دل پر ویسی آیت کا القا ہوا حکم پہونچا مامور ہوئے کہ وہ آیت یا آیتیں یا پورا سورہ آکے رسالتمآب صلعم تک پہونچا دیں، آئے،۔ روحانی ملک۔ روحانی بات چیت۔ دل کے ساتھ تعلق۔ نہ کسی نے آتے دیکھا،

نہ بات کرتے سنا مگر خدا کا کلام رسول تک پہونچ گیا۔

اسی کا نام "وحی ہے" اسی کا نام "نزول قرآن" نزقرآن کا اترنا ہے۔ اسی کی بنا پر یہ قرآن کلام الٰہی ہے اور مخلوق کے کلام سے جداگانہ ہے۔

وہ خدا کی طرف منسبت رکھتا ہوا خاص اُس کا مخلوق کلام ہے اسلئے کلام اللہ ہے (ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق) اور اس کا اپنے حکم کے ذریعے سے ملاء اعلیٰ سے اُتارا ہوا ہے اسلئے منزل من اللہ ہے (انّا نحن نزّلنا الذکر) اور جبرئیل امین کے ذریعے سے نازل شدہ ہے اسلئے ارشاد ہوتا ہے (نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک) اور رسولؐ کے گوش گذار ہونے میں وہ جبرئیل کی زبان کا ہے اسلئے مجازاً جبرئیل کا قول ہے (انّہ لقول رسول کریم ذی قوّۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثمّ امین)

ضمیمہ کلام

خلق قرآن کا معرکہ کارزار

حضرت باری تعالیٰ کے متکلم ہونے کے معنی میں جو اختلاف تھا اُس سے قدرۃً یہ نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا کہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے مفہوم میں بھی اختلاف ہو جائے جس کو ضروری توضیح کے ساتھ ہم نے پیش کیا۔

لیکن جانبین کے نقطہ نظر کی بنا پر کم از کم یہ بات متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہونا چاہئے تھی کہ یہ الفاظ و کلمات جو مجموعی حیثیت سے بحالت موجودہ "قرآن" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جن کا غذ پر

لکھے جاتے، سینہ میں محفوظ کیے جاتے، زبان سے صادر ہوتے ہیں یہ حادث ہیں، قدیم نہیں ہیں اسلئے کہ اگر یہی قدیم ہوتے تو اکثریت کو مسلمانوں کی خدا کے متکلم ثابت کرنے کی غرض سے کلام نفسی کے ایجاد کرنیکی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔

یہ الفاظ حادث ہیں اور خدا محل حوادث نہیں، اسی لیے تو کلام نفسی کے تخیل کی ضرورت ہوئی اور جب یہ الفاظ حادث ہیں تو ہر حادث کے لئے موجد اور خالق کی ضرورت ہے، لہذا مخلوق بھی ضرور ہوں گے۔

یہ کوئی پیچ دار مسئلہ نہیں تھا جس میں خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا کی جاتیں لیکن افسوس ہے کہ بحث ونظر کے سدباب اور قوائے عقلی کے انسداد نے جو قرآن اور تعلیمات نبوی کے بالکل برخلاف نہ معلوم کس ذہنیت کے ماتحت سالہا سال کے بعد ضروری سمجھا گیا تھا اکثر مسلمانوں کے فکر و نظر کی قوتوں کو اس درجہ معطل اور بیکار کر دیا تھا کہ وہ معنی اور مفہوم پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے الفاظ اور تعبیرات کے غلام بن گئے تھے۔

وہ قرآن کو مخلوق کہنا اسکی توہین سمجھتے تھے اور بہت بڑا جرم خیال کرتے تھے۔ یہ سادگی کا طلسم مسلمہ عقیدہ کی صورت میں خاموش اطمینان کے ساتھ رہتا اگر دوسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں مامون الرشید خلیفۃ المسلمین عباسی کا ذوق تحقیق اسکے خلاف مصروف جہاد نہوتا۔

یہ خلیفہ (بدقسمتی سے) اپنے پیشرو دوسرے اموی و عباسی خلفا کے برخلاف لہو و لعب اور صرف عیش و عشرت میں مصروف ہونے کے بجائے ایک حد تک علمی تحقیقات اور وسعت علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔

اس نے علم حدیث اور فقہ کی تحصیل بڑی تکمیل کے ساتھ کی اور فلسفہ و حکمت میں کافی وقت صرف کیا تھا (تاریخ الخلفا، سیوطی صفحہ ۳۱)

اُسکی آنکھوں میں ایسی باتیں کھٹکتی تھیں جن کی بنیاد صرف عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے پر قائم ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن کے زیر بحث مسئلہ پر اُس نے سنجیدگی سے غور کیا اور الفاظ قرآن کے قدیم غیر مخلوق ہونے کو ایک لایعنی، خلاف عقل بات قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے، اُس کا قدیم کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

طبری نے اس کا ابتدائی آغاز ۲۱۲ھ میں بتایا ہے اور لکھا ہے فیھا اظہر المامون القول بخلق القرآن " اس سال مامون نے قرآن کے مخلوق ہونے کے قول کا اظہار کیا۔"

سطحی نظر رکھنے والے ارباب ظاہر اور محدثین یقیناً اس سے متفق نہیں ہو سکتے تھے اُنھوں نے اختلاف کیا اور سخت اختلاف جس سے شورش پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا اور اس وجہ سے مامون کو چند سال تک کے لیے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کرنا پڑا۔ جہاں تک اصل بحث کا تعلق ہے اس مسئلہ کو صرف علمی و تحقیقی حیثیت میں محدود رہنا چاہیئے تھا۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کو کفر و اسلام کا معیار قرار دے لیا جائے لیکن کیا کیا جائے عام افراد انسانی کی تشدد آمیز ذہنیت کو، وہ محدثین جو کفر و اسلام کے دائروں کی حدبندی میں اعتدال سے کوسوں دور ہیں اُنھوں نے اس بحث کو اسلام اور کفر کا سوال بنا لیا۔

علامہ شبلی نعمانی جو ہمارے قریبی دور کے ایک کامیاب مصنف گذرے ہیں اُنھوں نے اپنی کتاب "علم الکلام" کے حصۂ اول میں اس تشدد آمیز ذہنیت پر کافی افسوس کیا ہے ہم اس اختلاف اور محدثین کے تشدد آمیز اقوال کے نمونے اُنہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

" مسائل اختلافیہ میں ایک یہ بھی تھا کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی جو خدا کے صفات قدیمہ میں ہے وہ قدیم ہے لیکن جو الفاظ آنحضرت صلعم پر

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

نازل ہوتے تھے وہ مخلوق اور حادث تھے، محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔ زیادہ تدقیق سے دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن دونوں فرقے نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حد فاصل قرار دیا۔

امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، ہم اسکی سند سے اس موقع پر چند بڑے بڑے محدثین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

وکیع بن الجراح	من زعم ان القرآن محدث فقد کفر	جس شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن حادث ہے وہ کافر ہے۔
یزید بن ہرون	من زعم ان کلام اللّٰہ مخلوق فھو والذی لا الٰہ الا ھو عندی زندیق	جو شخص کہتا ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے وہ خدا کی قسم زندیق ہے۔
مزنی شاگرد شافعی	من قال ان القرآن مخلوق فھو کافر۔	جو شخص کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے۔
امام بخاری	نظرت فی کلام الیھود والنصارٰی والمجوس فما رأیت قوما اضلّ فی کفرھم	میں نے یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں سب کے کلام دیکھے ہیں۔ جہمیہ کے برابر کوئی اُن میں سے کافر جاہل نہیں ہیں

لہ معتزلہ کے قول کی جو ترجمانی کی جا رہی ہے وہ پورے طور سے صحیح ہونا بہت مشکل ہے۔ خود اسکے قبل صفحہ ۱۵ میں آپنے تحریر فرمایا ہے کہ "خدا کے صفات کو اگر قدیم مانیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے اور حادث کہیں تو خدا کا محل حوادث ہونا خدا کے حدوث کا مستلزم ہے، پہلی مشکل سے بچنے کی معتزلہ نے یہ رائے اختیار کی کہ خدا کے علیحدہ صفات نہیں ہیں بلکہ اسکی ذات ہی سے وہ تمام نتائج حاصل ہوتے ہیں جو ہمکو صفات سے ہوتے ہیں" پھر جب معتزلہ کے نزدیک خدا کے لئے ذات سے علاوہ صفات ہیں ہی نہیں تو انکی طرف یہ نسبت کہ "کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں ہے وہ قدیم ہے" کہاں صحیح ہوسکتی ہے؟

	من الجهمية وانی لاستجهل من لا یکفّرهم۔	اسکو جاہل سمجھتا ہوں جو جہمیہ کو کافر نہ سمجھے۔ (جہمیہ کا اصلی جرم یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کو حادث کہتے تھے)۔
عبدالرحمن بن مہدی	لو رأیت رجلا علی الجسر وبیدی سیف یقول القرآن مخلوق ضربت عنقه۔	اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اسکی گردن ماردوں۔

بعض محدثوں نے جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں اس مسئلہ میں یہ تفریق کی تھی کہ قرآن مجید کا جو تلفظ کیا جاتا ہے یہ مخلوق ہے اور حادث ہے لیکن محدثین نے اسکی بھی سخت مخالفت کی۔ ذہلی امام بخاری کے استاد تھے اور صحیح بخاری میں بہت سی حدیثیں اُن کی روایت سے مذکور ہیں۔ انھوں نے امام بخاری کا جب یہ قول سنا تو عام حکم دیدیا کہ جو شخص یہ لفظ کہے کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" وہ ہماری مجلس میں نہ آنے پائے۔ چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن شداد نے ایک تحریر میں لکھا تھا کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" یہ تحریر امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے اس فقرہ کو کاٹ دیا اور کہا کہ قرآن جس صورت میں ہو غیر مخلوق ہے۔

ابوطالب نے کہا تھا کہ امام احمد بن حنبل قرآن کے تلفظ کو مخلوق کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل کو خبر ہوئی تو غصہ سے کانپنے لگے اور ابوطالب کو بلاکر اس بات کی بازپرس کی"۔
(علم الکلام حصۂ اول مطبوعہ انوار المطابع ص۱۷)

غالباً اسی متشددانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید کو اس مسئلہ میں کد ہوگئی۔
ایک تو بادشاہوں کا دماغی توازن ہر بات میں اعتدال کے حدود پر قائم نہیں رہتا،

وہ جس بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اُس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور انہماک اُن کا افراط
کے درجہ پر پہونچ جاتا ہے۔

دوسرے عموماً افراد انسانی کی ذہنیت کہ جس بات میں اُنکی زیادہ مخالفت ہو اُس میں
اُن کو زیادہ کاوش اور ردِّ عمل کی کوشش پیدا ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید نے عارضی طور سے چند سال کے لئے سکوت اختیار کر کے
ایک مرتبہ اپنے عقیدۂ خلق قرآن کی حمایت میں جہاد کی ٹھان لی اور اسحٰق بن ابراہیم خزاعی کو
جو بغداد میں گورنر کی حیثیت سے تھا ایک مبسوط خط کے ذریعے حکم دیا کہ وہ تمام علمائے وقت کو
جمع کر کے خلق قرآن کے مسئلہ میں اُنکے خیالات دریافت کرے اور جو لوگ اسکے منکر ہوں انہیں ایسا
سختی سے سخت سزا کا حکم دیا جائے۔

طبری نے ۲۱۸ھ کے واقعات میں اس تاریخی یادگار خط کو نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے[1]

اما بعد فان حق الله علی ائمة المسلمین
وخلفاءهم الاجتهاد فی اقامة دین الله
الذی استحفظهم ومواریث النبوة
التی اورثهم واثر العلم الذی استودعهم
والعمل بالحق فی رعیتهم والتشمیر لطاعة
الله فیهم والله یسأل امیر المؤمنین
ان یوفقه لعزیمة الرشد وصریمته
والاقساط فیما ولاه الله من رعیته برحمته
ومنته وقد عرف امیر المؤمنین

پیشوایان اسلام اور خلفائے مسلمین پر خدا کی
طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دین خدا کیلئے
جس کی حفاظت کے وہ ذمہ دار بنائے گئے
ہیں اور نبوت کے متروکات کیلئے جسکے وہ وارث
قرار دئے گئے ہیں اور علم کے آثار کے لئے جو اُنکے
پاس امانت رکھا گیا ہے اپنی تمام جد و جہد صرف
کر دیں اور اپنی رعایا کے درمیان حق کے ساتھ
عمل کریں اور طاعت الٰہی کیلئے کمربستہ رہیں
انیجانب خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے رحم و

[1] طبری ج ۱۰ ص ۲۸۴ - ۲۸۵

ان الجمهور الاعظم والسواد الاكبر
من حشو الرّعية وسفلة العامة
ممن لا نظر له ولا روية ولا
استدلال له بدلالة الله وهدايته
ولا استضاءة بنور العلم وبرهانه في
جميع الاقطار والآفاق اهل جهالة
بالله وعمى عنه وضلالة عن حقيقة
دينه وتوحيده والايمان به ونكوب
عن واضحات اعلامه وواجب
سبيله وتصور ان يقدروا الله
حق قدره ويعرفوه كنه معرفته
ويفرقوا بينه وبين خلقه لضعف
آرائهم ونقص عقولهم وجفائهم
عن التفكر والتذكر وذلك انّهم
ساووا بين الله تبارك وتعالىٰ
وبين ما انزل من القرآن فاطبقوا
مجتمعين واتفقوا غير متعاجمين
على انه قديم اوّل لم يخلقه الله
ويحدثه ويخترعه وقد قال

کرم سے مجھ کو صحیح راستہ پر قائم رہنے اور اسکو اپنے
دل میں ٹھان لینے اور اپنی رعیت کے درمیان
خدا کے عطا کردہ منصب یعنی فرماں روائی میں
عدالت کرنیکی توفیق عطا فرمائے ۔

اینجانب کو معلوم ہوا ہے کہ سواد اعظم اور جمہور افراد
عوام اور پست طبقہ کی رعیت میں سے جنکو قوت
نظر اور طاقت استدلال نہیں ہے اور نور علم سے
بہرہ مند نہیں ہوئے ہیں تمام اطراف و حدود
سلطنت میں بالکل خدا کے مرتبہ سے ناواقف اور
دین خدا کی حقیقت اور اسکی توحید اور ایمان سے
کور چشمی و گمراہی میں مبتلا اور اسکے روشن نشانوں
اور واجبی راستے سے منحرف اور اسبات سے قاصر ہیں
کہ وہ خدا کو اسکی شان کے مطابق اوصاف کے
ساتھ خیال کریں اور اسکی حقیقت معرفت کو
حاصل کریں اور اس میں اور اسکے مخلوق میں فرق
سمجھ سکیں اسلئے کہ انکے اذکار کمزور اور انکی
عقلیں ناقص اور وہ غور و فکر اور یادداشت
میں سستی و کمزوری کرنیوالے ہیں اسکی تفصیل
یہ ہے کہ انھوں نے مساوات قرار دیدی خدا اور

الله عزوجل فی محکم کتابه الذی
جعله لما فی الصدور شفاء
وللمومنین رحمة وهدی انا جعلناه
قراناً عربیاً فکل ما جعله الله فقد
خلقه وقال الحمد لله الذی خلق
السموات والارض وجعل الظلمات
والنور وقال عزوجل کذلك نقص
علیك من انباء ما قد سبق فاخبر
انه قصص لامور احدثه بعدها
وتلا به متقدمها وقال الر کتاب
احکمت ایاته ثم فصلت من
لدن حکیم خبیر وکل محکم مفصل فله
محکم مفصل والله محکم کتابه ومفصله
فهو خالقه ومبتدعه ثم هم
الذین جادلوا بالباطل فدعوا الی
قولهم ونسبوا انفسهم الی السنة
وفی کل فصل من کتاب الله قصص
من تلاوته مبطل قولهم ومکذب
دعواهم یرد علیهم قولهم ونحلتهم

اُسکے نازل کردہ قرآن میں اور وہ سب کے سب
متفق ہوگئے اسبات پر کہ یہ قدیم اور ازلی ہے اور خدا
کا مخلوق اور اُس کا حادث کردہ اور پیدا کیا ہوا
نہیں ہے حالانکہ خداوند عالم اپنی کتاب محکم میں
ارشاد فرماتا ہے "ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن"
ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے بنائی ہو وہ اُسکی پیدا کی
ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا "حمد ہے اُس خدا
کے لئے جس نے خلق کیا آسمانوں اور زمین کو اور
بنایا تاریکی و روشنی کو" اسکے علاوہ ارشاد ہوا
"اس طرح ہم تم سے واقعات بیان کرتے ہیں اُس
دور کے جو پہلے گذر گیا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ واقعات اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد
یہ کلام عالم وجود میں آیا ہے نیز ارشاد کیا "یہ کتاب
وہ ہے جسکی آیتیں محکم کی گئی ہیں اور پھر حکیم و خبیر
خدا کی طرف سے اُسکی تفصیل کی گئی" جو شے محکم شدہ
اور تفصیل کی ہوئی ہو اُسکے لئے کوئی محکم کرنے والا
اور تفصیل دینے والا ہوگا، وہی اُس کا خالق اور
موجد قرار پائیگا۔ اسکے بعد انہی لوگوں نے غلط
بات پر بحث شروع کردی اور اپنے قول کی تبلیغ بھی

ثم اظهروا مع ذلك انهم اهل
الحق والدين والجماعة وان من
سواهم اهل الباطل والكفر
والفرقة فاستطالوا بذلك
على الناس وغروا به الجهال حتى
مال قوم من اهل لسمت الكاذب
والتخشع لغير الله والتقشف لغير
الدين الى موافقتهم عليه ومواطأتهم
على سيئ آرائهم تزينا بذلك عندهم
وتصنعا للرياسة والعدالة فيهم
فتركوا الحق الى باطلهم واتخذوا
دين الله وليجة الى ضلالتهم ـــــ
فاجمع من بحضرتك من القضاة
واقرأ عليهم كتاب امير المؤمنين
هذا اليك فابدأ بامتحانهم فيما
يقولون وتكشيفهم عما يعتقدون في
خلق الله القرآن واحداثه واعلمهم
ان امير المؤمنين غير مستعين
في عمله ولا واثق فيما قلده الله واستحفظه

کرنے لگے اور اپنے تئیں سنت کی طرف منسوب
کرتے ہیں حالانکہ قرآن مجید کے ہر حصہ میں ایسے
بیانات ہیں جو اُن کے قول کو باطل کرنے والے
اور اُنکے دعوے کی تکذیب کرنے والے ہیں۔
اسکے باوجود یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اہل حق اہل
مذہب اہل جماعت ہیں اور انکے سوا جتنے ہیں
سب اہل باطل اور کافر و تفرقہ پرداز ہیں اسطرح
لوگوں میں انھوں نے اپنا اثر قائم کیا اور جاہلوں
کے جوش کو برانگیختہ کیا یہانتک کہ کچھ خود غرض
گندم نما جو فروش، ریاکاری و ظاہرداری کے ساتھ
اظہار زہد و تقوی کرنے والے افراد بھی اُن کے دلوں
میں رسوخ قائم کرنے اور اپنی خیر خواہی جتانے
کیلئے اُنکے ہمخیال ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے
باطل کی غرض سے حق سے کنارہ کشی کی اور خدا کو
چھوڑ کر اپنی گمراہی کے راستہ میں داخل
ہوئے ہیں ـــــ
تم کو چاہیئے (یہ گورنر کو حکم ہو رہا ہے) کہ جتنے
قاضی تمہارے یہاں ہوں سبکو جمع کرو اور انکے
سامنے خلیفۃ المسلمین (اینجانب) کے خط کو پڑھ کر

من امور رعيته ممن لا يوثق بدينه
وخلوص توحيده ويقينه فاذا اقرّوا
بذلك ووافقوا امير المومنين
فيه وكانوا على سبيل الهدى والنجاة
فمرهم بنص من يحضرهم من الشهود
على الناس ومسألتهم عن علمهم
فى القرآن وترك اثبات شهادة من
لم يقرّ انه مخلوق محدث ولم يره
والامتناع من توقيعها عنده واكتب
الى امير المومنين بما يأتيك
عن قضاة اهل عملك فى مسألتهم
والامر لهم بمثل ذلك ثم اشرف
عليهم وتفقد آثارهم حتى لا تنفذ
احكام الله الا بشهادة اهل البصائر
فى الدين والاخلاص للتوحيد اكتب
الى امير المؤمنين بما يكون فى ذلك
انشاء الله وكتب فى شهر ربيع الاول
سنة ٢١٨ –

سنا دو اور انکے اقوال کی آزمائش کرو اور خلق و
حدوث قرآن کے متعلق انکے خیالات کو دریافت
کرو اور ان کے اوپر یہ واضح کر دو کہ خلیفۃ المسلمین
اپنی حکومت میں کسی شخص سے امداد حاصل کرنا اور
کسی منصب کو کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا پسند نہیں
کرتا جس کے مذہب اور خالص توحید پر اس کو بھروسہ
نہ ہو جب وہ اس کا اقرار کر لیں اور خلیفہ کی رائے سے
متفق اور ہدایت و نجات کے راستہ کے سالک
رہوں تو انھیں حکم دو کہ وہ اس مسئلہ کو ان تمام شواہد و
دلائل کے ساتھ عام لوگوں کے سامنے پیش کریں اور
ان سے انکے علم کے متعلق دریافت کریں جو شخص
اسبات کا اقرار نہ کرے کہ قرآن مخلوق ہے اسکی
گواہی قبول نہ کیجائے، اسکے بعد انیجانب کے پاس
اطلاع بھیجنی چاہیئے کہ تمھاری طرف کے قاضیوں نے
کیا طرز عمل اختیار کیا پھر تم خود انکے طرز عمل کے
نگران رہو یہانتک کہ خداوندی احکام بغیر صاحبان
بصیرت اور اہل توحید خالص کی گواہی کے
قبول نہ ہوں اور برابر ان حالات کی تفصیلی اطلاع
خلیفۃ المسلمین کو دیتے رہو انشاء اللہ تعالی - ماہ ربیع الاول ٢١٨ھ

یہ مکتوب غیر معمولی درجہ تک طویل ہونے کے باوجود ہم نے قریب قریب پورا اسلئے نقل کر دیا کہ وہ بادشاہانہ تحکم کے ساتھ عالمانہ طرز استدلال اور قوت بیان کا بھی حامل ہے۔ اس میں خلق قرآن کے ناقابل استرداد دلائل ذکر کئے گئے ہیں جو کسی طرح غلط نہیں ہیں بیشک اس علمی انداز استدلال کے ساتھ ملوکانہ ذہنیت نے تشدد آمیز احکام جاری کرائے ہیں جو وقتی جذبہ جوش مخالفت کا نتیجہ ہیں اور اُن کا سبب جیسا کہ ہم نے لکھا زیادہ تر فقہا و اہل مذہب کا تشدد آمیز کافر ساز رویّہ تھا۔

کوئی جاہل بادشاہ ہوتا تو وہ اس فتوائے کفر کے حربہ ہی سے شاید سپر انداختہ ہو کر خاموش ہو جاتا مگر مامون الرشید فقط بادشاہ نہیں، وہ تھا جس کے متعلق حافظ سیوطی لکھتے ہیں کان یُعدّ من کبار العلماء وہ اس فتوائے کفر کے جواب میں خاموشی گوارا نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ قوت استدلال کے ساتھ اپنے حریفوں کو کافر ثابت کرنے کا درپے ہوا اور ملوکانہ اقتدار کے ساتھ اُن کو کافر کی پاداش دینے پر بھی طیار ہو گیا۔

یہ تاریخ کی بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ اسکے بعد سوائے امام احمد ابن حنبل اور محمد بن نوح عجلی کے جتنے فقہا و محدثین تھے سب نے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کیا اور اُسے تقیہ کے پردہ میں ظاہر کر کے اپنی جان بچائی جس تقیہ کو آج ہمارے برادران اسلامی شیعوں کے ناقابل معافی جرائم کی فہرست میں درج کرتے ہیں حافظ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں صاف لکھا ہے انھم توقفوا اوّلا ثم اجابوا تقیّۃ " ان لوگوں نے پہلے تو توقف کیا پھر تقیہ سے کام لے کر موافقت کا اظہار کیا "۔ ان تقیہ کرنے والوں میں یحییٰ بن معین ایسے حفاظ و ائمہ فن حدیث تھے یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ اجبنا خوفا من السیف " ہم نے تلوار کے ڈر سے موافقت کی " ان لوگوں کی ان باتوں کی خبر بھی مامون کو پہونچ گئی تھی اور اس نے حکم دیا کہ ان سب کو

یا نہ بنجیر کر کے روانہ کیا جائے لیکن اسکے بعد مامون کی مدت حیات ختم ہو گئی اور اس طرح یہ ہنگامہ بھی ختم ہوا۔

تیسرا تبصرہ

نزول قرآن کی تاریخ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر تدریجی حیثیت سے موقع ومحل کے اقتضائے سے نازل ہوتا تھا اور اسی عنبارے سے اس میں ماضی مستقبل حال کے واقعات کی تفریق ہوئی ہے یعنی پہلے ہو چکنے والے واقعات ماضی کے الفاظ سے اور بعد ہونے والے مستقبل کی حیثیت میں اور موجودہ حالت کا تذکرہ حال کی صورت میں کیا گیا ہے۔ وہ روز وقوع واقعہ آنیوالی آیت میں (الیوم) یعنی "آج" کی لفظ اور آیندہ کے تذکرہ میں سین اور سوف کے ساتھ قریب وبعید کے حدود قائم کرتا ہے۔ اس عنبارے سے قرآن مجید کے نزول کی کوئی تاریخ مقرر کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ بیس برس کے عرصہ میں جستہ جستہ اترا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں نزول قرآن کی تاریخ کا تذکرہ ملتا ہے ایک طرف یہ ارشاد کہ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن" رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا"

اس میں قرآن کے اتارے جانے کو گیارہ مہینوں کی میعاد سے ہٹا کر ایک مہینہ میں محدود کیا گیا ہے دوسری آیت میں ارشاد ہوا انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ ہم نے اسکو ایک مبارک شب میں نازل کیا، اس سے مبہم طور سے پتہ چلا کہ اس کا نزول کسی خاص رات میں ہوا ہے اور وہ ماہ

رمضان کی کوئی رات ہی اسلئے کہ پہلی آیت کے خلاف نہ ہو تیسری آیت اِنَّا انزلناہ فی لیلۃ القدر میں انضباط تاریخ مکمل طریقے سے کیا گیا "ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا"

اس طرح تاریخ معینہ طریقے سے معلوم ہو گئی یعنی شب قدر۔

اب وہ کہ جو قرآن کو قدیم اور بطور کلام نفسی کے ازل سے ذات الٰہی میں ثابت سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ الفاظ جو کاشف اور حاکی ہیں کلام حق کے وہ تو کسی ایک وقت پر نازل ہوئے نہیں بتدریج اترے پھر انکی تاریخ ہے نہیں۔ قدیم چیز قدیم ہے اسکی کوئی ابتدا نہیں۔ پھر اسکے لئے تاریخ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

لیکن میں کہ جو قرآن کو حضرت احدیت کا مخلوق جانتا اور اسی حیثیت سے اس کو کلام الٰہی سمجھتا ہوں ان آیات کی تاریخ کو اسی انشاء و خلق قرآن سے متعلق سمجھتا ہوں جو عالم ملأ اعلیٰ میں صورت پذیر ہوا جسکی نوعیت کے علم میں میں سپر اندازگی کا اعتراف اس تبصرہ میں کر چکا۔

یہ انشاء اول ہے کہ جو ماہ رمضان کی مبارک رات، شب قدر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی مطابقت سے تدریجی طور پر قرآن مجید رسول پر نازل ہوا ہے۔

چوتھا تبصرہ

اِعجاز قرآن

چوتھا تبصرہ

اعجاز قرآن کی بحث

معجزہ کے معنی | معجزہ وہ غیر معمولی چیز ہے جو کسی نبی کو دعوائے نبوت کے ثبوت میں خداوند عالم کی جانب سے عطا ہوتی ہے جسکے مقابل لانے سے اسکی مخاطب دنیا کی تمام طاقتیں عاجز ہوتی ہیں۔

بعض لوگ اسے "مادی" حیثیت میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ ماہتاب کا شق ہونا۔ آفتاب کا

پلٹنا سنگریزوں کا تسبیح کرنا ایسی ہی باتیں انکے نزدیک معجزہ ہیں اسلئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے عقول کے اعتبار سے اتنے ترقی یافتہ ہوں کہ وہ حقائق پر غور کر سکیں انکے لئے ان مادی مظاہرت کی کیا ضرورت؟ میرے نزدیک یہ خیال غلط ہی معجزہ اُن غیر معمولی آثار کا نام ہے جو ایک مدعی نبوت میں اُسکے دعوے کے مطابق خصوصی حیثیت سے پائے جاتے ہیں یہ آثار، ایک بلند مرتبہ فلاسفر کیلئے وہ رموز و اسرار عقلی ہونگے جو اُسکے کلام میں ودیعت ہیں اُسکے اعتبار سے وہی معجزہ ہونگے اور ایک سطحی نظر رکھنے والے انسان کے لئے جو حقائق کلام کو نہیں سمجھ سکتا مادی مظاہرات ہونگے۔

معجزہ کی ضرورت انسانی افراد اپنی افتاد طبع کی بنا پر اقتدار پسندی وجاہ طلبی کے پتلے ہوا و ہوس کے مجسمے اور ذاتی و نفسانی اغراض کے بندے ہیں۔ اُن کو ذرا سی کسی ایسی بات کا دعویٰ جس میں اپنی سیادت تسلیم ہوتی، اپنی بات بالا ہوتی اور دوسرے بہت سے سادہ لوح افراد کے دلوں پر اپنی حکومت کا سکہ قائم ہوتا ہو بہت آسان سہل اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ اُن کو اس میں کسی سچائی، حقیقت، واقعیت کا خیال پس و پیش کرنے پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ ایک ذراسی وقتی شان و شوکت اُن کو بڑے سے بڑے غلط دعوے پر آمادہ کر سکتی ہے جس کی آخری حد خدائی کے دعوائے باطل تک پہونچتی ہے اُسکے آگے کوئی زینہ ہی نہیں کہ نقطۂ ادعا وہاں تک پہونچے۔

نبوت و رسالت جو ایک خداوندی منصب اور روحانی عہدہ ہے اپنی واقعی حقیقت کے اعتبار سے ایک روحانی اقتدار، فرمان روائی، سیادت کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ ضرور رکھتی ہے اسلئے عام انسانی افراد کے اقتدار پسند طبائع اس جامہ کو زیب تن کرنے اور اس منصب کے غلط دعوے کرنے پر بڑی جرأت کے ساتھ آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ دنیاوی منصب ظاہری اسباب و ذرائع اور مادی ساز و سامان پر موقوف ہوتے ہیں، وہ ذرائع اور سامان جن کے لئے مہیا نہ ہوں اُسکے لئے اُن مناصب کے نام لینے سے کوئی حاصل ہی

نہیں ہے۔ ایک بے تاج وتخت، بے مال ودولت زاویہ نشین فقیر یہ ادعا کرے کہ میں بادشاہ ہوں، وزیر ہوں، رکن سلطنت ہوں تو کوئی کاہے کو ماننے لگا اور کیوں تسلیم کرنے لگا لیکن نبوت ورسالت وغیرہ یہ مناصب کسی ظاہری ذریعہ سبب پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ روحانی پیغام اور باطنی وحی والہام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو کسی شخص کو اُن کے ادعا میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی، ظاہری لوازم زندگی کے اعتبار سے انبیاء ومرسلین بھی عام افراد بشری کے ایسے انسان ہی ہوتے ہیں جن کو قدرت کی طرف سے رسالت کے عہدہ کیلئے منتخب کیا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں خدا سامنے آیگا نہیں، دنیا خدا تک پہنچے گی نہیں پھر یہ کہنا کیا مشکل ہے کہ مجھ کو خدا نے عہدہ رسالت پر مبعوث کیا اور مجھ کو تمام خلق کی رہنمائی کے لئے مقرر کیا ہے۔

اسکی نظیریں بھی برابر دنیا کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں یعنی ہر قوم کے نزدیک متفقہ طور سے بعض ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جنہوں نے غلط طریقہ پر نبوت کا دعویٰ کیا اور ایک باطل شریعت کی بنیاد قائم کی۔

ایک قانون کا مرتب کر لینا اور دنیا کی رفتار پر نظر کر کے کچھ اصول قرار دے لینا جن کو شریعت آلہیہ کے نام سے پیش کیا جائے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

یہ فیصلہ کہ اُسکے تمام احکام صحیح اصول پر مبنی ہیں یا نہیں؟ عام افراد کا کام نہیں اسلئے کہ انسانی فلاح وبہبود کے سلسلہ میں عقلائے زمانہ کے خیالات ایک نقطہ پر مجتمع نہیں چہ جائیکہ عام افراد۔

اس صورت حال کے بعد اگر اُس مدعی نبوت کے پاس جو حقیقتہً خدا کا فرستادہ، اُس کا پیغامبر، سفیر اور اسکی شریعت کا مبلغ ہے صرف دعویٰ ہی دعوی ہو کہ میں خدا کا رسول، اُس کا فرستادہ ہوں اور اسکے سوا کچھ نہو تو اُس میں اور اُن لوگوں میں جو غلط طور پر یہی دعوے کر رہے ہیں فرق ہی کیا رہا اور عام افراد کے اوپر کیونکر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ اُس سچے نبی کے قول کو تسلیم کریں، اُسکے دعوے کو سر

آنکھوں پر رکھیں اور اطاعت کریں ۔ اور دوسروں کے دعوے سے انکار کریں، اُنکی شریعت کو تسلیم نہ کریں۔

اسکے لئے عقل ضروری سمجھتی ہے کہ یقیناً وہ شخص جو خدائے حکیم وخبیر کا حقیقی نمایندہ ہے اسکے لئے خدا کی جانب سے خصوصی طور پر ایسی بات ہونا چاہیئے جس کو وہ بحیثیت دلیل دعوائے نبوت پیش کرے اور جس کے مقابلہ سے دنیا کی طاقتیں عاجز ہوں۔ ورنہ ان دیکھا خدا جو بغیر اپنے آثار قدرت کے خود نہ پہچانا جا سکا اُسکے سفیر کو ہم بغیر آثار کے کیسے پہچانیں ؟

خدا کی معرفت یقیناً آثار کی محتاج ہے آثار بھی وہ جو مشترک نہ ہوں بلکہ الوہیت کے ساتھ مخصوص ہوں یعنی وہ آثار جو خدا اور غیر خدا میں مشترکہ حیثیت رکھتے ہوں وہ خدا کے وجود کی دلیل نہیں بن سکتے خدا کے وجود کی دلیل وہی آثار بن سکتے ہیں جن پر خدا کے سوا کوئی قادر نہ ہو۔ اب پ کو پہچاننا ہے خدا کے بغیر اُسکی طرف کے سفیر کو۔ اگر کسی مادی ہستی کی طرف سے سفارت کا دعویٰ ہوتا تو اُسکے پاس جاکر یا اُسکو خط لکھکر تصدیق کرائی جاسکتی تھی کہ یہ میرا نمایندہ ہے لیکن یہاں تو ایسا نہیں جب خدا کو خود اُسے دیکھکر نہیں پہچانا تو سفیر کی سفارت کو خود بھیجنے والے سے پوچھ کر تو سمجھ نہیں سکتے ۔ رہ گیا دعویٰ تو بہت سے دعویدار جھوٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھر جب بھیجنے والے تک رسائی نہیں بھیجے جانے والے کا دعویٰ مفید نہیں تو اب بتلائیے کہ کیونکر سمجھیں؟ خدا جس طرح غیر مادی تھا اسی طرح یہ مادی انسان اُس رشتہ کے لحاظ سے جس کا غیر مادی خدا کے ساتھ ادعا کر رہا ہے مادی حدود سے بلند ہو گیا ہے۔ اسلئے جس طرح اُس غیر مادی ہستی کو پہچانا اسی طرح اُسکے ساتھ تعلق کو پہچانیں، وہ صرف آثار ہیں جنکے ذریعہ سے ہم شناخت کر سکیں گے۔ آثار بھی وہ جو مخصوص ہوں یعنی جو سوائے مبعوث من اللہ کے دوسرے شخص میں عقلاً نہ پائے جاسکیں۔ اسی کو کہتے ہیں "معجزہ"۔

۷ **معجزہ اور اثبات حقانیت** یہ امر ایک حد تک محل بحث رہا ہے کہ معجزہ سے کسی نبی کی سچائی پر کیونکر

روشنی پڑتی ہے بہت سے لوگ معجزہ کی حقیقت کو صرف ایک غیر معمولی، عجیب و غریب کرتب میں منحصر سمجھ کر یہ کہدیتے ہیں کہ ایسی باتیں تو اکثر جادوگر، شعبدہ باز بھی پیش کر دیتے ہیں یا بعض غیر معمولی طاقت کے انسان اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے عام افراد قاصر نظر آتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک معجزہ سمجھا جائیگا اور اگر نہیں تو اس میں اور معجزات انبیاء میں کیا فرق ہے ؟

یہ سوال حقیقۃً دلیل اعجاز کے متعلق ناسمجھی پر مبنی ہے ۔

اعجاز کی بنیاد ایک باریک خصوصیت پر ہے جس کی وجہ سے ایک قسم کا عجیب و غریب مظاہرہ ایک مدعی نبوت کے لئے دلیل اعجاز اور سبب ثبوت نبوت ہوتا ہے اور اسی قسم کا مظاہرہ ایک ساحر اور جادوگر سے یا کسی غیر معمولی انسان کا کوئی مخصوص کمال اُس کا معجزہ نہیں ہوتا اور دلیل نبوت قرار نہیں پاتا ۔

غور سے ملاحظہ ہو حضرت حق عز اسمہٗ حکیم علی الاطلاق نقص و عیب سے بری ، ظلم دروغ اور باطل کی حمایت سے بلند و برتر ہے ، اُسکے دامن قدرت تک کسی باطل پروری اور ناحق کوشی کی حمایت کا الزام عائد ہونا اُسکے شان کمال و حکمت کے خلاف ہے ۔

ہمارے ایسے عام افراد میں کوئی ہماری جانب سے ایک غلط بات کی اشاعت کرے ، ہمارا نام لیکر کسی غلط امر کا ادعا کرے ، اور ہماری طرف سے کوئی علامت شناخت ثبوت میں پیش بھی کرے جس سے عام اشخاص کا دھوکا کھا جانا اصول فطرت کے لحاظ سے حق بجانب ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم حقیقت کا اظہار، واقعیت کا اعلان کریں ، اور اپنی ذمہ داری کو اس سلسلہ میں پورا کر دیں ۔

ایک گندم نما جو فروش ، ریاکار دو ظاہر دار ، زہد و تقدس کا بیوپاری اور بناوٹی ورع و تقویٰ کا دوکاندار ، میری طرف سے اجازۂ اجتہاد یا پیشنمازی میرے جعلی دستخط اور مہر سے بنا کر اطراف و جوانب، شہر و دیہات میں جاتا ، خلق خدا کی گمراہی کا سامان مہیا کرتا ہے ۔ بیشک لوگوں کا یہ فرض ہے کہ جب وہ میری طرف نسبت دیکر اپنی اشتہاری پیشنمازی یا اجتہاد کی دعوت دے تو وہ اُس سے

دلیل، سند کا مطالبہ کریں لیکن جب اُس نے اس مطالبہ کے جواب میں دستخطی و مہری سند پیش کر دی تو عام افراد کا فرض ختم ہو چکا، اُنکی فطرت کا تقاضا اُنکے تسلیم کو ختم کرائے گا اور وہ یقیناً اُسکے غلط گمراہ کن دعوے کے فریب میں مبتلا ہونے میں حق بجانب ہیں لیکن اس موقع پر مجھے اطلاع ہو جائے اور معلوم ہو تو لازمی فریضہ یہ ہے کہ جب میرے جعلی دستخط اور مہر سے خلق کی گمراہی کا سامان ہو رہا ہے تو میرا اعلان کر دوں کہ یہ میری دستخط اور مہر نہیں ہے میری طرف اسکی نسبت غلط ہے اور میری اصلی دستخط اور مہر اسکے علاوہ ہے۔

اسکے برخلاف اگر کسی ایسے شخص کے اظہار و اقرار کے بعد میں نے سکوت کیا تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ میں اسکے دعوے کا امضاء کرتا، اُسکے اعلان کو برقرار رکھتا اور عملی حیثیت سے اسکی تائید کرتا ہوں۔

بالکل یہی صورت ہے جب خدا کی طرف سے ایک شخص نے کسی منصب عہدہ، مرتبہ کا دعویٰ کیا جو بالکل روحانی بنیادوں پر مبنی ہے۔ جسکے آثار و خصوصیات مادی دنیا سے الگ اور عام افراد کے ظاہری معیار امتیاز سے جداگانہ ہیں۔

اُس نے اظہار کیا کہ مجھے خدا نے نبوت و رسالت کے شرف سے مخصوص کیا، اور سفارت کے عہدۂ جلیلہ سے ممتاز کیا ہے اُس نے مجھ کو ہدایت خلق کیلئے بھیجا ہے اور عام خلق کا رہنما قرار دیا ہے۔ بیشک اسوقت عام افراد کا فرض ہے کہ وہ اُس سے دلیل کا مطالبہ کریں اور ثبوت نبوت کیلئے برہان حقیقت کے پیش کرنے کی خواہش کریں۔

یہ مطالبہ ہوا اور اُس نے ایک غیر معمولی، عام انسانوں کے طاقت و اقتدار سے بالاتر بشری قوت سے بالکل باہر ایسا امر پیش کیا جس سے انسانی کمال کا ہاتھ کوتاہ نظر آیا اور بشری طاقتیں عاجز ہوئیں۔ اُس نے کہا کہ یہ طاقت مجھے خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ میری سچائی کی شناخت اور پہچان ہے۔

اس موقع پر اگر خدا ہمارا ایسا ایک شخص ہوتا جس پر بے خبری، سہو و نسیان وغیرہ کا امکان ہوتا تو بہت ممکن ہے عرصہ تک اسکی خاموشی بےخبری کے سبب سے حق بجانب قرار پاتی لیکن عالم و حکیم خدا، حاضر و ناظر خدا، نظام کائنات کا مدبّر خدا اگر اس کے بعد خاموش رہا یعنی اسکے دعوے کو برقرار رہنے دیا، اسکی طاقت کے مقابل کوئی طاقت پیدا نہ کی، اسکے ادعائے ہمتائی کو توڑنے کی تدبیر نہ کی اور اسکی قوت کو عاجز نہ کیا نہ اسکے مقابلہ میں کسی دوسرے کو قوت عطا کی تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے نمایندگی کا امضا، سفارت کا اقرار اور عہدہ کی تائید کی اور اسکے دعوائے نبوت و رسالت کی عملی طور پر تصدیق کی ہے۔

اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ سچا نبی حقیقی رسول ہے۔

اگر ایسا نہیں تو خدا پر حمایت باطل، گمراہی خلق اور پامالی حق کا الزام آتا ہے جو کسی طرح خداوند عالم کی شان جلال و کمال کیلئے جائز نہیں ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ میں جو روح اعجاز دوڑتی ہے وہ اُس دعوائے نبوت و رسالت کی بنا پر ہے جو اس قدرت نمائی کا انتساب خدا کی طرف کردیتا ہے اور جس کے بعد خدا پر ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر دعوائے نبوت و رسالت نہیں ہے تو لاکھ کوئی عجائبات پیش کرے، حیرت انگیز کرتب دکھلائے، محیر العقول کام انجام دے ہر موقع پر خدا کا یہ فرض تھوڑی ہے کہ وہ ہر بات کے مقابلہ میں ایک بات اور ہر چیز کے جواب میں ایک چیز پیش کرتا رہے، آخر اس صورت میں سلسلہ کہیں پر ختم بھی تو ہوگا تو وہ آخری چیز لاجواب ہی ہوگی اور اسکی کوئی مثال موجود نہ ہوگی۔

ان عجیب مظاہروں، حیرت انگیز کرتبوں اور تعجب خیز کارگذاریوں سے خدا پر ذمہ داری ہی کونسی عائد ہوتی ہے تاکہ ان عجیب کارناموں کا برقرار رہنا کسی خاص حقیقت کی دلیل قرار پائے۔

مذکورہ بالا بیان کی بنا پر معجزہ کی بنیاد حسب ذیل ارکان پر ہے جنکے بغیر کوئی چیز معجزہ نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۱) منصب روحانی یعنی نبوت و رسالت وغیرہ کا ادعاء۔

(۲) غیر معمولی امر ہونا جو اُس حلقہ میں کہ جو دعوائے نبوت و رسالت کا مخاطب ہے تمام افراد کی طاقت و اقتدار سے باہر ہو اسلئے اگر ایسا امر ہو جس پر دوسرے اشخاص بھی قدرت رکھتے ہیں تو وہ دلیل خصوصی کسی مرتبہ و عہدہ کی ہونیکے لائق نہیں ہے۔

(۳) اُس دعوے کے بعد کسی ایسے شخص کا پیدا نہونا جو اُس دعوے کو توڑ سکے اور اُسے باطل کر سکے۔

(۴) حالات اور خصوصیات کی بنا پر کسی ایسے امر کا موجود نہونا جو اُس مدعی نبوت کے دعوے کا قطعی ابطال کرنے کیلئے کافی ہو اسلئے کہ اگر ایسا ہو یعنی کوئی ایسا امر پایا گیا جو اُسکے دعوے کو باطل ثابت کرنے کیلئے کافی ہے جیسے مستند تسلیم شدہ نبی سابق کا اعلان کہ میرے بعد آنیوالا مدعی نبوت غلط گو ہے یا یہ اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے یا خود اس شخص کا جو مدعی نبوت ہے فاسق و فاجر اور اپنی سابقہ زندگی کے اعتبار سے بالکل ناکارہ ہونا جس کے ساتھ اُس کا بعہدہ نبوت و رسالت منتخب ہونا قطعی دلائل عقلیہ اور خدا کے مواعید یقینیہ کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا مدعی ہونیکے ساتھ کسی غیر معمولی امر کا اظہار بھی اُسکی نبوت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہو سکتا اسلئے کہ ثبوت نبوت تو خداوند عالم کے اوپر ذمہ داری عائد ہونے کی بنیاد پر تھا اور یہاں خدا کی ذمہ داری نبی سابق کے اعلان یا اُن قطعی بیانات سے جو ایسے شخص کی نبوت کے منافی ہیں پوری ہو چکی ہے۔ جو خدا کی حجت تمام ہونے اور خلق کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے جسکے بعد خداوند عالم کو اس مدعی نبوت کے مقابل میں خصوصی حیثیت سے کسی طریقہ کے ابطال کی ضرورت نہیں ہے۔

معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ

پہلا اور تیسرا رکن وہ ہے جو معجزہ کو سحر اور جادو سے الگ کر دیتا ہے یقیناً جادو بھی ایک حیرت انگیز صورت کا مظاہرہ ہوتا ہے لیکن یا تو اسکے ساتھ دعوائے نبوت و رسالت وغیرہ ہوتا نہیں اسلئے خداوند عالم پہ کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی یا اگر دعوائے نبوت و رسالت کے ساتھ یا کسی سچے نبی کے دعوائے نبوت اور معجزہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے تو خدا اسکے ابطال کا سامان کر دیتا ہے جیسا کہ ساحران فرعون کے قصہ میں واقع اور صورت پذیر ہوا۔

بہت سے وہ اشخاص جنہوں نے حقیقت معجزہ اور دلیل اعجاز پر غور نہیں کیا ہے اعجاز نبوت کے مقابلہ میں بہت سے اشخاص کے ذاتی کمالات کو پیش کر دیتے ہیں۔

مثلاً یہ کہتے ہیں کہ قرآن بحیثیت فصاحت و بلاغت اگر اسلئے معجزہ ہے کہ اس کا مثل کوئی نہیں لا سکا تو بہت سے علمی و ادبی آثار مختلف ادبا کے مختلف زبانوں میں ایسے ہیں جن کا مثل نظیر اب تک باوجود کوشش و کاوش کے ممکن نہیں ہو سکا ہے جیسے فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی، گلستان سعدی، اردو میں مثنوی میر حسن۔ مراثی میر انیس۔ انگریزی میں شیکسپیر وغیرہ کے آثار قلمی اور ادبی کارنامے،

اسکے جواب میں ہمارے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بیشک اگر فردوسی، سعدی، میر حسن، میر انیس، شیکسپیر وغیرہ نے نبوت، رسالت، مظہریت وغیرہ وغیرہ کا ادعا کیا ہوتا اور پھر بھی انکے شاہنامہ، گلستان، مثنوی، مراثی وغیرہ کا جواب نہ ہو سکتا اور نہ ممکن ہوتا تو ہم یقیناً[1] ان کو معجزہ اور ان کو

---

[1] یہ اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے ہے کہ مذکورہ بالا مظاہرات کا موقع ظہور اس وقت ہے جب ختم نبوت کے اعلان نے کسی نبی و رسول کی بعثت کا دروازہ بند کر دیا اسلئے چوتھے رکن کی بنا پر بھی دلیل اعجاز مکمل نہیں ہے اور ان مظاہرات سے حقیقت اعجاز کے اوپر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے ۱۲

بنی تسلیم کر لیتے اور اُسے دلیل اعجاز سمجھتے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اُنکے قلمی آثار اُس روح اعجاز سے عاری ہیں جو کسی حیرت انگیز امر کے معجزۂ ربانی و دلیل حقانی ہونے کی ضامن ہے اسلئے انھیں معجزہ سمجھنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں مختلف طرح کے کام ہوتے ہیں کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی۔ خدا کو کیا لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ان کاموں میں ناکامی ہی پیدا کرتا رہے۔ سحر بھی عالم اسباب کے ماتحت ہے۔ دنیا میں بہت سے اسباب کارفرما ہیں۔ وہ سب اسباب خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ان اسباب میں کچھ وہ ہیں جو ہم کو معلوم ہیں اور کچھ وہ جو ہم کو نہیں معلوم ہیں۔

جو ہم کو معلوم ہیں وہ ہمارے لیے معمولی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ اسباب جو عام طور سے نہیں معلوم ہیں وہ غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہے کہ کوئی اثر بغیر مؤثّر رونما ہو جائے۔

سحر جو ہے وہ بھی عالم طبیعیات کے حدود کے اندر ہے۔ وہ بھی عالم کون و فساد اور نظام اسباب کے سلسلہ کے ماتحت ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ غیر معمولی چیز یا خارق عادت تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اُس عام دستور کے خلاف ہے جو ہماری آنکھوں نے قانون قدرت کے ماتحت عام طور سے دیکھا ہے۔

اکثر عام اسباب کے سلسلہ میں نتائج ایسے غیر معمولی ہو جاتے ہیں جن کو دنیا بے مثال کہنے پر مجبور ہوتی ہے۔

ایک طبیب بعض اوقات ایسے مریضوں کو اچھا کر دیتا ہے جن کا اچھا ہونا اسکے قبل دنیا نے نہیں دیکھا تھا۔

ایک نثار پرداز، بسا اوقات ایسی تحریر لکھ دیتا ہے جس کی نظیر اسکے پہلے آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک شاعر، بسا اوقات ایسا شعر کہہ جاتا ہے جیسا شعر اسکے قبل نہیں ہوا تھا،

ایک کاتب بسا اوقات اُسکے ہاتھ سے ایسے نقوش نکلجاتے ہیں جن کے مثل پہلے آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ اُس طبیب، انشا پرداز، شاعر یا کاتب کو اپنے اس نتیجۂ عمل پر کچھ بھروسا بھی ہو اور وہ دنیا کو دعوت بھی دیسکے کہ اگر کوئی میرا مد مقابل ہو تو اسکے مثل بنا کر پیش کرے۔

سعدی اپنے گلستاں پر، یاقوت مستعصمی اپنے کتبوں پر، میر انیس اپنے مرثیوں پر، بجا طور پر فخر کرسکتے تھے اور بے نظیر ہونے کا دعویٰ بھی کسی نہ کسی حد تک درست تھا۔ خدا کو کیا ضرورت کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے دعوے کو غلط ثابت کرے۔ اسلئے کہ بہرحال نتیجۂ کمال ہر اُسکے ایک مخلوق کا اُسکی پیدا کردہ طاقتوں کا ثمرہ ہے۔ وہ اگر کسی کو پیدا کرے جو اُسکے دعوائے کمال کو باطل کردے تو پھر ضرورت ہو کہ اسکی بے مثالی باطل کرنے کے لئے ایک دوسرا پیدا کیا جائے اور پھر اُسکے لیئے تیسرا کہیں سلسلہ کبھی تو ختم ہو ہی جائیگا کیونکہ دنیا کا نظام متناہی ہے لہذا آخر میں جو ہو گا اُس کا دعویٰ لاجواب ہی رہے گا۔

پھر خدا کو کیا ضرورت کہ وہ اس جھگڑے میں پڑے اور ہر ایک کے دعوے کو باطل کرے لہذا ہر زمانہ میں ایسی قابلیت کے اشخاص پیدا ہوسکتے ہیں جیسی قابلیت اُنکے غیر میں مفقود ہیں۔

ایک شاعر ایسا شعر کہہ سکتا ہے جس کے مثل کوئی اور نہیں کہہ سکتا۔ کاتب ایسا کتبہ لکھ سکتا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اور اسی طرح ہر شعبہ میں بے مثال مثالیں ہوسکتی ہیں۔

یہ سب ٹھیک ہے اسلئے کہ ان کے ساتھ کوئی دعویٰ شریک نہیں ہوتا جو خدا پر ذمہ داری عائد کرے لہذا خدا پر فرض نہیں ہے لیکن یاد رکھئے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک اپنے نتیجۂ کارگزاری کو یہ کہکر پیش کرے کہ خدا نے مجھے کسی عہدہ پر مقرر کر کے بھیجا ہے اور یہ اس کا ثبوت ہے اور یہ جھوٹا ہو تو خدا پر لازم ہے کہ وہ کسی کو اتنی قوت عطا کردے جو اسکے خلاف مظاہرہ کر کے اُسکے دعوے کو

باطل کردے۔

قرآن معجزہ ہے اسلئے کہ وہ ثبوت نبوت میں پیش ہوا، دلیل رسالت میں لایا گیا اور دنیا کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ نبوت میں شک رکھتی ہے تو اسکی مثال پیش کرے اور پھر بھی دنیا قاصر رہی اس سے معلوم ہوا کہ وہ حقیقۃً انسانی طاقت سے خارج اور خدا کی خاص قوت وقدرت کا کرشمہ اور مخصوص امتیاز اور روحانی اختصاص ہے جو ثبوت نبوت کیلئے قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔

قرآن میں معجزات انبیاء کا تذکرہ بہت سے افراد جنھوں نے اپنے دل خواستہ اور ساختہ و پرداختہ انبیاء کا حلقہ اطاعت زیب گردن کیا ہے اور زمانے کے موجودہ دور سے قریب ہونے کی وجہ سے انکے لئے وہ کچھ معجزات اور خوارق عادات کے ظہور کے ادعاء کی جرأت نہیں رکھتے وہ اس اپنی کمزوری اور سرمایہ اعجاز سے بے مایگی و تہی دستی کو معجزات انبیاء کے انکار سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء عجیب و غریب مظاہرات ظاہر کرکے اپنی نبوت تسلیم نہیں کراتے تھے بلکہ صرف انکی روحانیت تھی جو انکے لئے قلوب کو جذب کرتی اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بناتی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں قرآن کے اندر معجزات انبیاء کے تذکرہ کیے جانے کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں کہیں معجزہ کو دلیل نبوت نہیں بتایا گیا ہے اور نہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے قرآن نے معجزات کا ادعاء کیا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید نے اپنے انوکھے طرز حکایت کے ساتھ اکثر انبیاء کے معجزات کا تذکرہ صاف اور صریحی الفاظ میں درج کیا ہے۔ بے شک اس کو "معجزہ" کے نام سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ "آیت" اور "بینہ" کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔

الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر معانی سے کنارہ کشی کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہم کو لفظ معجزہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے کہ ہم آپ اس لفظ کو قرآن میں تلاش کریں اور اسکی تعریف ڈھونڈھیں قرآن کوئی فرہنگ

اور لغت مصطلحات نہیں ہے کہ اُس میں لفظ معجزہ اور اسکی تعریف مذکور ہو۔ بیشک ہم کو اس قسم کی دلیل نبوت جس کو متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں اور جس کے وجود کو ثبوت نبوت میں ضروری سمجھتے ہیں اُس کا پتہ قرآن میں لگانا چاہیئے۔ اگر اُس کا پتہ لگجائے تو الفاظ میں اختیار ہے اور نام رکھنا آپکے ہاتھ میں ہے آپ اُسکو معجزہ کہیں جیسا کہ اس لفظ کے معنی لغوی (عاجز کر دینے والی چیز) کی مناسبت سے متکلمین کی اصطلاح ہے یا جس لفظ سے قرآن مجید نے اُن دلائل کی تعبیر کی ہو اس لفظ سے تعبیر کیجیئے یا کوئی نام اپنے دل سے تجویز کر لیجیئے مجھ کو یا کسی شخص کو اسپر کوئی اعتراض نہو گا۔

اب میں دکھلاؤں کہ قرآن مجید میں اس قسم کی دلیل نبوت کا پتہ ہے یا نہیں اور اسی ذیل میں آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے کس طرح صداقت نبی کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہے

قرآن مجید نے اُن حیرت انگیز مظاہرات قدرت اور دلائل نبوت کو جنھیں انبیا پیش کیا کرتے تھے آیات اور بینات کے نام پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

والی ثمود اخاھم صالحا قال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ قد جاءتکم بینۃ من ربکم ھٰذہ ناقۃ اللہ لکم اٰیۃ فذروھا تأکل فی ارض اللہ ولا تمسوھا بسوء فیأخذکم عذاب الیم ۔	قبیلۂ ثمود کی طرف (ہم نے بھیجا) اُنکے بھائی صالح کو اُنھوں نے کہا اے میری قوم والو عبادت کرو خدا ئے برحق کی اُسکے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے "بینۃ" آگیا ہے۔ یہ خدا کا خاص (پیدا کردہ) ناقہ جو تمہارے لئے "آیت" (نشانی) ہے اسکو چھوڑے رکھنا کہ یہ خدا کی زمین میں اپنی غذا حاصل کرے اور تم اسے کوئی برائی نہ پہونچانا جس سے تم عذاب دردناک میں مبتلا ہو۔

اس میں ناقۂ صالح کو "بینۃ" اور اُسی کو "آیت" کہا گیا ہے۔

ثم بعثنا من بعدهم موسیٰ بآیاتنا الی فرعون وملائه فظلموا بها فانظر کیف کان عاقبة المفسدین وقال موسیٰ یا فرعون انی رسول من رب العالمین حقیق علیٰ ان لّا اقول علی اللہ الا الحق قد جئتکم ببیّنة من ربّکم فارسل معی بنی اسرائیل قال ان کنت جئت بآیة فأت بها ان کنت من الصّادقین فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین ۔

پھر ہم نے اُن انبیاء کے بعد مبعوث کیا موسیٰ کو اپنی "آیتوں" کے ساتھ فرعون اور اُسکے گروہ کی طرف مگر اُن لوگوں نے اُن آیتوں کیساتھ نا انصافی کی۔ اب ذرا دیکھو کہ فساد کرنیوالوں کا کیا انجام ہوا اور موسیٰ نے کہا تھا کہ اے فرعون یقیناً میں خداوند عالم کی طرف سے فرستادہ ہوں اور میرے اوپر لازم ہے کہ میں سوائے سچی بات کے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت نہ دوں میں تمھاری طرف "بینہ" لیکر تمھارے رب کی طرف سے آیا ہوں، تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کردے فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی "آیت" لائے ہو تو اُسے پیش کرو، اگر سچے ہو، یہ سنکر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکدیا جو ایک مرتبہ صاف اژدھے کی شکل میں نمودار ہوگیا اور اُنھوں نے اپنا ہاتھ نکالا جو تمام دیکھنے والوں کی نظر میں چمکدار اور روشن نظر آیا۔"

یہاں عصائے حضرت موسیٰ اور ید بیضا کو "بینہ" اور "آیت" قرار دیا گیا ہے۔ اسکے بعد ساحران فرعون کی آواز نقل کی گئی ہے کہ اُنھوں نے معجزات کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے فرعون سے کہا۔

وما تنقم منّا الّا ان اٰمنّا بآیات ربّنا لمّا جاءتنا ربّنا افرغ علینا صبرا وتوفّنا مسلمین ۔

تو ہم سے کس بات پر ناراض ہوتا ہے سوائے اسکے کہ ہم اپنے پروردگار کی "آیتوں" کے ساتھ ایمان لائے جبکہ وہ ہمارے سامنے آئیں۔ پروردگار ہمارے اوپر

صبر کی افزائش کر دے اور ہمیں ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھا۔

(اسکے بعد)

وقالوا مهما تأتنا به من اية لتسحرنا بها فما نحن لك بمؤمنين فارسلنا عليهم الطوفان والجراد والقمّل والضّفادع والدّم ايات مفصّلات فاستكبروا وكانوا قوما مجرمين ۔

اُن لوگوں نے کہا کہ جو کبھی چاہو تم "آیت" ہمارے سامنے پیش کرو کہ ہم پر اسکے ذریعے سے جادو کرو ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اسوقت ہم نے اُن پر بھیجا طوفان اور ٹڈیوں کا لشکر اور جوئیں اور مینڈک اور خون، کھلی ہوئی "آیتیں" مگر انھوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور وہ گنہگار لوگ تھے ۔

اس میں پہلے جزو سے صاف ظاہر ہے کہ "آیت" اس نوعیت کی چیز کو کہا گیا ہے جس میں کفار سحر وجادو کی صورت پاتے تھے اور آخر آیت میں طوفان جراد قمل ضفادع دم ان مصائب کو جو غیر معمولی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئے تھے "آیات مفصّلات" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

ثمّ بعثنا من بعده رسلا الى قومهم فجاءوهم بالبيّنات فما كانوا ليؤمنوا بما كذّبوا به من قبل ۔

پھر ہم نے بھیجے اُنکے بعد کچھ رسول اُنکی قوم کی طرف اور وہ رسول اُنکے سامنے لائے "بیّنات" کو مگر وہ کب ایمان لانیوالے تھے اُس چیز پر جسکی پہلے تکذیب کر چکے تھے ۔

اس میں نوح کے بعد مبعوث ہونے والے رسولوں کے ساتھ ظاہر ہونے والے امور کو اجمالی طور پر "بینات" سے تعبیر کرتے ہوئے پھر ارشاد ہوا ہے ۔

ثمّ بعثنا من بعدهم موسىٰ وهٰرون

پھر ہم نے بھیجا اُنکے بعد موسیٰ اور ہارون کو

الیٰ فرعون وملائہ بآیاتنا فاستکبروا وکانوا قوما مجرمین فلمّا جآء الحق من رہم قالوا انّ ھٰذا السحر مبین۔

فرعون اور اُسکے گروہ کی طرف اپنی "آیتوں" کے ساتھ، انھوں نے ہٹ دھرمی کی اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے، جب اُنکے پاس اُنکے پروردگار کی طرف سے سچی حقیقت پیش ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

قال موسیٰ اتقولون للحق لمّا جآء کم اسحر ھٰذا ولا یفلح السّاحرون۔

موسیٰ نے کہا تم سچی بات کو جو تمھارے پاس آئی ایسا کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہو سکتا ہے حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔

قال فرعون ائتونی بکل ساحر علیم فلمّا جآء السحرۃ قال لھم موسیٰ القوا ما انتم ملقون فلمّا القوا قال موسیٰ ما جئتم بہ السّحر ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین ویحق الحقّ بکلماتہ ولو کرہ المجرمون۔

فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر کامل جادوگر کو بلا کر لاؤ جب سب جادوگر جمع ہوئے تو موسیٰ نے کہا کہ دکھاؤ جو کرتب تم دکھا سکتے ہو۔ جب اُنھوں نے پھینکا اپنی رسیوں کو تو موسیٰ نے کہا کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ سحر ہے خدا یقیناً اس کو ابھی باطل کر دیگا خدا مفسدہ پردازوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا اور جو حق بات ہے اُس کو وہ اپنے حکم سے پورا کرتا ہے اگرچہ گنہگار لوگ اُس کو برا سمجھیں۔

ان آیات میں پورے طور سے اُس دلیل عقلی کا خلاصہ موجود ہے جو معجزہ و سحر کے تفرقہ میں عرض کی جا چکی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظاہری صورت سے جو امر بطور دلیل نبوت نبی کو عطا ہوا تھا وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جو سحر کی ہوتی ہے یعنی غیر معمولی اور خارق عادت اور خلاف نظام عام

اسی بنا پر اُن لوگوں نے کہا کہ ان ھذا السحر مبین اور یہی خیال کرکے فرعون نے مقابلہ کیلئے ساحروں کو دعوت دی لیکن پیغمبر نے اس مختصر جملہ سے کہ اسحر ھذا و لا یفلح السّٰحرون فلسفۂ اعجاز اور آیت الٰہی و کرشمۂ ساحری کے تفرقہ پر مکمل روشنی ڈالدی۔ اس میں اعجاز اور سحر کے تفرقہ کا معیار جو بتلایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اگر یہ سحر ہوگا تو اُسکو کامیابی و سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی اسلئے کہ خدا پر لازم ہے کہ وہ اسکا ابطال کردے اور اگر وہ سرسبز و کامیاب ہوا اور اُسکا ابطال نہوا تو سمجھو کہ حقیقۃً سحر نہیں بلکہ اعجاز ہے اور اس معیار کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ نے ساحروں کی کارستانی دیکھی تو فرمایا " یہ جو تم نے کیا سحر ہے یقیناً خدا اسکو باطل کردیگا۔ خدا کبھی فساد برپا کرنے والوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا" معلوم ہوا معیار سحر یہ ہے کہ خدا اُس کو باطل کردے ویحق اللہ الحق بکلماتہ ولو کرہ المجرمون یعنی جو واقعی حق و صداقت اور صحیح خدا کی طرف کی نشانی ہے اُس کو وہ اپنے مظاہرات قدرت کے ساتھ برقرار رکھتا ہے چاہے گنہگار لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گذرے۔ یہ معیار اعجاز ہے اب اس سے بڑھکر دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہوگا ؟

ان آیات سے یہ امر بھی ظاہر ہے کہ اس مظاہرۂ قدرت کو جسے " آیت " اور " بینہ " کہا گیا ہے دلیل نبوت اور معیار صداقت کی صورت میں پیش کیا ہے بلکہ درحقیقت " بینہ " کہنا ان مظاہرات کو اسی اعتبار سے ہے کہ وہ کھلی ہوئی دلیل صداقت کی ہیں اور " آیت " کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ حقانیت کی نشانی ہیں ۔

اسکے علاوہ ملاحظہ ہو ۔

اسلک یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء واضمم	داخل کرو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن بغیر کسی ناگوار صورت کے اور ملادو اپنی طرف

الیك جناحك من الرھب فذانك برھانان من ربك الی فرعون وملائه ۔

اپنے بازو کو دہشت سے، یہ دلیل ہوگی تمہارے پروردگار کی جانب سے فرعون اور اس کے گروہ کی جانب ۔

اس آیت میں صاف صاف حضرت موسیٰ کے معجزات کو "برہان" یعنی دلیل نبوت بتلایا گیا ہے

حضرت خاتم الانبیاء کے معجزات قرآن مجید سے ظاہر ہے کہ اسی قسم کا استدلال جناب رسالتمآب کی نبوت کے ساتھ بھی پیش کیا گیا اور حضرت بھی ایسے "بیّنات" اور "آیات" کے ساتھ مبعوث کئے گئے تھے جن کو حضرت کے دشمن سحر کہنے پر مجبور ہوتے تھے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

فقد جاءکم بیّنة من ربکم وھدی ورحمة فمن اظلم ممن کذب بآیات اللہ وصدف عنھا ۔

یقیناً آیا تمہارے پاس "بیّنہ" تمہارے پروردگار کی جانب سے اور ہدایت ورحمت تو پھر کون شخص زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرے اور اُن سے روگردانی کرے

(دوسری آیت) فلما جاءتھم آیاتنا مبصرة قالوا ھذا سحر مبین وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا فانظر کیف کان عاقبة المفسدین ۔

جب آئیں اُن کے پاس ہماری "آیتیں" چمکتی ہوئی تو انھوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے اور انھوں نے جان بوجھ کر حالانکہ دلوں کو اُنکے یقین ہے صرف ظلم اور گھمنڈ کی بنا پر اُن کا انکار کیا، ذرا دیکھا تو کہ مفسدہ پردازوں کا انجام کیا ہوتا ہے ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے سامنے ایسی "آیتیں" پیش ہوتی تھیں جنکی نوعیت کو دیکھتے ہوئے وہ "سحر مبین" کہہ رہے تھے حالانکہ اُن کے دلوں کو یقین تھا کہ وہ سحر نہیں بلکہ ربانی آیات ہیں ۔

اور ملاحظہ ہو :—

واذا تتلیٰ علیھم ایاتنا بیّنات قال الّذین کفروا للحق لما جاءھم ھذا سحرٌ مّبین۔

جب اُنکے سامنے لائی جاتی ہیں ہماری "آئتیں" جو "بینات" ہیں تو جو لوگ انکار کرنے والے ہیں وہ حق کو دیکھکر کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

اس میں "آیات" اور "بینات" دونوں لفظوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور اُن "بینات" و آیات" کے ظاہر ہونیکے بعد کفار کی طرف سے سحر کہنے کا تذکرہ ہے۔

واذ قال عیسی بن مریم یابنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقاً لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد فلما جاءھم بالبیّنات قالوا ھذا سحرٌ مبین۔

جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے کہ اے بنی اسرائیل میں خدا کا رسول ہوں تمہاری جانب تصدیق کرنیوالا اُسکی جو میرے قبل تھی توریت اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا اُس نام احمد ہوگا تو جب وہ آیا اُن کی طرف "بینات" کے ساتھ تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

وما تفرق الّذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاءتھم البیّنۃ۔

نہیں اختلاف کیا اُن لوگوں نے کہ جنھیں کتاب عطا ہوئی ہے مگر بعد اسکے کہ "بیّنہ" انکی طرف آگیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح "آیات" اور "بینات" کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے جس طرح سابق انبیاء اور قرآن مجید میں بار بار اس تذکرہ سے کہ وہ لوگ سحر کہتے تھے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو غیر معمولی اور تمام انسانی طاقتوں سے بالاتر مظاہرات نظر آتے تھے جن کا جواب اُن کے پاس سوائے الزام جادوگری کے اور کچھ نہ تھا۔

اس کے ساتھ افسوس ہوتا ہے یہ دیکھکر کہ بہت سے اشخاص جو اپنے اغراض و مقاصد کیلئے ہر جائز

وناجائز استدلال کرنا مسلک تحقیق کے لئے عار و ننگ نہیں سمجھتے وہ قرآن سے اس امر کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معجزہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انھیں خداوند عالم کی طرف سے معجزات عطا کئے گئے۔

پادری فنڈر صاحب عیسائی نے اس پر بڑا زور دیا ہے اور اپنی کتاب میزان الحق میں اس پہ کافی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ اُنکے تمام استدلال کی سب سے بڑی کائنات صرف ایک آیت ہے کہ مامنعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بھا الاولون "نہیں روکا ہم کو اس بات سے کہ ہم "آیات" روانہ کریں مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ اُنکی تکذیب کر چکے تھے"

لیکن جبکہ مذکورہ بالا متعدد آیتوں سے رسالتمآبؐ کا "آیات" اور "بینات" کے ساتھ مبعوث ہونا ثابت ہے تو اس آیت میں بقرینہ ذیل کہ "کذب بھا الاولون" "اُنکی تکذیب کی پہلے لوگوں نے" آیات سے مراد خاص وہ نشانیاں ہونگی جو سابق کے انبیاء کو دی گئی تھیں اور اُنکی تکذیب ہو چکی تھی جیسے موسیٰ کا ید بیضا، اور عصا، عیسیٰ کا معجزۂ طائر اور ابراء اکمہ وابرص۔

رسالتمآبؐ کیلئے ان معجزات کو بطور آیت و علامت عطا نہیں کیا گیا بلکہ اس سے زیادہ مؤثر، کامیاب، اور روشن آیتیں، عطا ہوئیں جنہیں تکذیب کی گنجائش کم تھی۔

اسکے علاوہ بعض آیات قرآن مجید کے ہیں جنہیں خاص خاص معجزوں کی خواہش کو مسترد کیا گیا ہے۔

اسکے متعلق تحریر یہ ہو کہ ایک نبی ورسول جب مصلحت وقت کی مناسبت اور ماحول کی مطابقت سے ایک آیت، بینہ، نشان قدرت اور معجزہ ظاہر کر چکا ہو جو اپنے خصوصیات کے اعتبار سے کہ جن کا معیار عقلی بمطابقت آیات قرآن اسکے قبل ذکر ہو چکا حقیقۃً دلیل نبوت اور معیار حقانیت سمجھے جانے کے قابل ہو تو پھر اُمت میں سے کسی فرد کے مطالبہ پر کسی دوسرے

معجزہ کا پیش کرنا ضروری نہیں ہے اسلئے کہ حجت خدا اُسی پہلے معجزہ سے تمام ہو چکی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وقال الذین لا یعلمون لولا یکلمنا اللہ او تاتینا آیۃ کذلک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم قد بیّنا الآیات لقوم یوقنون۔

وہ کہ جو علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ کیوں نہیں خدا خود ہم سے بات چیت کرتا یا ہمارے پاس کیوں نہیں کوئی "آیت" آئی ایسے ہی اُنھوں نے بھی کہا تھا جو اُنکے پہلے تھے، ان سب کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ہم نے "آیتیں" واضح طور سے پیش کر دیں اُن لوگوں کیلئے جو یقین کرنے والے ہیں۔

اس میں اُن لوگوں کے مطالبہ آیت و اعجاز کا یہ کہکر جواب دیا گیا ہے کہ ہم اسکے قبل واضح طور سے آیات پیش کر چکے ہیں جو یقین کرنیوالوں کے لئے کافی ہیں۔

یہ اُن لوگوں کے استکبار کا نتیجہ تھا کہ جو معجزہ پیش ہوتا تھا وہ اسکے بعد دفع الوقتی کے طور پر دوسرے معجزہ کے ظاہر کرنیکا مطالبہ کرتے تھے حالانکہ وہی پہلا معجزہ اگر وہ ایمان لانے والے ہوتے تو ایمان لانے کے لیے کافی تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

واذا لم تأتھم بآیۃ قالوا لولا اجتبیتھا قل انما اتّبع ما یوحیٰ الیّ من ربّی ھٰذا بصائر من ربکم وھدی ورحمۃ لقوم یومنون۔

"جب تم کوئی خاص آیت پیش نہیں کرتے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے اسی آیت کو پیش کرنے کے لئے منتخب کیوں نہ کیا؟ (اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے دوسری آیتیں پیش ہو چکی تھیں) کہو کہ میں تو وحی ربانی کا پابند ہوں، یہ تمھارے پروردگار کی بصیرت افروز نشانیاں اور مومنین کی ہدایت و رحمت کی آیتیں موجود ہیں۔"

یقیناً آیات اور معجزات کا پیش کرنا صرف لوگوں کی طلب پر نہیں ہوتا بلکہ خود نبی د

رسول کی مرضی پر بھی نہیں ہوتا وصرف خداوند عالم کی حکمت ومصلحت کی بنا پر ہوتا ہے اور اسی لئے ارشاد ہوا۔

وماکان لرسول ان یأتی بایۃ الا باذن اللہ ۔	کسی رسول کو اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی آیت کو ظاہر کرے مگر خدا کے حکم سے ۔

اور اسی کو خاص انداز سے رسولؐ کو مخاطب کرکے ارشاد کیا جس سے درحقیقت عام لوگوں کی تنبیہ مقصود ہے ۔

وان کان کبر علیك اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتأتیھم بایۃ ۔	اگر تمھارے اوپر (اے رسول) انکی روگردانی بہت سخت ناگوار گذرتی ہے تو اگر تم میں قدرت ہے زمین میں کوئی سرنگ لیجانے کی یا آسمان پر سیڑھی لگانے کی تو ایسا کرو اور کوئی آیت پیش کرو ایسی کہ جس سے یہ لوگ ضرور ہی ایمان لے آئیں ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کی پیش کی ہوئی آیتیں انکے ایمان لانے کے لئے بیکار ثابت ہوئیں تو اب رسول کے امکان میں نہیں ہے کہ ایسی آیت پیش کریں جس سے وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔

اور رسول کی زبانی ان لوگوں کے مختلف مطالبات کے جواب میں یہ کہلوایا گیا ہے کہ سبحان اللہ ھل کنت الا بشرا رسولا " پاک ہے خدا کی ذات ، کیا میں کچھ اور ہوں سوائے ایک انسان کے جو رسالت کے عہدہ پر مقرر ہوا "

یعنی میں پابند ہوں خدا کے ارادہ کا اور اسکے خلاف نہیں کرسکتا جیسا کہ سابق الذکر آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ قل انما اتبع ما یوحیٰ الیّ من ربّی " میں تو بس اسی کا پابند ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی ہوتی ہے "

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ جس آیت کا مطالبہ جس وقت ہو وہ ضرور ہی اسکی خواہش کے مطابق پیش کر دیجائے لیکن اُسوقت ہے کہ جب خداوند عالم کی طرف سے درحقیقت ایسے آیات و معجزات پیش ہو چکے ہوں جو بجائے خود اُس نبی کی حقانیت کی دلیل ہیں لہذا کسی شخص کے دعوائے نبوت کے بعد مطلق معجزہ کا مطالبہ حق بجانب ہوگا لیکن مطلق معجزہ کے بعد کسی معجزہ خاصہ کا مطالبہ؟ نہیں لہذا ایک طرف مذکورہ بالا آیات سے عیسائی حضرات کی مطلب برآری کہ حضرت رسول اکرم کو مثل انبیائے سابق معجزات ملے ہی نہیں تھے۔ ورنہ آپ معجزہ کی خواہش کو اس طرح مسترد کیوں کرتے؟ ہرگز صحیح[1] نہیں ہے۔

---

[1] لطف یہ ہے کہ انجیل مقدس میں حضرت عیسٰی یسوع مسیح کا معجزہ کے مطالبہ پر نہ صرف انکار کرنا بلکہ معجزہ کی خواہش کرنیوالوں کو سخت سست کہنا اور اپنے پاس سے نکالدینا اور تصریح کرنا کہ اس زمانہ والوں کو کوئی نشانی نہ دکھلائی جائیگی مذکور ہے ملاحظہ ہو انجیل مرقس باب ۸ نمبر ۱۱-۱۳ "پھر فریسی نکلکر اس سے بحث کرنے لگے اور اُسے آزمانے کیلئے اُس سے کوئی آسمانی نشانی طلب کی۔ اُس نے اپنی روح میں آہ کھینچکر کہا اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائیگا۔ اور وہ انھیں چھوڑکر پھر کشتی میں بیٹھا اور پار چلا گیا"

انجیل متی باب ۱۲ نمبر ۳۸ "تب بعض فقیہوں اور فریسیوں نے اس سے کہا اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں اس نے جواب دیکر اُن سے کہا کہ اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان انکو نہ دیا جائیگا کیونکہ جیسے یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہیگا"

انجیل یوحنا باب ۶ نمبر ۳۰-۳۵ "انھوں نے اس سے کہا پھر تو کونسا نشان دکھاتا ہے تاکہ ہم دیکھکر تیرا یقین کریں؟ تو کونسا کام کرتا ہے؟ ہمارے باپ دادوں نے بیابان میں من کھایا چنانچہ لکھا ہے کہ اس نے انھیں کھانے کیلئے آسمان سے روٹی دی یسوع نے اُن سے کہا میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ موسٰی نے تو وہ روٹی آسمان سے تمھیں نہ دی لیکن میرا باپ تمھیں آسمان سے حقیقی روٹی دیتا ہے کیونکہ خدا کی روٹی وہ ہے جو آسمان سے اترکر دنیا کو زندگی بخشتی ہے انھوں نے اُس سے کہا اے خداوند یہ روٹی ہمکو ہمیشہ دیا کر یسوع نے اُن سے کہا زندگی کی روٹی میں ہوں جو میرے پاس آئے وہ ہرگز بھوکا نہ ہوگا اور جو مجھ پر ایمان لائے وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عیسٰی نے طلب معجزہ کی بات کو حیلہ حوالہ سے ٹالدیا ہے اور اُنکی خواہش کو پورا نہیں کیا۔ نیز انجیل لوقا باب ۲۳ نمبر ۸-۹ "ہیرودیس یسوع کو دیکھکر بہت خوش ہوا کیونکہ مدت سے اُسکے دیکھنے کا مشتاق تھا اسلئے کہ اُس کا حال سنا تھا اور اسکا کوئی معجزہ دیکھنے کا امیدوار تھا اور وہ اُس سے بہتیری باتیں پوچھتا رہا مگر اُس نے اُسے کچھ جواب نہ دیا" ۱۲

اور دوسری طرف ہمارے بہائی اور قادیانی احباب کا یہ استدلال کہ نبی و رسول کے لئے معجزہ کی ضرورت ہی نہیں اور نہ کسی کو نبی سے معجزہ کے مطالبہ کا حق ہے ۔۔

پھر معلوم نہیں نبی پر ایمان کیوں لایا جائے اور راست و دروغ کا امتیاز کیونکر ہو؟

قرآن مجید کا اعجاز | تمام اُن معجزات سے قطع نظر کرکے جو وقتی حیثیت رکھتے تھے اور مثل دیگر انبیاء و مرسلین کے معجزات کے کسی خاص غیر معمولی حیثیت کے مظاہرہ پر مشتمل تھے خود قرآن مجید، اس کلام خاص کو بطور اعجاز پیش کیا گیا اور دلیل نبوت رسالتمآب قرار دیا اور تمام دنیا کے لبوں پر مہر سکوت لگی رہی اور کسی کو اس دعوے کے خلاف زبان کشائی کی مجال نہ ہوسکی ۔ قرآن نے بلند آواز سے فضائے عالم کی خاموشی اور اُس خاموش فضا کے سناٹے کو اپنی سچائی کا ثبوت قرار دیا اور ارشاد ہوا ۔ ام یقولون تقولہ بل لا یؤمنون فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین ۔

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے رسول نے اپنے دل سے بنا لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو ایمان لانا نہیں ہے اسلئے ایسی باتیں بناتے ہیں اچھا تو پھر ایسی ہی بات چیت یہ بھی بنا لائیں اگر یہ سچ کہتے ہیں"

اور عقل رکھنے والوں کو اُس نے آواز دی اس طرح کہ اُن کے دلوں پر اثر ڈالے افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا "یہ لوگ آخر قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟ یا حقیقت میں اُنکے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں"۔

اور اپنی مخاطب دنیا کی عاجزی پر رحم کھاتے ہوئے پورے قرآن سے اپنے مطالبہ کو تھوڑے حصہ کی طرف منتقل کیا اور کہا ام یقولون افتراہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین فالم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الٰہ الا ھو فھل انتم مسلمون ۔

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول نے اس کو اپنے دل سے گڑھ لیا ہے؟ کہو کہ اچھا تم دس ہی سورے

ایسے گڑھے ہوئے بنا کر لے آؤ اور خدا کے علاوہ جس جس کو چاہو اُس کو بلا کر پیش کر دو اگر سچے ہو۔ اگر یہ لوگ تمہارے اس مطالبہ کو پورا نہ کریں تو یقین سمجھو کہ یہ خدا کے علم و حکمت کے ساتھ نازل ہوا ہے اور یہ کہ سوائے اُس معبود برحق کے کوئی خدا نہیں ہے تو کیا اب بھی تم اسلام نہ لاؤ گے؟"

جب سکوت کا دور دورہ رہا اور خاموش فضا نے بالکل عاجزی کا اقرار کر لیا تو زحمت کم کر دی گئی غرور خود بینی کو ایک اور ٹھوکر لگائی گئی اور دس سورتوں کے بجائے صرف ایک سورۃ کے جواب کا مطالبہ کیا۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورة من مثله وادعوا شهداءكم من دون الله ان كنتم صادقين"

یہ تمام اعلانات کئے گئے اور بآواز بلند دنیا کو متوجہ کیا گیا لیکن دنیا کے اوپر ایک سکوت کا عالم طاری رہا اور "صدائے برنخواست" کا نقشہ رہا اسوقت اُس نے اپنے زلزلہ افگن اور لرزہ انداز لہجہ میں پکار کر اعلان کیا کہ :۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل هذا القرآن لا یأتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا۔

"(کہہ دو اے رسول کہ تم کیا ہو؟) اگر تمام انس و جن جمع ہو کر یہ چاہیں کہ اس قرآن کا مثل پیش کریں تو ہرگز اس کا مثل نہ لائینگے، چاہے وہ باہم ایک دوسرے کے پشت پناہ اور معین و مددگار بن گئے ہوں"

عرب کی تمام گردنیں جھکی رہیں اور دہنوں میں قفل لگے رہے کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اسے معمولی بات سمجھ کر سرسری طور سے ٹالدینے والے صبر و سکون کے لمحوں میں غور کرنے کی زحمت نہیں اُٹھاتے صورت حالات پر نظر نہیں ڈالتے، عرب کے طبائع اور نفسانی حالات کا احساس نہیں کرتے واقعات و خصوصیات مقام پر نگاہ نہیں کرتے سنو ذرا اور غور سے سنو۔

خدا کا رسول (محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرب کے قبیلۂ قریش میں بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے، باپ اور ماں دونوں طرف سے یتیم ہے اور نہ کسی سے تحصیل علم کرتا نہ ادبیات کی تکمیل کرتا اور نہ کبھی نظم شعر اور انشا پردازی کا کوئی مظاہرہ کرتا ہے۔

وہ تمام لوگوں کے علم و یقین میں پورے طور سے امّی اور ان پڑھ ہے، اُسے وہ نظم شعر کی قوت تک حاصل نہیں ہے جو عرب کے اکثر افراد کو حاصل ہوا کرتی تھی اور جس کو وہ اپنا خاص جوہر امتیاز سمجھتے تھے۔

اسکے برخلاف اُن میں ایسے ایسے افراد موجود تھے جو فصاحت و بلاغت کے خداوند اور نظم شعر و کلام کے مستقل فرمانروا سمجھے جاتے اور اپنے تئیں سمجھتے تھے، وہ انداز گفتگو اور طریق بیان انواع کلام کے متعلق نظر ناقد بھی ایسی رکھتے تھے کہ کلام کے تمام پہلو اور اطراف و جوانب کا احساس کرتے اور اُسکے تمام نکات و اسرار پر حاوی ہو جاتے تھے۔

اسکے ساتھ اُن میں وہ خاص حمیّت نفسانی اور غیرت فطری بھی موجود تھی جو ضرب المثل کے طور پر دنیا میں مشہور اور خلق کے زبان زد ہے۔

وہ اپنے ذلت آمیز ٹوکے جانے کے موقع پر شیر کی طرح بپھرتے اور چیتے کی طرح حملہ کرتے تھے۔ اُنکی رگوں میں خون دوڑنے لگتا تھا اور اُن کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو جاتی تھی، وہ جب تک اپنے مقابل کو شکست نہ دیدیں اور اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لیں اُن کا جوش طبعی کم نہ ہوتا تھا۔ اُن میں ابوطالب کا پرورش کردہ، اپنی ہی قوم کا پلا پوسا تربیت کیا ہوا، یتیم بچہ کھڑا ہوتا اور اُن کو کلمۂ توحید کی طرف دعوت دیتا، اُنکے اُن خداؤں کو جنکی عبادت پر اُنکے آباؤ اجداد کی عمریں ختم اور خود اُن کی پشتیں خمیدہ ہوئی تھیں۔ وہ برا کہتا اور اُنکی عظمت و اہمیت کم کرتا اور اُنکی خدائی سے انکار کرتا ہے۔

یہ اُنکے دلوں پر تلوار سے زیادہ مؤثر اور نیزوں کے وار سے زیادہ کاری زخم کی حیثیت رکھتا

اور انتہائی تکلیف وہ تھا۔ وہ اس تبلیغ کرنے والے کو ہر طرح کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ ارشاد ہوا ما اوذی نبیّ قط کما اوذیت۔ کسی نبی کو اتنی تکلیف نہیں پہونچائی گئی جتنی تکلیف مجھے دی گئی۔

ان لوگوں نے ایسے تمام تدابیر اختیار کئے جنکے ذریعے سے رسولؐ کی زباں بندی کی جاسکے ڈرایا، دھمکایا، ابوطالب کو واسطہ قرار دیا اور فہمایش کرائی۔ ترک موالات اور قطع معاملات کیا ہنسی مذاق میں اڑایا اور تمسخر و استہزا کیا۔ پتھر مارے، اور کوڑا پھینکا۔ مال و دولت کی لالچ دلائی اور حرص و طمع کے جذبہ سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ جب یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو پورے طور سے آپ کا چراغ گل کرنے اور آپ کا نام و نشان محو کرنے پر طیار ہو گئے۔ جلسہ کیا مسئلہ پر غور کیا۔ اور تمام قبائل عرب میں سے خونخوار جوان منتخب کر کے رسولؐ کے قتل کا منصوبہ باندھ لیا گھر کو گھیر لیا اور پورے طور سے محاصرہ کر لیا۔

بے شک خدا نے حفاظت کی اور اپنی حمایت خاص کے پردہ میں رسول کو چلے جانے پر مامور کیا۔ رسولؐ نے شہر چھوڑ دیا۔ وطن سے جدائی اختیار کر لی۔ گھر بار اور خانہ کعبہ کا جوار سب انکے حوالہ کیا۔

اس پر بھی انکی کینہ پروری و عداوت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ آپکے چند ساتھی جو مکہ میں رہ گئے تھے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں۔ بعض کو ان میں سے قتل کیا۔

خود آپ سے جنگ کیلئے آپکے محل قیام یعنی مدینہ منورہ پر فوج کشی کی اور بار بار آپکے اوپر حملہ کیا۔ ہر مرتبہ خدا نے انھیں شکست دی اور ہر بار جان و مال اور بڑے بڑے بہادر جوانوں کو ہاتھ سے کھو کر انھیں واپس ہونا پڑا۔

بدر کی شکست کا ایسا سخت اثر پڑا کہ عہد کئے گئے کہ کوئی شخص عورتوں کے قریب نہ جائے گا

راحت و آرام سے دوچار نہوگا۔ عورتیں سوگ کے کپڑے نہ اتارینگی۔ بالوں میں کنگھی نہ کرینگی جبتک مقتولین بدر کے خون کا بدلہ نہلے لیا جائے۔

یہ جنگ کی کاوش کا خاص نتیجہ تھا کہ انکی عورتوں اور بچوں کی معیت میں میدان جنگ کا قصد کیا تھا جو فرار کے وقت پیروں کی بیڑیوں کا کام دیں اور میدانِ جنگ میں ٹھہرنے پر مجبور رکھیں۔ وہ مردوں کو غیرت بھی دلاتی اور پست ہمتوں میں جوش وولولہ پیدا کرتی تھیں۔

لیکن اس جنگ کا بھی انجام مشرکین کے حق میں اچھا نہیں ہوا اور انھیں ناکامیاب واپس جانا پڑا اب قریش کو اپنی انفرادی طاقت سے کامیابی حاصل کرسکنے میں ناامیدی ہوگئی تھی۔ اسلئے تیسری مرتبہ انھوں نے آخری کوشش صرف کردی کہ تمام قبائل عرب کو جن میں یہودی بھی داخل تھے اپنے ساتھ متحد ومتفق کرکے اجتماعی طاقت سے رسولؐ کا مقابلہ کریں۔

یہ جنگ خندق ہے جس کا نام اسی وجہ سے جنگ "احزاب" ہوا ہے کہ اس میں تمام جماعتیں کفر کی متفق ہوکر برسرپیکار ہوئی تھیں۔

نتیجہ معلوم ہے کہ سوائے ناکامی کے کچھ نہیں ہوا۔ اُن کا ہزار کے مقابلہ میں اکیلے لڑنیوالا بہادر عمرو بن عبدود تلوار کے گھاٹ اترا اور بڑی ذلت سے تمام افواج کو پسپا ہوجانا پڑا۔

بس یہ آخری جنبش تھی جسکے بعد ہمیشہ کے لئے ہمتیں پست ہوگئیں۔ اسکے بعد مشرکین قریش سے کوئی لڑائی نہیں ہوئی ہی۔ جو کچھ لڑائی ہوئی ہی وہ یہود خیبر یا بنی ہوازن وغیرہ کے قبیلوں سے جو مکہ کے باہر رہتے تھے۔

اب مشرکین اپنی تمام ناکامی و مایوسی کے ساتھ مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ اور رسولؐ کی ترقیوں اور کامیابیوں سے کینہ و فساد کی آگ اُن کے دلوں میں شعلہ ور رہی جس کا نتیجہ تھا کہ اُسوقت جب رسالتمآبؐ نے باارادہ حج مکہ معظمہ کا سفر کیا اور چاہا کہ طواف خانہ کعبہ کریں تو وہ لوگ آپکے دخلہ

مکہ سے مانع ہوئے اور آپ نے حدیبیہ میں صلح کر کے واپس چلے آئے لیکن مشرکین اُن شرائط صلح پر پورے طور سے قائم نہیں رہے جس کے نتیجہ میں رسالتمآبؐ کو پھر مکہ معظمہ پر حملہ کرنا پڑا اور فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اکثر مشرکین نے بخوف و دہشت اسلام قبول کیا اور اُٹھی ہوئی گردنیں پست ہوگئیں، انتہائی ذلت اور حقارت نصیب ہوئی۔

اتنی لڑائیاں۔ اتنی مصیبتیں۔ اتنے نقصانات۔ اتنے خسارے برداشت کیے لیکن قرآن پہلے ہی دن سے اُن سے انصاف کا طالب تھا۔ ان تمام زحمتوں اور مشقتوں کا معمولی سا آسان حل پیش کر رہا تھا۔ وہ اُن سے صرف ادبی مقابلہ کا طالب تھا اور اپنے پورے مجموعہ نہیں بلکہ چھوٹے سے چھوٹے کسی سورہ کا جواب مانگ رہا تھا۔

اور بات ایسی نہ تھی جو اُنکے زبردست علم وفن سے بے تعلق اور اُنکے حدود اقتدار سے خارج ہوتی جس میں انھیں اس عذر کا موقع ہوتا کہ ہم اس علم کو کیا جانیں۔ بلکہ بات اُسی نوعیت کی تھی جس میں اُن کو انتہائی کمال و اقتدار کا دعویٰ تھا۔ یقیناً اگر اُن میں قدرت ہوتی تو وہ قرآن کے مطالبہ کے مطابق عوض جنگی ہنگامہ آرائی کی ادبی معرکہ آزمائی کرتے صفوف لشکر کے بدلے سطروں کی صفیں قائم کرتے تلوار کے بجائے قلم کے جوہر دکھلاتے اور جلسے محفلیں کانفرنسیں منعقد کر کے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرتے۔ اس صورت میں اسلام کی آواز پست، اُسکی صدا خاموش اور اُس کا چراغ گل ہو جاتا۔

خونریزی کی نوبت نہ آتی، جنگ آزمائی کی ضرورت نہ پڑتی، شورش و ہنگامہ کی صورت پیدا نہ ہوتی۔

لیکن جب اُنھوں نے قرآن کے پے درپے تازیانوں کے باوجود اس میدان سے گریز اختیار کیا اور حرب و ضرب، جنگ و جدل کو اُسکے تمام مہلک نتائج کے باوجود مقابلہ کے لئے اختیار کیا

تو اس سے اُنکی عاجزی، بےبسی اور پست ہمتی کا راز طشت از بام اور مقابلہ کے میدان میں اُن کی بے دست و پائی کا منظر بالکل نمایاں ہوگیا۔ پھر جب باوجود اس اقتدار خاص اور کمال کے قرآن کے مقابلہ میں عاجز رہے تو دوسرے کو مجال دم زدن کہاں ہوسکتی ہے۔

اور پھر اس پر حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کو چودہ سو برس کے قریب ہونے آتے ہیں اور قرآن اُسی ایک آواز سے اپنی مقابل دنیا کے ہر طبقہ کو صدا دے رہا ہے اور پکار رہا ہے اور عالم کی فضا اُسکے دعوٰئے ہمتایی سے گونج رہی ہے اور اُسکے مخالف اپنی تحریک کی اشاعت اور قرآن کے تعلیمات کی پامالی میں سلطنتوں کی طاقت، مال و دولت کا زور اور گرانقدر خزانوں کا سرمایہ صرف کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن قرآن کی آواز (فاتوا بسورۃ من مثلہ) آجتک سچی ہے اور ہمیشہ سچی رہیگی۔

یہ ہے قرآن مجید کا اعجاز جس کو دنیا زبان سے جھٹلائے لیکن اُس کا دل اعتراف کرے گا اور ظاہر میں اسکو تسلیم نہ کرے لیکن اُسکی عاجزانہ سپراندازگی خود اُسکی قلبی مرعوبیت کا اعلان کردیگی۔

سلسلۂ معجزات میں قرآن کا امتیاز

تمام انبیاء آیات و بینات یعنی معجزات کیساتھ مبعوث ہوئے لیکن اُنکی نبوتوں کے چراغ خاموش ہوگئے اسلئے کہ اُنکی بنیاد ایسے معجزات پر تھی جو فنا ہونے والے اور اپنے وجود کو ماضی کے سپرد کرکے مستقبل میں بےنام و نشان قرار پا جانے والے تھے۔

وہ اگرچہ اپنے وقت پر لوگوں کے سر تسلیم خم کرانے اور اتمام حجت کردینے کے لئے کافی بھی تھے تو کچھ عرصہ کے گذرنے کے بعد اُنکی صحت و واقعیت روایات اور مختلف المضمون حکایات کی رہین منت ہو گئی جو اگر قریبی زمانہ میں قرائن کی موجودگی کے باعث قطعی و یقینی بھی تھی تو اور زیادہ مدت کے بعد وہ مشکوک اور پھر موہوم کے درجہ پر پہنچ گئی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر یہود سے موسیٰ کے نبوت کا ثبوت کوئی شخص منکر ہو کر طلب کرے اور
عیسائیوں سے عیسیٰ کی نبوت کا اسی صورت سے تو انھیں سوائے خموشی کے چارہ کار نہیں ہے۔
اسلئے کہ انکی کوئی نشانی غیر معمولی طور پر چلتی جاگتی ہوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ موجودہ
زمانہ میں انکی تصدیق کا کوئی فعلی ذریعہ موجود ہے۔

اور یہی بہت بڑی نشانی ہے اس امر کی کہ انکی نبوتیں محدود دور زمانہ سے متعلق تھیں جس کے بعد
براہ راست انکی نبوتوں پر ایمان لانے اور انکی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہی نہیں باقی
ہے تاکہ بلاواسطہ انکے دلائل نبوت پیش حقانیت کے وجود کی ضرورت باقی ہوتی۔ بے شک آن کے بعد
آنیوالے نبی کے ایمان کے بعد جس نے تصدیق کر دی ہو اپنے ماقبل دوسرے انبیاء کی خود بخود انکی نبوت پر
ایمان لانا ضروری ہوگا لیکن یہ ایمان ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور اسکے لئے وہی دلائل و بینات
جو نبی مابعد کی حقانیت و صداقت کیلئے موجود ہیں پورے طور سے کافی ہیں۔

بیشک حضرت رسول اکرم محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم جنکی نبوت آخری نبوت اور شریعت ابدی شریعت
تھی انھیں خداوند عالم نے معجزہ بھی ایسا عطا کیا جو آپ کی نبوت کیلئے دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا ہے
اور ہر زمانہ میں حضرت کی نبوت کو تقلیدی حیثیت سے نکالکر تحقیقی دائرہ میں لانے کا ذمہ دار ہے۔

یقیناً حضرت کیلئے بہت سے غیر معمولی خارق عادات یعنی سابق زمانہ کے انبیاء کو ملنے والے
وقتی معجزات بھی عطا ہوئے تھے جو کبھی مشرکین کے مطالبہ پر اتمام حجت کے طور پر (جیسے معجزہ شق القمر)
اور کبھی بغیر کسی اہمیت پیدا کئے ہوئے صرف اقتدار روحانی کے سبب موجودہ ضرورت کی بنا پر
(جیسے رجعت شمس) ظاہر ہوئے لیکن میں اسوقت بہت اعلان کے ساتھ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ
حضرت کی نبوت و رسالت کی بنیاد ان معجزات پر نہیں تھی۔

یہ بات ایک حد تک بہت سے افراد کو عجیب معلوم ہوگی کہ ہیں ان میں سے اکثر خوارق عادات کے

اصطلاحی حیثیت سے تعریف معجزہ میں داخل ہونے میں بھی تامل رکھتا ہوں۔

میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس طرح موسیٰ کا برہان خصوصی ثبوت نبوت کے متعلق اژدہا بنجانیوالا عصا اور چمک دینے والا ید بیضا تھا کہ جب پوچھا جاتا آپکے نبوت کی دلیل کیا ہے وہ اپنے عصا کو پھینکدیتے، اپنے چمکتے ہاتھ کو دکھاتے۔

جس طرح عیسیٰ کا برہان خصوصی ابرار اکمہ وابرص۔ احیاء موتیٰ چڑیا کا پتلا بنا کر اسکو اڑا دینا اور خبر دینا کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کتنا تمہارے گھروں میں رکھا ہے یہ تمام امور تھے اور جب آن سے دلیل نبوت دریافت کی جاتی تو وہ ان امور کو پیش کرتے۔

اس طرح ہرگز ہرگز ہمارے رسول کا برہان خصوصی آپ کا معجزہ شق القمر نہیں تھا۔ کہ جب آپ سے آپ کی نبوت کی دلیل دریافت کی جاتی آپ اس کے ثبوت میں شق القمر کے معجزہ کو پیش کرتے۔

ہرگز نہیں، وہ چیزیں جو دوسرے انبیاء کے یہاں سرمایہ نبوت اور خزانہ ثبوت رسالت تھیں ویسی چیزیں ہمارے رسولؐ کے لیے بالکل سرسری اور ضمنی حیثیت رکھتی تھیں۔

آپکے دور رسالت میں یہ کوئی اہم واقعہ نہیں تھا کہ آپ سے کسی موقع پہ کسی جماعت نے یہ خواہش کی کہ ہمیں چاند دو ٹکڑے ہوتے دکھائی دے اور آپ نے دکھا دیا۔

یا آپکے وصی کو بضرورت شرعی نماز میں تاخیر ہوئی تو ڈوبتا ہوا آفتاب واپس ہوا یہ چیزیں ان حضرات کے معمولی آثار زندگی اور واقعات حیات میں ایک جزئی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور اُن کو کبھی ثبوت رسالت میں پیش کیا جانا ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ہرگز رسالتمآبؐ یا انکے وصی حقیقی نے ان واقعات کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ کبھی اگر اپنی رسالت اور حقانیت کا ثبوت پیش کرنا ہو تو وہ ان واقعات کا حوالہ دیں اور کہیں کہ ہماری حقانیت کا یہ ثبوت ہے کہ فلاں تاریخ

ہمارے لئے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے یا فلاں تاریخ ہمارے لئے آفتاب نے رجعت کی۔
یہ مخالفین اسلام کی ایک چالاکی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں آکر بجائے خود انکی کمزوری کو طشت از بام کرنے کے لئے اس قسم کے واقعات کو معرض بحث بناتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسطرح اصولی بحثیں دب جائیں، اسلام کی حقانیت کی اصل بنیادیں پردۂ خفا میں چھپ جائیں اور ہم مسلمانوں کے عقائد کو صرف مجموعۂ اوہام و خرافات ثابت کرکے زندہ دل دنیا کو تھوڑی دیر ہنس لینے کا موقع دیدیں۔
مجھے سخت افسوس ہوگا اگر مسلمان محققین ان اشخاص کی اس چالاکی کا شکار ہوجائیں اور وہ ان مباحث کو اپنے مذہب کی اصل بنیاد سمجھ کر اسکے اثبات اور اسکے اوپر ردوقدح میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیں۔
اسلئے میں تو کم از کم اپنے لئے یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ کبھی اس قسم کے خصوصی معجزات مسئلہ شق القمر مسئلہ رجعت شمس کو اپنی بحث کا مستقل مرکز نہ قرار دوں۔
بیشک ضمنی حیثیت سے جیسے اکثر تاریخی واقعات کی نقلی و عقلی ہر حیثیت سے جانچ کیجاتی ہے اسی اعتبار سے جب اس کا موقع آئے تو ان واقعات کی بھی علمی تحقیقات کرلی جائے جس کے لئے صرف دو بنیادی نگاہیں کرنا ہونگی۔ ایک یہ کہ واقعہ حقیقۃً غیر ممکن الوقوع اور عقلاً محال تو نہیں ہے۔ دوسرے برصورت امکان وہ روایات جن سے انکے وقوع کا پتہ چلتا ہے کس حد تک قابل تسلیم ہیں۔
اگر یہ امر غیر ممکن حیثیت نہیں رکھتے اور صحیح سچے راویوں نے انکے وقوع کے خبر دی ہے تو صرف عام طور سے ایسا نہونا اور ان کا غیر معمولی ہونا انکے عدم کی دلیل نہوگا۔
بہرحال یہ ایک اتفاقی تحقیقات ہوگی جس کو مذہب کے اصول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نہ صرف واقعہ رجعت شمس کا مرہون منت ہے، اور نہ معجزۂ شق القمر کا۔

بلکہ اسلام اپنی صداقت و حقانیت کیلئے ہزاروں، لاکھوں معجزوں کا ایک معجزہ رکھتا ہے۔
جس کا نام ہے قرآن ۔
بیشک مسلمانوں کا سرمایۂ حقانیت سرچشمۂ صداقت بنیاد دین و مذہب جو کچھ ہے وہ یہی قرآن ہے۔
قرآن کو جو امتیاز حاصل ہے وہ دنیا کے کسی معجزہ کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن ہمیشہ زندہ ہے اور رسولؐ
کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کو زندہ کیے ہوئے ہے۔
وہ عہد ماضی کا افسانہ نہیں ہے بلکہ ہر زمانے کے حال میں موجود ہے اور دنیا کو اپنی حقانیت کے
سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دے رہا ہے ۔
یہ اس کتاب کا ایک ثمرۂ فیض ہے کہ سابق انبیاء کی نبوتیں بھی مسلمانوں کے لئے قابل تسلیم
اور لائق قبول ہو گئی ہیں ۔
ورنہ اگر قرآن میں موسیٰ و عیسیٰ وغیرہ کا تذکرہ نہ ہوتا تو کسی طرح موسیٰ اور عیسیٰ کی نبوت دائرہ
احتمال سے نکل کر احاطۂ یقینیات میں داخل نہیں ہو سکتی تھی ۔
معجزۂ قرآنی کی ایک اور خصوصیت جو دنیا کے کسی دوسرے معجزہ میں پائی نہیں جاتی
یہ ہے کہ جتنے ارکان اعجاز کے ہیں ان سب کو وہ خود اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور مقدمات و
قرائن خارجیہ یا صرف عقل کے سپرد نہیں رہنے دیا ہے ۔ دوسرے معجزات کی صورت یہ ہے کہ
امر خارق عادت آنکھوں کے سامنے پیش ہوا لیکن اسکے معجزہ ہونے میں جتنی باتوں کی ضرورت
ہے وہ خود اس میں مضمر نہیں ہیں، وہ ایک خاموش مشاہدۂ غیبی ہے لیکن وہ اپنی زبان سے نہیں
اعلان کرتا کہ میرا ظاہر کرنیوالا مدعی نبوت و رسالت بھی ہے جو ایک خارق عادت کے معجزہ ہونے کا
رکن اعظم ہے۔ اسکے لئے ضرورت ہو گی کہ علیحدہ سے اس شخص کے دعاوی کو دیکھا جاوے تو
معلوم ہو کہ وہ مدعی ہے نبوت کا یا نہیں ؟ ۔

اسکے علاوہ وہ اس استدلال کو بتلا نہیں سکتا کہ خارق عادت کے ظاہر کرنے اور اُسکے مظہر مدعی نبوت کی سچائی میں کیا رشتہ ہے؟

اسکے لئے پھر عقل کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہے کہ وہ دلیل کو ترتیب دے اور بتلائے کہ خارق عادت کا ظاہر کرنا کس طرح حقانیت و راستی کا یقینی ثبوت ہے۔

پھر وہ اسے کبھی نہیں بتاتا کہ میرے ظاہر کرنیوالے کے اوصاف و خصوصیات کیا ہیں؟ اور یہ بھی ثبوت اعجاز کا ایک بڑا رکن ہے۔ اسلئے کہ ہم سابق میں تحریر کر چکے ہیں کہ اگر مدعی نبوت ایک ایسا شخص ہے جس کی سابقہ زندگی اور افعال و اعمال کی گندیدگی خود اُسکے دعوے کے رد کرنے کے لئے کافی ہے تو اس صورت میں وہ لاکھ غیر معمولی کرتب دکھلائے کسی طرح خدا پر ذمہ داری عائد نہ ہوگی اور اسکے اوپر ان عجیب و غریب مظاہرات کو باطل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ان معجزات کے ساتھ یا الگ سے اُس نبی کی سیرت، سابقہ و لاحقہ زندگی کے اعتبار سے دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اُس کے افعال و اعمال و اقوال و تعلیمات کیسے ہیں اور وہ اس کو نبوت و رسالت کے دعوے کے لائق ثابت بھی کرتے ہیں؟ یقیناً وہ تمام معجزات ان تمام اعتبارات سے بالکل گنگ اور خارجی تحقیقات اور عقلی غور و فکر کے دست نگر و ممنون احسان ہوتے ہیں لیکن یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ وہ معجزہ ہے اور اعجاز کے جتنے ارکان و خصوصیات ہیں وہ سب اُسی میں موجود ہیں اور کہیں اُس سے علیحدہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بحث ہمارے شیخ الحدیث اس دور آخر کے سب سے بڑے علامہ متکلم، اور مجاہد ملی آیۃ اللہ شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ نے اپنی کتاب "آلاء الرحمٰن فی تفسیر القرآن" میں تحریر کی ہے جسے ہم وہیں سے اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔

(پہلا امر) یہ ہے کہ قرآن مجید میں صاف صاف اپنے حامل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دعوائے نبوت و رسالت کا اظہار موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل۔

(۱) قل یا ایھا الناس انی رسول اللّٰہ کہو کہ اے گروہ مردم، میں خدا کا رسول ہوں

الیکم جمیعا (سورہ اعراف)	تم سب کی جانب ۔
(۲) ما ضلّ صاحبکم وما غوی وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ ۔ (سورۂ نجم)	تمھارا ہدایت کرنیوالا شخص نہ تو گمراہ ہوا اور نہ سرگشتہ وہ اپنی خواہش دل سے کلام ہی نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کلام کرتا ہے ۔
(۳) محمّد رسول اللہ والذین معہ اشدّآء علی الکفّار (سورۂ فتح)	محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ اُنکے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلہ میں بڑے سخت ہیں ۔
(۴) ماکان محمّد ابا احد مّن رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیّین (سورۂ احزاب)	محمدؐ نہیں ہیں تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن وہ خدا کے رسول اور فہرست انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں ۔

(دوسرا امر) یہ کہ اُس نے اپنے غیر معمولی انداز اعجاز کو آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل بتلایا اور کہا کہ اگر تم کو انکی سچائی اور صداقت میں شک ہو تو اسکے مثل پیش کرو اور اگر ایسا نہ کر سکو فاعلموا انما انزل بعلم اللہ "تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

اس طرح اعجاز کے وجہ استدلال عقلی کو اہل عقل کے متنبہ کرنے کے لئے ذکر کیا ۔ اس پہلو کو تفصیل سے سابق میں تحریر کیا جا چکا ہے جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے ۔

(تیسرا امر) یہ کہ اُس نے جناب رسالتمآبؐ کے اخلاق کی پاکیزگی اور کمال طہارت کو متعدد آیات میں ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ آپ کی زندگی اخلاق حسنہ اور سچائی اور پاکیزگی کا نمونہ رہی ہے جس کی بنا پر آپکے دعوے کی صحت میں کوئی عقلی خرابی نہیں پائی جاتی ۔ ارشاد ہوا ۔

انّک لعلیٰ خلق عظیم (سورۂ قلم)	تم بڑے اخلاق کے اوپر فائز ہو ۔

ودوا لو تدهن فید هنون	ان لوگوں کو یہ آرزو ہے کہ تم سے کسی دورنگی کا ظہور ہو تو یہ بھی دورنگی سے کام لیں ۔

نیز آپ کے تعلیمات کی پاکیزگی کے متعلق ارشاد کیا ۔

یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر (سورۂ اعراف)	وہ انھیں اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں ۔

اور خود اپنے مندرجہ تعلیمات پر اہل نظر کو سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع دیتے ہوئے ارشاد کیا۔

ان ھذا القران یھدی للتی ھی اقوم ۔ (سورۂ بنی اسرائیل)	یہ قرآن دعوت دیتا ہے ایسی باتوں کی طرف جو بالکل سیدھی سیدھی اور صحیح ہیں ۔

اس طرح قرآن مجید نے تمام وہ پہلو جو ایک معجزہ کی صحت و صداقت کے سلسلہ میں غور کے قابل ہیں سب خود ہی پیش کر دئے اور اہل نظر کی نظر کے سامنے رکھ دئیے جس کے بعد غور کرنا نہ کرنا خود اشخاص کا ذاتی فعل ہے ۔

قرآن مجید کی حیثیت اعجاز وہ لوگ جو قرآن مجید کو معجزہ سمجھتے اور خداوندی کلام تسلیم کرتے ہیں اُن میں اس حیثیت سے تھوڑا اختلاف ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کس حیثیت سے معجزہ ہے ؟

وہ اس میں مختلف اقوال پر منقسم ہو گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ حقیقت سے الگ قول میرے خیال میں اُن لوگوں کا ہے جو قرآن کو صرفہ و سلب قوی کے اعتبار سے معجزہ سمجھتے ہیں ۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ قرآن بجائے خود تو عام فصحائے عرب کے کلام کے مثل کلام ہے لیکن یہ خدا کی قدرت ہے کہ اس کا جواب دینے پر کسی کو قدرت نہ ہو اور جب کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہے تو خدا اسکی قوت کو سلب کر دے اور موانع پیدا کر دے ۔

یہ قول اگرچہ مطابق واقعہ ہونے کی صورت میں نتیجۂ اعجاز کے اعتبار سے کوئی خرابی نہیں دیتا

اور بیشک اس صورت میں بھی وہ معجزہ قرار پاتا اور نبوت و رسالت کی دلیل ہوتا ہے لیکن خود وہ خلاف واقعہ ہے،۔

ذوق و وجدان، فن بلاغت اور احساس فصاحت، کلام ادبا کا تتبع اور انسانی فصاحت و بلاغت کے معیار کا موازنہ اس خیال کو بالکل غلط ثابت کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب ہم خالی الذہن ہو کر بغیر کسی خیال معارضہ و مقابلہ کے بھی آیات قرآن پر نظر ڈالتے ہیں اور اُن کا مطالعہ کرتے ہیں تو انسانی سطح سے بلند شان اور انسانی قدرت و اختیار کے حدود سے باہر کلام ہمارے سامنے آتا ہے جس سے ہمیں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ بیشک کلام ہی ایسا ہے جو انسانی طاقت و اختیار سے بالاتر ہے اور اسکی وجہ سے خلق کی تمام طاقت اُسکے مقابلہ میں عاجز ہوتی ہے۔

ایسا نہیں کہ ہے تو وہ معمولی انسانوں کا ایسا کلام لیکن خداوند عالم کی قدرتی کارستانی سے کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ اُس کا جواب طیار کرے۔

اب سے ہم اپنے اردو داں ناظرین کے طبقہ کے سامنے کیا پیش کریں اُن نمونوں کے ساتھ جو اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے یقیناً انسان کے اوپر ایک حیرت انگیز اثر ڈالتے ہیں جو حقیقتہً روح اعجاز ہے اور واقعی بشری طاقتوں سے خارج ہے۔

ان نمونوں کا پیش کرنا اسلئے یہاں بے سود ہے کہ عربی آیات کے معانی کو خالص اردو داں طبقہ سمجھ نہیں سکے گا اور ترجمہ میں وہ مقصد حاصل نہیں کیونکہ اصل زبان کے تمام خصوصیات کو وہ حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

بیشک یہ مقام جن حضرات کو تفصیل سے دیکھنا ہو وہ ہماری عربی تفسیر "الفرقان فی تفسیر القرآن" میں ملاحظہ فرمائیں جو ماہ بماہ رسالۂ عربی "الرضوان" میں شایع ہوتی رہی ہے۔

یقیناً قرآن مجید نے ہر شعبہ میں وہ نقش قائم کئے ہیں جو سوائے نقاش قدرت کے کسی کے دست و قلم سے نکل ہی نہیں سکتے۔

اور اُن کو دیکھ کر اس خیال کی کمزوری بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ قرآن صرف لوگوں کی قوتیں سلب ہو جانے کی وجہ سے معجزہ ہوا نہیں۔ ہر گز نہیں۔ قرآن معجزہ ہے اور بذات خود معجزہ ہے۔ اپنے خصوصیات ذاتی اور فصاحت و بلاغت وغیرہ کیسا تھ معجزہ ہے اور خود اُس نے فصحاء کی گردنیں خم اور اُنکی ہمتیں پست کی ہیں۔ اور اُن سے اپنی بےمثالی کا کلمہ پڑھوایا ہے۔

اسی کے قریب کمزوری کے اعتبار سے یہ قول ہے کہ قرآن بحیثیت اپنی فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں اور نہ باعتبار اپنی جامعیت معانی و الفاظ کے معجزہ ہے بلکہ اُسکے معجزہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اور کامل اثر و نفوذ رکھنے والا قانون ہے اور اُس میں حسب اقتضائے زمانہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ضروری احکام بوجہ اتم موجود ہیں۔

یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس صورت میں قرآن مجید کے وہی آیات صحیح ہو سکتے ہیں جن میں قرآن مجید کے مجموعی طور پر مقابلہ کا سوال پیش کیا گیا ہے لیکن وہ آیات بالکل نظر انداز ہو جائینگے جن میں دس سوروں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے یا صرف ایک سورہ کا جواب طلب کیا گیا ہے۔

اس مطالبے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہات اعجاز میں کوئی جہت ایسی بھی ہے جو کل اور جزو دونوں میں مشترک ہے۔

اسکے علاوہ مذکورہ معیار کی بنا پر یہ جہت اعجاز اسوقت مکمل ہوتی اور مقابلہ کی دعوت اسوقت صحیح ہوسکتی تھی جب پورا قانون یعنی قرآن مجید نازل ہو لیتا جس کا سلسلہ رسول کی زندگی کے آخری حصّہ تک قائم رہا حالانکہ یہ مطالبات اور اعجاز قرآن کے دعاوی کا سلسلہ ابتدائے نزول

قرآن وادل زمانہ تبلیغ نبوت سے شروع ہو گیا تھا۔

پھر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ کسی قانون کا انسانی زندگی کے شعبوں کے لئے مناسب و مفید ہونا اور ضروری احکام کا بوجہ اتم موجود ہونا یہ ایسا امر نہیں ہے جس کا فیصلہ عام انسانی افراد کر سکیں۔ جو شخص بھی کوئی قانون بناتا ہے اُس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ بالکل مصالح وقت کے مناسب ہے، اور عام افراد بھی اسکی نسبت کسی نتیجہ پر متفق نہیں ہوتے ہیں کیونکہ انکے خیالات مصالح اجتماعیہ میں کسی نقطہ پر متحد ہوتے ہی نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ خیال بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ یقیناً اعجاز قرآن کا پہلو قرآن کے مافوق قدرت انسانی خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں بھی میں اسکو تنگ نظری اور قصور ذہن سمجھتا ہوں کہ انسان قرآن کی اعجازی حیثیت کو فصاحت و بلاغت میں منحصر کرے۔

بلکہ معجزہ وہ ہونا چاہیے جس کے لحاظ سے مخاطب طبقہ کے اوپر اتمام حجت ہو سکے یعنی وہ ایسی چیز ہو جسے وہ سمجھ سکیں کہ یہ حقیقتہً انسانی حدود اختیار سے بالاتر ہے یا نہیں۔

اُس خارق عادت کو ایسا ہونا چاہیئے کہ مخاطبین کا تمام حلقہ اسکے خارق عادت اور غیر معمولی درجہ پر فائز ہونے کا احساس کر سکے اور اس لئے ضرورت ہے کہ وہ اسی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو جس میں اُس زمانہ کے لوگ واقفیت و اطلاع اور کمال مہارت و اقتدار رکھتے ہیں۔

ایک ایسے شخص کے سامنے جو علم منطق سے بالکل ناواقف ہے اگر منطق کی نوعیت کا عظیم سے عظیم نمونہ پیش کیا جائے تو وہ اسے اپنی جہالت کے پردہ میں چھپا کر کہدیگا کہ میں تو اس شی سے واقف ہی نہیں۔ کیا جانوں کہ یہ کیا درجہ رکھتا ہے؟ اور اسی صورت سے علم طب سے نابلد شخص کے آگے کسی بڑے سے بڑے مرض کے علاج کا دعویٰ لیکن اگر اسی شعبہ میں کہ جس میں حقیقتہً واقفیت اور

کمال حاصل ہو کوئی غیر معمولی مظاہرہ پیش کیا جائے تو بیشک دیکھنے والا اپنے کمال مہارت و واقفیت کی بنا پر اسکے متعلق غور کر سکے گا کہ یہ چیز انسانی حدود و اختیار میں داخل ہے یا نہیں۔

اسی لیے سنت الٰہیہ اسباب پر جاری ہوئی ہے کہ جس شے کا جس زمانہ میں پورا دور دورہ ہو اور اہل زمانہ اس میں کمال کا دعویٰ رکھتے ہوں اُسی نوعیت کا معجزہ اتمام حجت کی صورت سے اُس زمانہ میں پیش کیا جائے۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ساحروں کا زور تھا، زمین مصر جادوگروں کے وجود سے معمور تھی۔ آپ کو معجزہ ایسا عطا ہوا جس نے ساحروں کے سحر کو باطل کیا اور اُن سے کلمہ پڑھوایا۔

حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں علم طب کا دور دورہ تھا۔ یونان کی حکمت شباب پر تھی اور وہاں کا فیض تمام ملک شام و فلسطین میں بھی پھیلا ہوا تھا۔

اسلئے مسیح کو اس نوعیت کا معجزہ عطا ہوا۔ وہ کور مادرزاد، کوڑھی اپاہج کو شفا دیتے اور مردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔

بیشک انسانی حدود کمال سے خارج بات تھی اسلئے واقف کار دنیا پر حجت تمام ہو گئی۔

ہمارے رسول کریم حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مبعوث ہوئے ہیں تو ملک عرب میں شعر و سخن کا زور تھا فصحا و بلغا کے ڈنکے بج رہے تھے اور یہی چیز تھی جسے عرب انسانی کمالات کا طرۂ افتخار سمجھتے تھے اور اُس میں کمال و اقتدار کا دعویٰ کرتے تھے۔

بیشک اُنکے سامنے اگر فلسفہ و منطق کے عمیق مسائل پیش کیے جاتے اور علمی معجزات سامنے لائے جاتے تو وہ کہنے کا حق رکھتے تھے کہ ہمکو اس چیز سے کیا واسطہ؟ ہم کیا جانیں کہ یہ عام طاقت بشری سے خارج ہے یا عام انسانی حدود و اختیار کے اندر؟ ہم اسکے ماہرین سے دریافت کریں، پوچھیں تو سمجھ سکتے ہیں؟ ہم اسکے متعلق کیا رائے قائم کر سکتے ہیں؟ اس طرح یقیناً حجت اُنکے مقابلہ پر ناتمام رہ سکتی تھی۔

اسلیے قرآن پیش کیا گیا اور وہ بحیثیت فصاحت و بلاغت اعجاز کے درجہ پر قرار دیا گیا تاکہ وہ لوگ سمجھ سکیں کہ جس میں انھیں کمال کا دعویٰ ہے اسکے مرتبہ و منزلت اور اسکی حیرتناک عظمت پر غور کر سکیں اور سمجھ لیں کہ وہ عام انسانی سطح سے بلند کلام ہے۔

بے شک انھوں نے دیکھا سمجھا اور غور کیا اور ان میں کے نقاد اور صاحب نظر افراد کو کافی غور و خوض کے بعد حکم لگانا پڑا کہ "ما ھذا کلام البشر" یہ کسی طرح انسانی کلام معلوم نہیں ہوتا ہے" اس طرح یقیناً قرآن مجید بحیثیت فصاحت و بلاغت اس وقت کے پورے طبقہ پر حجت تھا جن سے شروع شروع قرآن سے واسطہ پڑا تھا اور ان کیلئے اس کے معجزہ ہونے کے ساتھ انکے واسطہ سے دوسرے افراد پر بھی اس کا معجزہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ ہم جو عربی زبان کے خصوصیات اور اسکے مدارج و مراتب سے اس درجہ واقف نہیں ہیں جس درجہ وہ واقف تھے ہمارے لیے ان کا اعتراف، اقرار اور عجز ویسے ہی ثبوت اعجاز کی دلیل ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن چونکہ ہر زمانہ میں باقی رہنے والی نشانی اور رسولؐ کی نبوت کا دائم و برقرار رہنے والا ثبوت تھا اسلیے اسکے اعجاز کا پہلو صرف فصاحت و بلاغت میں منحصر نہیں ہے۔ میں اعجاز قرآن کے معیار کو اس سے بہت بلند سمجھتا ہوں میرا خیال ہے کہ انسانی افراد کے دماغ مختلف درجوں پر تقسیم ہوتے ہیں۔

بعض بلند اور بعض پست بعض ظاہر بیں اور بعض حقیقت شناس۔ بالکل اسی کی مطابقت سے قرآن مجید میں مختلف پہلو پائے جاتے ہیں بعض ظاہری اور بعض باطنی، بعض لفظی اور بعض معنوی جس کی بنا پر ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے موافق جہت اعجاز کی تلاش کر کے اسکے سامنے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔

زمانۂ رسول میں موجود رہنے والے فصاحت و بلاغت کو سب سے بڑا جوہر انسانیت سمجھنے والے اُنکے لیے وہ بحیثیت فصاحت و بلاغت معجزہ تھا۔ اور دوسرے اشخاص کے لیے باختلاف مذاق

باعتبار معارف و حقائق۔ باعتبار نکات و دقائق۔ باعتبار جامعیت و وسعت علوم۔ باعتبار متانت و بلند نظری اور اُس کے ساتھ باعتبار اپنے تعلیمات و ہدایات کے معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اِعجاز قرآن کے مختلف پہلو

(۱)

تاریخی حیثیت سے

حضرت رسولؐ کو ویسا فرض کرلو جیسا اُنکے دشمن کہتے ہیں کہ انھوں نے توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات افواہی حیثیت سے عام اشخاص افراد سے سُنے اور انھیں قرآن میں درج کر دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ کہ توریت و انجیل میں جس طرح واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اس کے ساتھ قرآن کے مندرجہ واقعات میں ایسے اضافے، اختلافات اور حواشی ہوتے جن میں واقعیت کے متانت و استحکام کا پتہ نہ ہوتا اور افواہی باتوں کی خرافت آمیز داستانوں کا اثر بہت نمایاں ہوتا۔

یعنی توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات میں اگر خلاف عقل خلاف فطرت، منافی مذہب باتیں نہ بھی تھیں تو اس میں پیدا ہو جاتیں اور اگر تھیں تو اسمیں بہت بڑھ جاتیں۔

لیکن جب ہم توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات اور پھر قرآن مجید میں انہی واقعات کے تذکرہ کو دیکھتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ بائبل کے واقعات میں اس درجہ دور از کار اور خرافت آمیز روایات کی بھرمار ہے کہ کسی طرح عقل و مذہب کے رو سے انھیں صحت کی سند کا دیا جانا ممکن نہیں ہے اور قرآن انہی واقعات کو تمام اُن خرافتوں اور دور از کار باتوں کو حذف کر کے ایسے صحیح، موافق فطرت انداز سے پیش کرتا ہے جسے عقل اصلیت کی سند دینے پر مجبور ہے۔

ملاحظہ ہو توریت کتاب پیدائش فصل ۳ میں حضرت آدم کے ممنوعہ درخت سے تناول فرمانے کا قصہ اور اُس میں جو کچھ دور از کار باتیں ہیں جن سے خدا کی طرف غلط بیانی، فریب کاری کا الزام عائد ہوتا ہے۔

اور فصل ۱۵ میں ابراہیم کا واقعہ کہ اُن کو خدا کے وعدہ میں شک ہوا شام میں زمین عطا کئے جانے کے متعلق اور فصل ۱۸-۱۹ میں ملائکہ کے آنے کا تذکرہ ابراہیم کے پاس اسحٰق کی ولادت کی خوشخبری لیکر اور کتاب خروج فصل ۳ میں خداوند عالم کا خطاب موسیٰ سے درخت کے ذریعے سے اور اُس کا وہ ضمیمہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی تعلیم موسیٰ کو شروع ہوئی تھی غلط بیانی کے سبق کے ساتھ اور فصل ۳۲ میں ہرون کا قصہ کہ اُنھوں نے گوسالہ تیار کرایا تھا جو خدائے بنی اسرائیل کی حیثیت سے قرار دیا جا اور اُنھوں نے اُسکے لئے قربانی اور عبادت کے طریقے مقرر کئے تھے۔

یہ تمام واقعات ہیں جنھیں ایک نظر توریت میں مطالعہ کرو اور دیکھو کہ اُن میں کیا کیا باتیں ایسی ہیں جو کسی طرح عقل و مذہب کی روشنی میں صحیح تسلیم کئے جانے کے قابل نہیں ہیں جن سے جلال الٰہی اور طہارت انبیاء پر دھبا آتا اور بہت سے اصول عقلیہ کو دھکا لگتا ہے اور پھر انہی واقعات کو قرآن مجید میں نکال کر مطالعہ کرو۔

معلوم ہو گا کہ قرآن میں تمام وہ زوائد محذوف ہیں جو مذکورہ بالا حیثیت سے ناقابل قبول تھے اور اُس میں تمام واقعات ایسے انداز سے بیان ہوئے ہیں جو کسی طرح شان حضرت الٰہی اور شان انبیاء و مرسلین کے خلاف نہیں ہیں۔

ملحقات توریت میں جو واقعات مذکور ہیں وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہیں حضرت ایوب کی طرف انتہائی جزع و فزع اور خدا سے شکوہ بلکہ اعتراض کی نسبت حضرت داؤد کی طرف زناکاری کی شرمناک نسبت حضرت سلیمان کی طرف کفر و شرک کے رواج دینے کی نسبت وغیرہ وغیرہ۔ ایسے واقعا

جو ایک لحاظ کے لئے صحیح تسلیم نہیں کئے جا سکتے ۔

توریت و لحقات میں تلاش کرنے پر اس سے زیادہ بہت باتیں موجود ملتی ہیں جیسے حضرت لوط کی شراب خواری اور نشہ شراب میں اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ زناکاری حضرت یعقوب کی خدا کے ساتھ کشتی حضرت یعقوب کی اپنے والد کے ساتھ فریب کاری۔ خدا کا مشورہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ کہ آخاب بادشاہ بنی اسرائیل کو گمراہ کیا جائے ۔

اور اسکے علاوہ بہت باتیں جن سے پرانے عہدنامہ کے صفحات پورے طور سے مملو نظر آتے ہیں انجیل مقدس جو حضرت مسیح کی تاریخ زندگی ہے اس میں بھی مختصر اوراق کے باوجود حضرت مسیح کی طرف ایسے واقعات کی نسبت موجود ہے جو کسی طرح انکی شان کے لائق نہیں ہے ۔

جیسے شراب خواری، غلط بیانی، ماں اور بھائیوں کے ساتھ بداخلاقی، نامحرموں کے ساتھ اخلاق سوز بیباکی ۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ قرآن مجید کے زمانہ میں اور اسکے قبل انبیاء و مرسلین کے تاریخی معلومات کے متعلق یہود و نصاریٰ کے تعلیمات کے سوا کوئی سرچشمہ نہیں تھا اور توریت و انجیل ہی کے مندرجات تھے جو احبار یہود و قسیسین نصاریٰ کے نوک زبان تھے ۔

بے شک رسول اسلام اگر ان تعلیمات کو یہود و نصاریٰ کے علمائے سے حاصل کرتے تو کم از کم وہ تمام خرافات جو اُن کی کتابوں میں مذکور ہیں آپ کی کتاب میں بعینہ درج ہوتے یا اگر آپ اُن کو صرف افواہی حیثیت سے جو عام لوگوں کی زبان پر واقعات تھے انکی بنا پر نقل کرتے جیسا کہ عام عیسائی مؤلفین ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو آپ کی اُمیت اور آپ کی قوم کی عام جہالت کی بنا پر توریت و انجیل سے بہت زیادہ خرافات اور دور از کار باتیں اس میں شریک ہو جاتیں ۔

جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے اُن واقعات کو جو بائبل میں واقعیت کی شان کے بالکل خلاف

تھے بالکل ذکر ہی نہیں کیا اور جن واقعات کو بائبل کے ذکر کیا ان کو اُن تمام خصوصیات و زوائد سے مجرّد کرکے جو اُس واقعہ کو واقعیت کے حدود سے الگ پھینکنے کے ذمہ دار تھے تو اس سے ہماری عقل صاف اس نتیجہ تک پہونچتی ہے کہ درحقیقت واقعات کی مسخ شدہ صورت جو توریت و انجیل میں رائج ہو گئی تھی اور خدائے آسمانی نے جو بندگان خدا کی ہدایت کے لئے رسولوں کا بھیجنے والا اور ان کی اصلاح کرنے والا ہے اُس نے اپنے خاتم المرسلین رسولؐ کو ان تمام صحیح واقعات کو اصلی صورت میں تعلیم دیا اور ان پر نازل فرمایا تاکہ توریت و انجیل میں پڑی ہوئی خرابیوں کی ہمیشہ کے لئے اصلاح ہو جائے اور گمراہ کن خیالات کا جو جلال الٰہی و شان انبیاء کے منافی واقعات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں قلع و قمع اور آئندہ کے لئے سد باب ہو جائے۔

(۴)

استدلالی حیثیت سے

قرآن کے محل نزول پر غور کرو اعرب کی جہالت کو دیکھو! کفر و شرک کی ترقی ضلالت و گمراہی کی فراوانی عقلوں کی کوتاہی نگاہوں کی ظاہر بینی۔ علوم و کمالات سے اجنبیت اور منطق و فلسفہ سے بالکل ناشناسی۔

اس سب کے بعد قرآن مجید کے معارف و حقائق کے آیات کی تلاوت کرو، خاص مسائل توحید، عدل و نبوت۔ اس کے مضبوط استدلالات، محکم براہین، لطیف اشارات کا مطالعہ کرو۔

قرآن کے آیات کے عمق کو دیکھو، باریک بین، دقیق فلسفی نگاہوں سے اس کے معانی کی گہرائی پر غور کرو معلوم ہوگا کہ وہ کس پایہ کس درجہ کا کلام ہے اور کیا عقل عادت، فطرت و طبیعت کے رو سے اس ماحول اس فطرت میں پیدا ہونے والے کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے۔؟

اسکے ساتھ ذرا بائبل کے اُن استدلالوں پر نظر ڈالو جو مسیح کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جن میں عجیب عجیب طریقوں سے مطلب ثابت کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر تعدد آلہہ اور شرکت تک کی تعلیم کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اسوقت حیرت کی انتہا نہیں رہیگی اسلئے کہ زمانۂ نزول قرآن میں ہر کچھ کے علمی و کلامی حیثیت سے اگر کوئی درجہ ہو سکتا تھا تو وہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا تھا، اور اُن کے علمی و عقلی سرمایہ کی وسعت صرف اتنی ہی تھی جو توریت و انجیل کے موجودہ نسخوں سے ظاہر ہے۔ اسکے بعد کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ قرآن یقیناً غیر معمولی طاقت کا کرشمہ تھا جو کسی انسان کی صرف انسانی قوت کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

(۳)

تشریعی حیثیت سے

یہ چیز بیشک وہ ہے جس کے متعلق میں لکھ چکا ہوں کہ عام انسانی افراد اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے لیکن بیشک بہت سے صحیح الذوق اور سلیم العقل افراد اور جنھوں نے دنیا کے قوانین و اصول انتظامی کا انتقادی نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اُن کا دماغ حقیقۃً قانونی ساخت کا واقع ہوا ہے کم از کم موازنہ کے ساتھ یہ ضرور سمجھ لے سکتے ہیں کہ دو قسم کی تعلیموں میں سے کون روح انتظامی کے ساتھ زیادہ موافق اور مفاد اجتماعی کے مطابق ہے۔ نیز کون قانون کہاں تک عملی ہے اور فطرت کے مطابق ہے۔ نیز اس امر کا سمجھ لینا تو ہر شخص کے لئے آسان ہوگا کہ کس قانون میں جامعیت پائی جاتی ہے اور شخصی و نوعی۔ انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے احکام موجود ہیں۔

بے شک قرآن مجید کے نزول کے زمانہ میں ایک شریعت موجود تھی شریعت موسویہ جو یہود کے لئے قولی و عملی دونوں حیثیتوں سے اور نصاریٰ کے لئے عملی نہ سہی تو قولی و اعتقادی حیثیتوں سے قابل

قبول اور لائق تعظیم تھی اور حضرت عیسیٰ کا بھی ایک آئین ضرور تھا جو اگرچہ اس اعلان کی بنا پر کہ زمین و آسمان ٹل جائیں موسیٰ کی شریعت کا ایک شوشہ تبدیل نہیں ہو سکتا شریعت موسویہ کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں سمجھا جانا چاہیئے لیکن پھر بھی عملی طور سے وہ بالکل شریعت موسویہ کے خلاف ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اسلئے اُسے شریعت عیسویہ تسلیم کرنا ضروری ہے۔

اسکے علاوہ ایران میں زردشتی مذہب کے تعلیمات تھے اور زردشت کی ایک مستقل شریعت تھی جو ایک زندہ حیثیت رکھتی تھی اور ہزاروں آدمیوں کو اپنا پابند بنائے ہوئے تھی۔

بیشک مذہب اگر اپنی اساسی حیثیت سے صحیح ہو تو اُسکی شریعت کے اجزا اصلی تو یقیناً وہی ہو سکتے ہیں جو خدائے واحد کے نازل کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعد کی تراش خراشوں نے اُن میں تبدیلیاں کردی ہوں اور طرح طرح سے اُن کو مسخ کر دیا ہو۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ شریعت موسویہ ایک صحیح اصل پر مبنی تھی اور مذہب عیسوی بھی ایک صحیح بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔

زردشت کے متعلق بھی اگرچہ قرآن نے نبوت کی گواہی نہیں دی ہے لہذا ہم قطعی حیثیت سے اس نبوت کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتے لیکن قرائن و منقولات کی بنا پر بہت سے لوگ اُن کو نبی تسلیم کرتے ہیں اور ہم یقینی حیثیت سے اس کو غلط کہنے کی بھی کوئی بنیاد نہیں پاتے ہیں۔

اس صورت میں اگر ان شریعتوں میں کچھ ایسے احکام پائے جاتے ہوں جو قرآنی احکام کے ساتھ متحد ہوں یعنی ویسے ہی احکام قرآن میں بھی موجود ہوں جو وہاں موجود ہیں تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن میں اُن مشترکہ احکام سے بہت زیادہ خصوصی تعلیمات اور بہت سے ایسے شعبوں کے متعلق احکام و قوانین کیسے ہیں جن کا مذکورہ بالا شریعتوں میں پتہ بھی نہیں تھا اور ان شعبہ ہائے زندگی کے متعلق اشارہ بھی موجود نہ تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شریعت کو حقیقۃً اُسی خدا نے نازل کیا ہے جس نے اُن شریعتوں کو

اُنکے محدود زمانہ کے لحاظ سے محدود احکام پر مشتمل نازل کیا تھا، اُس نے اس شریعت کو زمانہ کی آخری عمر تک باقی رکھنے کے لئے تمام انسانی زندگی کے شعبوں کے متعلق احکام و تعلیمات پر مشتمل بنا کر نازل کیا ہے اور وہ کسی انسانی ساخت و پرداخت کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۴)

اخلاقی حیثیت سے

یقیناً اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ علم اور تربیت کا بڑا اثر انسان کے اخلاق پر پڑتا ہے اور جہالت اور علوم صحیحہ سے ناواقفیت بڑی سے بڑی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے۔

اور اخلاق کی جان جو کچھ بھی ہے وہ ملکات نفسیہ اور قوائے طبعیہ میں اعتدال کے نقطہ کی پابندی اور افراط سے کنارہ کشی ہے۔

بڑے سے بڑے معلم کے تعلیمات اُسوقت بے قیمت ہیں جبکہ یا تو تفریط کی وجہ سے اس حد تک کمزور ہوں کہ ان سے امن و انتظام اور شائستگی و تہذیب کا مقصد حاصل ہی نہ ہوتا ہو اور یا افراط کے لحاظ سے اس درجہ زیادہ ہوں کہ وہ انسانی فطرت کی بنا پر کبھی ممنون عمل بن ہی نہ سکیں اور اُنکی پابندی ممکن ہی نہ ہو۔

توریت اور انجیل کے اخلاقی تعلیمات کی نوعیت انہی دونوں راستوں میں تقسیم ہے۔ اول الذکر افراط اور ثانی الذکر تفریط کے لحاظ سے نقطۂ اعتدال سے علیحدہ ہیں۔

بے شک ان میں حد وسط کا درجہ اگر حاصل ہے تو وہ قرآن مجید کو ہے۔ قرآن کے تعلیمات افراط و تفریط دونوں باتوں سے علیحدہ بالکل اعتدالی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلئے ہر شخص کے لئے ممکن العمل اور تہذیب و شائستگی کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔

یہ خصوصیت بھی قرآن مجید کی وہ ہے جو اس کو تمام کتب ادیان میں ممتاز درجہ عطا کرتی ہے اور اس بنا پر جب عرب کی جہالت اور رسول عربی کے احوال وغیرہ کو پیش نظر رکھکر دیکھا جائے تو اسکے الہامی و آسمانی ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یقیناً خداوند عالم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

موازنہ بائبل و قرآن

ہم نے مذکورۂ بالا چند عناوین کے تحت میں ایک اجمالی خاکہ اس موازنہ کا قائم کر دیا ہے جو "بائبل اور قرآن" میں صحیح طریقہ سے کیا جا سکتا ہے اور ہمارے گذشتہ بیانات کے اشاروں سے ایک مبسوط کتاب "موازنہ بائبل و قرآن" کے موضوع پر مدون ہو جانا کوئی دشوار نہیں ہے۔

یہ عیسائی مبلغین کی انتہائی جرأت و دیدہ دلیری ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی تمام کمزوریوں کے باوجود اسکی جرأت کرتے ہیں کہ وہ اُن کو قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کریں اور گذشتہ قریبی زمانہ میں لاہور سے ایک کتاب بھی شایع ہوئی "موازنہ بائبل و قرآن" جس میں اصول، فروع، معارف، اخلاق، عبادات کے مختلف موضوعات قائم کر کے ایک کالم میں قرآن مجید کے آیات اور دوسرے میں انجیل کے عبارات درج کئے گئے اور سمجھا خود انجیل کا تفوق قرآن کے مقابلہ میں ثابت کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔

میں نے اس تفسیر کے ذیل میں خاکہ پورا لکھدیا ہے جس کی بنا پر ہر شعبہ میں قرآن کا موازنہ بائبل کے ساتھ صحیح طریق پر کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ تفصیل دنیا اس سلسلہ میں کتاب کی شان تصنیف کے خلاف ہے اور اُسکے تمہیدی مقدمات میں درج ہونے کے لائق نہیں ہے۔

قرآن کے تازہ ترین معجزات

طبیعیات و فلکیات میں دنیا برابر ترقی کرتی جاتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے دروازے حکمت و فلسفہ کے جو سابق زمانہ میں بند تھے وہ اب کھلتے چلے جا رہے ہیں اور سیکڑوں رموز جو ابتک راز سربستہ کی صورت سے چلے آ رہے تھے وہ اب منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

بہت سے قدیم نظریے تھے جن کا بطلان اب بدیہی صورت اختیار کر چکا ہے اور بہت سی باتیں آلات جدیدہ اور خوردبین و دوربین ذرایع سے محسوسات میں داخل ہو گئی ہیں۔ اگرچہ جو نتیجے نکالے جا رہے ہیں وہ اکثر ذہنی و ظنی بھی ہوتی ہیں اور بسا اوقات اُن میں تخیل و قیاس کی بھی آمیزش ہے اور بہت سے رموز ابتک منکشف بھی نہیں ہو سکے ہیں اور اُمید ہے کہ آئندہ منکشف ہوں اسلئے کہ ترقی کی انتہا نہیں ہو گئی ہے اور جتنا علم انسان کو حاصل ہوا ہے وہ بہت کم ہے اُس حقیقت کے مقابلہ میں جو عالم کائنات کے اندر مضمر ہے۔

اس لحاظ سے میں اس بات سے کبھی متفق نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ کے لئے مذہبی آیات و روایات کو جدید تحقیقات پر منطبق ہی کیا جائے خواہ وہ جدید تحقیقات کوئی ثابت اور یقینی حیثیت نہ رکھتی ہو اور خواہ اس منطبق کرنے میں توڑ مروڑ اور ساخت و ساز کی ضرورت بھی درپیش ہو۔

ایسی سعی میرے خیال میں مفید اور صحیح نہیں سمجھی جا سکتی اسلئے کہ انسانی فلسفہ روز تبدیل ہونے والی اور متغیر چیز ہے اور مذہب ایک ثابت برقرار اور لازوال حقیقت اور یہ ظاہر ہے کہ ثابت، لازوال چیز متغیر اور قابل تبدیل شے کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

آج آپ نے فلسفہ کی موجودہ بنیادوں کو صحیح سمجھکر مذہبی روایات کو اسپر منطبق کیا، کل فلسفہ بدل گیا وہ نظریے غلط ثابت ہو گئے آپ تو اپنے مذہب کے نصوص کو اُس فلسفہ کے قالب میں ڈھال

چکے تھے، اسکے معنی یہ ہوئے کہ آپکا مذہب غلط ثابت ہوا۔ یہ کس لئے ہوا؟ اپنے ہاتھوں سے حالانکہ مذہب درحقیقت اس غلط خیال کی حمایت سے خاموش تھا اور ہم نے اپنے خود ساختہ تاویلات سے اسکو موجودہ لباس میں ڈھال دیا تھا۔

اسلئے واقعاً اگر مذہبی تصریحات کسی موجودہ تحقیقات فلسفی کے خلاف ہوں تو ہمیں اس تحقیقات کی صحت میں شک کرنا چاہیئے اور اُسکے صحیح انکشاف کو فلسفہ کے زیادہ بلند درجہ تک ترقی کرنے کیساتھ مستقبل کے حوالہ کرنا چاہیئے۔

لیکن پھر بھی اس میں شبہ نہیں ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنھیں فلسفہ صحیح نقطۂ ترقی تک پہونچ گیا ہے اور واقعی حقیقت کا انکشاف کر لیا ہے اُن میں سے بہت باتوں کا پتہ قرآن اور احادیث کے الفاظ میں بیجا اور دور از کار تاویلات کے بغیر نہایت صاف اور واضح طریقہ سے موجود ہے اور یہ قرآن مجید کا بڑا اعجاز ہے کہ وہ چیزیں جو سیکڑوں برس تک دنیا سے پردۂ خفا میں رہیں اور کسی کی نگاہ اُن تک نہیں پہونچی تھی اور ہزاروں قسم کے جدید آلات رصد سے اور مختلف قسم کی دوربینوں سے اُن کا پتہ چلایا گیا ہے نبی امی کے لائے ہوئے قرآن میں تیرہ سو برس قبل مذکور تھیں۔

بہت سی آیتیں قرآن کی ایسی ہیں جنکو جب ہیئت کے قدیمی مسلمات کی بنا پر جانچا گیا تو کسی طرح اُنکے معنی ظاہری طور سے سمجھ میں نہ آئے مفسرین جو انھی علوم پر ایمان لائے تھے اُنھوں نے ان آیات میں تاویلات سے کام لیا اور انکے معنی کو حقیقت سے ہٹا دیا لیکن اب جبوقت کہ ہیئت نے پلٹا کھایا ہے اور علم کے دور میں انقلاب ہوا ہے تو وہ آیات اپنے ظاہری الفاظ کے ساتھ اسی حقیقت کا پتہ دے رہی ہیں جس کا اب انکشاف ہو سکا ہے اور اسکے پہلے نہیں تھا۔

یہ ایک مبسوط اور طویل الذکر عنوان ہے جس کے تشریح و بسط کے لئے مستقل کتاب درکار ہے۔

فیلسوف العصر علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی دام ظلہ نے جو عراق کے ایک بڑے محقق،

متتبع اور جامع علوم و فنون بزرگ ہیں۔ ایک کتاب "الہیئۃ والاسلام" تحریر فرمائی ہے جو عراق میں شایع ہو چکی ہے اور اُس کا ترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب علی اللہ مقامہ نے "البدر التمام" کے نام سے شایع کیا ہے اور غالباً دفتر "البرہان" لودھیانہ سے دستیاب ہوتا ہے۔

اس میں اگرچہ بہت سے تاویلات پہلی قسم میں داخل ہیں جن کی نوعیت سے میں اختلاف کا اظہار کر چکا ہوں لیکن بہت سے نمونے دوسری قسم کے بھی موجود ہیں اور بہت سے مسائل ہیں جو واقعی قرآن و احادیث کے تصریحات سے پورے طور پر ثابت ہیں جن میں کسی تاویل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

مصر کے مشہور عالم و محقق شیخ طنطاوی جوہری کی کتاب "القرآن والعلوم العصریۃ" اور شیخ عبد الحلیم علی بدیر ازہری کی کتاب "القرآن والعلوم العصریۃ او معجزات القرآن العشرین" بھی اس سلسلہ میں اچھی کتابیں ہیں۔

عم معظم مولانا سید احمد صاحب قبلہ علامۂ ہندی کی کتاب "فلسفۃ الاسلام" بھی اس قسم کے بہت ذخیرہ پر مشتمل ہے۔ اور اُمید ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل شایع ہو تو انتہائی مفید اور پر از معلومات ثابت ہو۔

قرآن کے امتیازی خصوصیات

بحیثیت استناد و اعتبار

ہم نے اپنی کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" میں بہت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ جتنی کتابیں اسوقت الہامی سمجھی جاتی ہیں اور وحی آسمانی کی طرف منسوب کیجاتی ہیں اُنکے متعلق اگر خود اُنکے ماننے والوں کے محررات کی روشنی میں نظر کی جائے تو اُن کی تاریخ زندگی ایسے حوادث و انقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے جن کی بنا پر کسی طرح وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے کسی حصہ کسی جزو کا وجود بھی دنیا میں باقی ہے اور جسے اب اُسکے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ

ہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں اس میں کوئی آدھا چوتھائی جملہ بھی اس حقیقی وحی سے عیناً مطابق ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی۔ ہم نے "توریت کی سرگذشت" لکھی اور اس میں ثابت کیا کہ اُسکی تاریخ عجیب و حسرت فرسا مصائب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک اسکی زندگی کو فنا کر دینے کی ضامن ہے۔

(پہلے) یہ کہ اُسکے حامل اور امانت دار جو بنی اسرائیل تھے وہ بہت مرتبہ بالکل مذہب موسوی سے پلٹ گئے اور بت پرستی کرنے لگے، اُنھوں نے بیت المقدس کی بنیادوں کو ہلا دیا اور اُسکی دیواروں کو گرادیا، اُن میں نجاستوں کا اتنا ڈھیر لگایا کہ برسوں صاف کرنیکی ضرورت پڑی۔

ہم نے بائبل کے حوالوں سے ان تمام انقلابات کی مکمل تاریخ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ بھلا ایک قوم جس نے مذہبی حیثیت سے اتنے پلٹے کھائے ہوں اور اتنی مرتبہ ارتداد کو اختیار کر کے کفر و شرک اور بت پرستی کے راستہ پر لگی ہو اُس کے متعلق کہاں یہ اطمینان ہو سکتا ہے کہ اُس نے کتاب الٰہی اور توریت حقیقی کو اُس کی اصلی حالت پر رہنے دیا ہو گا یا اُس کی حفاظت میں کوئی اہتمام کیا ہو گا بلکہ اُسکی کفر پروری اور باطل پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس میں اپنی خواہش کے مطابق طرح طرح کے تصرفات کر کے اسکو اپنے مذاق کے موافق بنا لے اور پھر جبکہ ہمکو موجودہ توریت کے اندر جا بجا شرک و تعدد آلہہ کے عقیدہ کی جھلک بھی نظر آتی ہے جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ توریت میں اکثر جگہ ایل یعنی "خدا" کی لفظ کے بجائے "الٰہ یعنی" "خدایان" کی لفظ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مذہبی اُفتاد طبع کا اثر توریت کے اوپر پڑے بغیر نہیں رہا تھا اور اُن کے شرک و صنم پرستی کے مسلسل رجحانات نے توریت کے اندر رنگ آمیزیاں ضرور کی تھیں۔

(دوسرے) یہ کہ توریت کا اصلی نسخہ جو موسیٰ نے خود لکھکر اولاد لاوی کے سپرد کیا تھا اُسکے متعلق ہدایت یہ تھی کہ وہ تابوت عہد رب کے پہلو میں بیت المقدس کے اندر رکھا رہے لیکن اسکے بعد تابوت عہد رب میں جو انقلابات ہوئے اُن میں اس نسخہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہم نے ان انقلابات کا

پتہ بائبل کے پورے حوالوں کے ساتھ درج کیا تھا اور پھر ہم نے لکھا تھا کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ نسخہ تابوت کے پاس بیت المقدس کی محراب کے اندر موجود تھا تو کیا وہ اُن ہولناک تباہیوں میں باقی رہ سکتا ہے جو بیت المقدس کی عمارت میں رونما ہوئے جن میں کئی مرتبہ بیت المقدس کے تمام خزانے اور وہاں کی ہر چیز بلا استثناء لوٹ لی گئی تھی اور ایک مرتبہ بیت المقدس کو نجاست سے اس طرح پاٹ دیا گیا تھا کہ آٹھ دن اس کی صفائی میں صرف ہوئے۔ درایت کے اصول پر ان واقعات کو دیکھنے سے یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ توریت کا اصلی نسخہ باقی نہ تھا اور وہ انقلابات و حوادث کی نذر ہو گیا تھا۔

(تیسرے) یہ کہ توریت کے اصلی نسخہ کے سوا کسی دوسرے نسخہ کا وجود بھی ابتدا میں پایا نہیں جاتا تھا اور اُس کی اشاعت بالکل محدود تھی بلکہ بالکل نہ تھی، اس لحاظ سے اگر اصلی نسخہ مفقود ہو گیا تو اُس کا قائم مقام ملنا بھی ممکن نہ تھا۔

اور اس لئے اُس کے بجائے کوئی دوسری کتاب ایجاد کر لی جاتی یا اسی میں کمی زیادتی کر کے تراش خراش کی جاتی تو عام طور پر اسکی شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اُس وقت کہ جب یوشیا بادشاہ کے زمانہ میں حلقیا کاہن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مجھے سفر الشریعہ (توریت) دستیاب ہوا اور وہ سفر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُسے ایسا عجیب سمجھا گیا کہ بادشاہ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور کاہنوں کو بلا کر ہدایت کی گئی کہ وہ خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں اسلئے کہ ان ہدایات پر جو اس دستیاب شدہ سفر میں مندرج ہیں آج تک ہم نے اور ہمارے آباؤ اجداد نے عمل نہیں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے پہلے، توریت کا کوئی نسخہ موسائیوں کے ہاتھ میں موجود نہ تھا۔

پھر جبکہ توریت کا نسخہ انکے پاس تھا ہی نہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ حلقیا نے

جو کتاب تورات لکھ دی وہ حقیقۃً توریت ہی تھی۔

نیز اُس موقع پر جب بابل سے نجات پاکر آئے ہیں۔ تمام جماعت نے عزرا کاتب سے خواہش کی کہ وہ سفر توریت لاکر انھیں پڑھ کر سنائے۔ عزرا نے صبح سے دوپہر تک وہ کتاب سنائی، اُس کے مضامین کو سنکر اُنکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دوسرے دن تمام بڑے بڑے بادریوں نے عزرا کے پاس جمع ہوکر کہا کہ وہ اُن کو توریت کے معانی سمجھائے۔ اس میں بہت سے احکام ایسے تھے جن پر بالکل اب تک عمل نہیں ہوا تھا اور اب اُن پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔

اس سے بھی ثابت ہے کہ توریت کا وجود عزرا سے مخصوص تھا اور کاہنوں کے پاس تک اسکا پتہ نہیں تھا پھر جب توریت کا وجود اتنی محدود حیثیت رکھتا تھا تو اُس کا اصلی حالت پر باقی رہنا صرف اسی ایک شخص کے ذاتی رحم وکرم کا پابند ہے اور کوئی ذریعہ اسکی حفاظت کا نہیں ہے۔

(چوتھے) یہ کہ خود کتاب مقدس میں متعدد جگہ اسکی تصریح موجود ہے کہ توریت میں تحریف ہوئی ہے اور اس درجہ کہ وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہو گئی ہے اور اس تحریف نے احکام شرعیہ کو بھی اُن کی اصلی حالت پر باقی نہیں رہنے دیا ہے اس کے پورے حوالے ہم نے اصل کتاب میں درج کئے ہیں۔

ان تمام مصائب کے باوجود یہ کہاں یقین کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ توریت یا اُس کا کوئی جزو بالکل وہی ہے جو موسیٰ کے اوپر نازل ہوا تھا۔ اور پھر جب کہ اُس میں آخر میں موسیٰ کی وفات کا قصہ اور بنی اسرائیل کی اُن پر گریہ وزاری کا تذکرہ اور یہ کہ موسیٰ کے بعد پھر کوئی ویسا نبی اسرائیل کو نصیب نہیں ہوا"

یہ تمام واقعات بھی مذکور ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ موسیٰ کی وفات کے بہت عرصے کے بعد تصنیف ہوئی ہے۔
انجیل اور اُس کی موجودہ حیثیت، کے متعلق میں نے تحریر کیا کہ انجیل کے متعلق

بھی گوناگون وجوہ پر نظر کرنے سے اس امر کا کوئی اطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ اناجیل میں وحی الٰہی کا کوئی ذرا سا بھی حصہ ہے۔

(پہلے) یہ کہ عیسیٰ کو جو انجیل ملی تھی وہ تو ایک ہی تھی۔ اس میں ایک سے زیادہ کی تعداد کا پتہ نہیں تھا لیکن وہ کتابیں جو اس نام سے تصنیف ہوگئیں انکی تعداد سو اور اس سے زیادہ تک پہونچ گئی اور پھر مسیحی تاریخ کے چار سو سال گذرنے کے بعد ان چار انجیلوں پر اتفاق ہوا جو اسوقت موجود ہیں آخر اسوقت میں ہم کیسے سمجھیں کہ سچی انجیل انہی چار میں منحصر ہے اور پھر جبکہ ان چاروں انجیلوں میں آپس میں کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔

ان میں سے کس پر ایمان لانا ضروری سمجھا جائے اور کس کو معتبر؟ پھر اسکے کیا معنی کہ یہ چاروں صحیح ہیں اور چاروں الہامی حیثیت رکھتی ہیں۔

(دوسرے) یہ کہ مسیحی مذہب کی نشو و نما ناصرہ میں چند ماہی گیروں کے گروہ میں ہوئی تھی جنھیں علم و مذہب سے کوئی بہرہ نہ تھا اور نہ یہودیوں کے غلبہ کی وجہ سے اُن کو آزادی حاصل تھی۔ مسیح کے واقعات و حالات خود مسیح کے زمانہ میں قلمبند نہیں ہوئے اور نہ مسیح ہی کو کبھی خیال آیا کہ وہ اُن واقعات کو قلمبند کرا لیں نہ وہ انجیل جو عیسیٰ پر نازل ہوئی تھی اُسکی نقل کسی نے محفوظ کی اور نہ اسکو پورے طور پر حفظ اور ازبر یاد کیا مسیح کے اُٹھائے جانیکے بعد جنگ و جدال کا بازار گرم ہو گیا اسلئے مذہبی بنیادوں کے مضبوط کرنیکی فکر نہو سکی۔

چند فقرے انجیل کے بعض اشخاص کو کہیں کہیں پر سے یاد تھے اُن میں بھی امتداد زمانہ نے تغیر و تبدل پیدا کر دیا جس کے بعد ہر ایک شخص نے ایک انجیل تیار کرنا شروع کر دی جسکی صحت کی بنیاد صرف اس شخص کے قول پر تھی جس نے اُس کو بنایا ہے۔

(تیسرے) موجودہ اناجیل میں سب سے زیادہ معتبر انجیل متی سمجھی جا سکتی ہے اسلئے کہ وہ

متی شاگردِ حضرت مسیح کی لکھی ہوئی اور تمام انجیلوں سے پہلے تصنیف ہوئی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس انجیل کا اصلی نسخہ جو عبرانی زبان میں تھا اب دنیا میں باقی نہیں ہے وہ شروع ہی میں مفقود ہو گیا تھا اسکے مفقود ہونیکے بعد یہ اُس کا ترجمہ نکلا ہے جو یونانی زبان میں ہے اور جو اب تمام دوسری زبانوں کے تراجم کی اصل ہے لیکن اس ترجمے کے مترجم کا کوئی پتہ نہیں ہے کہ وہ کون تھا اور کس مذہب و ملت کا شخص اور اُسکا مقصد اس ترجمہ سے کیا ہے۔

انجیل متی کے علاوہ جو انجیلیں ہیں اُنکے مصنفین نے حضرت عیسیٰ کی صورت تک نہیں دیکھی، انکی شخصیت بھی کوئی معین حیثیت نہیں رکھتی لوقا کے متعلق ابتک تحقیق نہیں ہوا کہ وہ تھا کون شخص یوحنا کی انجیل کے متعلق اکثر علمائے مسیحین کا یہ خیال ہے کہ وہ مدرسۂ اسکندریہ کے ایک طالبعلم کا نتیجہ قلم ہے۔

(چوتھے) موجودہ اناجیل سے خود یہ ظاہر ہے کہ اُن میں سے کوئی عیسیٰ پر نازل شدہ کتاب انجیل نہیں ہے۔ وہ ایک تاریخ زندگی ہے جس کو مختلف اشخاص نے اپنی اپنی یادداشت و نقطۂ نظر کے مطابق تحریر کیا ہے۔ اُن میں اول یا آخر میں صراحت کے ساتھ لکھدیا گیا ہے کہ یہ واقعات ہم کو معتبر راویوں سے معلوم ہوئے یا ان کو عیسیٰ کے ایک شاگرد نے اپنے آنکھ سے دیکھا اور اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔ اس صورت حال کے بعد کون عقلمند ہوگا جو ان اناجیل کو الہامی ماننے پر تیار ہوگا۔

"وید مقدس کی اصلیت" کے بارے میں ہم نے بہت بسط و تشریح کیساتھ تحریر کیا ہے کہ ان ویدوں کی اصلیت اتنے پردوں میں مخفی ہے جن کا اُٹھانا کسی طرح اُن کے عقیدت مندوں سے ممکن نہیں ہے۔

(پہلے) یہ کہ "وید کس پر نازل ہوئے"؟ یہی امر بہت مبہم ہے اور مسلمہ طور سے طے نہیں پایا ہے ہم نے اس سلسلہ میں تمام وہ اختلافات تحریر کردئے ہیں جو اسکے بارے میں پائے جاتے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ بھلا ایسی کتاب کا کیا وزن ہو سکتا ہے جس کے متعلق خود اسکے ماننے والے ابتک طے نہ کر سکے ہوں کہ وہ نازل کس پر ہوئی تھی؟

(دوسرے) یہ کہ وید خدائی کلام ہے یا مخلوق کا ساختہ! یہ بھی ابتک ہندؤوں اور آریوں میں مسلمہ حیثیت سے طے نہیں پایا ہے؟ اسکے شواہد ہم نے تفصیل سے تحریر کیئے ہیں۔

(تیسرے) یہ کہ وہ افراد جن کی طرف ان ویدوں کے تصنیف کی نسبت ہے بہت اچھے صاحب اخلاق و اوصاف لوگ نہیں تھے بلکہ اُن کی نسبت اسکے خلاف اوصاف کا تذکرہ ہوا ہے جس سے انکی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

(چوتھے) یہ کہ وید جس صورت سے ابتدا میں ظاہر ہوا تھا وہ اُس صورت پر باقی بھی نہیں رہا اور اُس میں حسب دلخواہ تصرفات ہوتے رہے۔

(پانچویں) وید کسی غیر محدود زمانہ کے تعلیمات پر مشتمل تھا؟ ایسا بھی نہیں بلکہ اکثر ہندؤوں کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وید کے تعلیمات اب بالکل معطل بے کار اور بے اثر ہیں۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ وید حقیقۃً خدا کا کلام اور موجودہ زمانہ میں واجب العمل اور لازم الاتباع ہے۔

مذکورہ بالا تمام کتب کے برخلاف جب ہم اسلامی کتاب "قرآن کریم" پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے اور اُسکی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ملتی ہے جو اُسکے استناد و اعتبار کے ضامن ہیں۔

پہلی خصوصیت | امت اسلامیہ کہ جو قرآن مجید کی امانت دار اور اسکی حفاظت و نگہداشت کی براہ راست ضامن سمجھی جا سکتی ہے وہ حقیقی معنی میں باختلاف زمانہ اُسکے صحیح تعلیمات سے کتنی ہی دور ہو گئی ہو اور اُسکی بنا پر اہل سعی اسپر ارتداد کا حکم لگا دیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اُس نے ظاہر بظاہر قرآن کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا ہو اور اسلام کے اصولی اساسی کو چھوڑ کر کفر و شرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دنیائے وجود میں قدم رکھا اُنکی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی

اور وہ برابر اسلام کو اپنا نشان قومیت اور قرآن کو اپنا طرۂ دستار بنائے ہوئے ہے۔

ساڑھے تیرہ سو صدی میں تاریخ کسی ایسے وقت کا پتہ نہیں دے سکتی جب میں مسلمانوں نے قرآن مجید سے روگردانی اور اسلام سے کنارہ کشی کی ہو۔

دوسری خصوصیت قرآن مجید کے متعلق ابتدا ہی سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ اُس کا نسخہ کسی خاص شخص یا جماعت کے پاس محدود رہے بلکہ عام طور سے مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کیا کہ وہ اُسے لکھیں نقل کریں اور از بر یاد کریں۔

تیسری خصوصیت قرآن اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف اتنا نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن بس اسی کو سمجھتا ہے جو مخصوص الفاظ پر مشتمل ہے۔ اُنکے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ نمازمیں اُسکا پڑھنا لازم اور دوسرے اوقات میں اُسکی تلاوت اجر و ثواب کی باعث قرار دی گئی ہے۔ تراجم کو قرآنی احکام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ قرآن سمجھے جاسکتے ہیں۔

یہ بات توریت و انجیل میں نہیں ہے۔ انجیل متی کا تو اصلی زبان والا نسخہ ہی دنیا میں موجود نہیں اور دوسرے اناجیل و کتب عہدین اگرچہ بظاہر اصلی زبانوں میں موجود ہیں لیکن خود اُن کے ماننے والے اُنکے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے ہر سال ہزاروں زبانوں میں انکے ترجمے شایع ہوتے ہیں اور عیسائی مبلغین ہر شخص کو جو عیسائی جماعت میں داخل ہو اسی زبان کی بائبل دیتے ہیں جو اس شخص سے تعلق رکھتی ہے لیکن اصلی نسخہ توریت اور انجیل کا اسکو عام طور پر مسیحی افراد پڑھنا تو درکنار صورت تک نہیں دیکھتے۔

چوتھی خصوصیت قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالتمآبؐ بوقت ورود ہی قلمبند کرا لیا کرتے تھے اور پھر اُن متفرق آیات کو بعد حضرتؐ کی وفات کے کتابی صورت میں جمع کیا ایسے اشخاص نے جو خود حضرتؐ کے صحابہ میں داخل اور حضرتؐ سے براہ راست آیات قرآن کی سماعت کرنیوالے

تھے اور اس طرح وہ کمزوری جو اناجیل میں اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ اُنکے لکھنے والوں میں سے بیشتر نے عیسیٰ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی قرآن میں پائی نہیں جاتی۔

پانچویں خصوصیت قرآن مجید کی ابتدا، انتہا، اسلوب اور طریقۂ بیان سب اُس کے کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا منادی ہے۔

وہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ زندگی نہیں ہے جس میں ولادت سے لیکر وفات تک کے تفصیلی حالات کا تذکرہ ہو اور نہ اُسمیں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو رسول کی وفات یا اُسکے بعد کے حالات سے تعلق رکھتے ہوں اور نہ اُس میں غیر خدا کی زبان سے اس قسم کے فقرات ہیں کہ اسکو میں نے مستند راویوں کے کلام سے اخذ کر کے لکھا ہے یا یہ وہ واقعات ہیں جنھیں کسی صحابی نے چشم دید مشاہدہ کی بنا پر نقل کیا ہے جیسا کہ عیسائیوں کی انجیل میں پایا جاتا ہے بلکہ اُس میں ہر جملہ اور ہر فقرہ اس خصوصیت کا مظہر ہے کہ وہ خدا کی جانب سے نازل شدہ ہے اور اس میں ہر موقع پر مقتضٰی حال کے واقعات میں توازن کو ملحوظ رکھکر اپنے زمانۂ نزول کی تعیین میں واہمہ پردازیوں کا سد باب کیا ہے۔

چھٹی خصوصیت قرآن کی اصلیت وحقیقت کے متعلق مسلمانوں میں باوجود آپس کے ہزارہا اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے قرآن مجید کو خداوند عالم کا نازل کردہ تسلیم کرتے ہیں اور اسمیں کسی انسان کی ساخت وپرداخت کا دخل نہیں سمجھتے ہیں۔

ساتویں خصوصیت قرآن کے متعلق اُسکے ماننے والے اس نقطہ پر متفق ہیں کہ وہ دنیا کے آخری دور تک رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے اور اسکے تعلیمات کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہیں وہ بقاء ودوام کے مالک ہیں اور ہر دور زمانہ کے لئے مساوی طور پر فائدہ مند اور صلاح وفلاح کے ضامن ہیں۔

آٹھویں خصوصیت قرآن جب سے مدون صورت کے اندر مسلمانوں میں منتشر ہوا اُسکے ہر لفظ

اور جملہ کی جانچ پرتال ہوتی رہی اور تمام مسلمان اسکی کتابت، تفسیر، تشریح، قرأت کی طرف متوجہ رہے۔ انھوں نے اُسکے ذرا ذرا سے خصوصیات حتیٰ اعراب و طریق ادا وغیرہ کے متعلق ذرہ بینی سے کام لیا اور اس طرح قرآن مجید میں کسی غیر معلوم تصرف یا تحریف کا امکان باقی نہیں رہا جو اسکے استناد و اعتبار کو صدمہ پہونچانے کا باعث ہو۔

نویں خصوصیت | یہ ہو کہ قرآن مجید اپنے اجزا کے صحت و اعتبار کے لحاظ سے خود ہی اپنا معیار ہو یقیناً ارباب قلم کی علمی و ادبی شاہکاریں جو کسی پہلو سے امتیاز کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اُن میں قلم کا رنگ ڈھنگ اہل نظر کی نظر کو ایک خاص پیمانہ کا عادی بنا کر اُن کی قوت ادراک کو امتیاز کا جوہر دیدیا کرتا ہو جس کی بنا پر ایک نادیدہ عبارت بھی اُنکے سامنے پیش ہو تو وہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ اُس کتاب یا مضمون کا جز و ہو یا نہیں چہ جائیکہ قرآن مجید جو اپنے مخصوص طرز ادا اور اسلوب بیان میں اس امتیاز کو لیکر دنیا کے سامنے آیا تھا جس نے عالم انسانیت کے جز و و کل کو اپنے معارضہ کی دعوت دیکر اُن سے عجز کا اعتراف کرالیا اور جس کے سامنے تمام قوائے عمل اور انسانی ذرائع و وسائل نے اپنی شکست کا اقرار کر کے اُسکی کامل فتحیابی کی تصدیق کر دی۔ اس کا مخصوص طرز بیان اور طریقہ ادا صرف آیات کے فصل و وصل اور ان کے اختتامی فواصل میں مضمر نہیں ہو جس کا تتبع ایک انشا نگار کیلئے دشوار نہ ہو۔ ورنہ علی محمد باب کی کتاب البیان اور حسین علی بہا کی ایقان اور کتاب اقدس اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی حمامۃ البشری و خطبہ عید الاضحیٰ میں اس جوہر کی کمی نہیں ہو بلکہ وہ اُسکے الفاظ کی نشست اور جملوں کے جوڑ پیوند اور عبارت کی ساخت اور الفاظ و معانی کے مخصوص توازن میں اس حیرت انگیز پیرایہ کا نام ہے جس نے غیروں کو جادو اور اپنوں کو معجزہ کہنے پر مجبور کیا اس کا نتیجہ ہو کہ جب فصیح سے فصیح عبارت میں قرآن مجید کا ایک جملہ آجاتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہوتا ہو جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب —

اس موقع پر بے اختیار میرا دل چاہتا ہے کہ جامع نہج البلاغہ علامہ سید رضی طاب ثراہ کا کلام نقل کروں جو ممدوح نے اپنی کتاب "تفسیر حقائق التاویل و دقائق التنزیل" میں تحریر فرمایا ہے۔ اس بحث میں کہ قرآن میں حروف زائدہ کا وجود نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

انی لا قول ابدا انہ لو کان کلام یلحق بغبارہ او یجری فی مضمارہ بعد کلام رسول اللہ لکان ذلک کلام امیر المومنین علی علیہ السلام اذ کان منفرد ابطریقۃ الفصاحۃ لا تزاحمہ علیہا المناکب و لا یلحق بعقوہ فیہا الکادح المجاہد ومن اراد ان یعلم برہان ما اشرنا الیہ من ذلک فلینعم النظر فی کتابنا الذی الفناہ وسمیناہ نہج البلاغۃ وجعلناہ یشتمل علی مختار جمیع الواقع الینا من کلام امیر المومنینؑ فی جمیع الانحاء والاغراض والاجناس والانواع من خطب وکتب ومواعظ وحکم وبوبناہ ابوابا ثلثۃ تشتمل علی ھذہ الاقسام ممیزۃ مفصلۃ وقد عظم الانتفاع بہ وکثر الطالبون لہ لعظیم قدر ما ضمنہ

میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اگر کوئی کلام ہوتا جو قرآن کے گرد قدم کو پا جاتا یا اُسکے میدان میں چل سکتا تو وہ رسالتمآبؐ کے کلام کے بعد پھر کلام ہو سکتا تھا امیر المومنین حضرت علیؑ کا اسلئے کہ حضرت فصاحت کے ایک ایسے طریقہ کے ساتھ مخصوص تھے جسمیں دوسرے لوگوں کے کاندھے آپ سے ٹکراتے نہیں اور بڑے سے بڑے انتھک کوشش کرنے والے اُس تک پہونچ نہیں سکتے اور جو شخص ثبوت ڈھونڈھتا ہو ہمارے اس کلام کا وہ غور کی نگاہ ڈالے ہماری اُس کتاب پر جسے ہم نے جمع کیا ہے اور "نہج البلاغہ" نام رکھا ہے اور اُس میں ہم نے امیر المومنینؑ کے کلام سے جو ہم تک پہنچ سکا ہے خطب، کتب، مواعظ و حکم مختلف ابواب و شعبوں کے متعلق انتخابات درج کئے ہیں اور اُسے مندرجہ بالا شعبوں کی تعداد کے مطابق تین بابوں پر منقسم قرار دیا ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوئی ہے اور عام طور سے لوگ

من عجائب الفصاحة وبدايعها وشرائف
الكلم ونفائسها وجواهر الفقر وفرائدها
وكلامه مع ما ذكرنا من علو طبقته
وخلو طريقته وانفراد طريقه فانه
اذا حول ليلحق غاية من ادنى
غايات القرآن وجدناه ناكصا متقاعسا وقهقرا
راجعا دوا قفا بليدا وواقعا بعيدا على
انه الكلام الذي وصفناه بسبق المجارين
والعلو على المسامين فما ظنك بدون
ذلك من كلام الفصحاء وبلاغات البلغاء
الذي يكون بالقياس اليه هباء منثورا
وسرابا غرورا وهذا الذي ذكرنا ايضا
من معجزات القرآن اذا تأمله المتأمل
وفكر فيه المفكر اذا كان الكلام المتناهي
الفصاحة العالي الذروة البعيد المرمى
والغاية اذا قيس اليه وقرن به شال في
ميزانه وقصر عن رهانه وصار بالاضافة
اليه قالصا بعد السبوغ وقاصرا
بعد البلوغ ليصدق فيه قول الصدق

اُسکے طالب ہوئے ہیں اسلئے کہ اس میں فصاحت
کے عجیب انوکھے اور بیمثال رموز و اسرار اور
بہترین الفاظ و فقرات کے جواہر ریزے
ودیعت ہیں لیکن باوجود ان خصوصیات کے
جو حضرت کے کلام کو حاصل ہیں جب اُسے لایا جائے
قرآن کے سامنے کہ اسکے کسی معمولی نقطۂ
فصاحت کا مقابلہ کر سکے تو ہم دیکھتے ہیں اس
کلام کو کہ وہ قدم پیچھے ہٹاتا اور اُلٹے پاؤں
واپس ہوتا اور اپنی کمزوری کا اعتراف کرکے
ٹھہر جاتا اور دور ہی پر ہاتھ پاؤں ڈالدیتا ہے
حالانکہ یہ وہ کلام ہے جس کے متعلق ہم نے بیان
کیا کہ تمام فصحاء و بلغاء کے کلمات میں بلند ترین
درجہ رکھتا اور سب سے آگے ہے تو پھر اب کیا خیال
کیا جا سکتا ہے دوسرے فصحاء کے کلام کے متعلق
جو اسکی نسبت اُڑتے ہوئے ہوا کے ذروں سے
اور نظر فریب سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا
اور یہ جو ہم نے بیان کیا ہے یہ بھی اگر انسان غور کرے
تو قرآن مجید کے اعجاز کا ایک نتیجہ ہے اسلئے کہ
انتہا درجہ کا فصیح کلام جس کا کنگرہ کمال بلند

القائلین سبحانہ اذ یقول وانہ لکتاب عزیز لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

حیثیت یہ کھتا ہو جب قرآن کیساتھ لا کر دیکھا جاتا ہے تو اُس کا پلہ سبک ہو جاتا ہے اور وہ قرآن کے لحاظ سے باوجود وسیع الذیل ہونے کے کوتاہ دامن اور باوجود کامیاب ہونے کے ناکامیاب معلوم ہونے لگتا ہو یہانتک کہ صحیح ثابت ہو خداوند عالم کا قول کہ یہ ظفر و منصور کتاب ہے جس کے پاس باطل کا گذر نہیں ہو سکتا نہ سامنے سے نہ پس پشت سے، یہ اتاری ہوئی ہے خدا کی جو بڑی حکمت والا اور مستحق حمد و ستائش ہو"

اس بنیاد پر جو ہم نے بیان کی ہو کسی ایک کلام کے متعلق جس کے جزو قرآن ہونے کی روایت بیان کیجائے یہ سمجھ لینا بہت آسان ہو کہ حقیقۃً وہ قرآن کا جزو ہو یا نہیں اور اسی لحاظ سے ہم نے یہ کہا ہے کہ قرآن خود اپنا معیار ہو۔

اگر درایت کوئی چیز ہو اور روایت کا درایت پر منطبق ہونا عقلی لحاظ سے ضروری ہو تو کسی راوی کا قول کہ فلاں سورہ یا آیہ قرآن کا جزو تھا اُسوقت تک قابل اعتماد نہیں جبتک وہ خود اپنے جزو قرآن ہونیکی گواہی نہ دے رہا ہو اور اس طرح خواہ بعض اہلسنت کا روایتی سورہ حفد و خلع ہو یا بعض شیعوں کا سورۂ ولایت کسی صورت پر جزو قرآن تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہو اسلئے کہ جب ہم اسکو مسلمہ آیات قرآنی کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہی نسبت معلوم ہوتی ہو جو سنگریزہ کو گوہر شاہوار سے۔ اس طرح اکثر اُن آیات کی حقیقت کھل جاتی ہے جنکے متعلق رطب و یابس جمع کرنے والے محدثین نے یہ لکھدیا ہے کہ وہ جزو قرآن مجید تھے اور نسخ تلاوت یا تحریف کی حیثیت سے حذف ہو گئے ہیں۔

یہ خصوصیت قرآن مجید کی ایسی ہو جو اسکے علاوہ دوسری آسمانی کتابوں میں پائی نہیں جاتی ہو

اسلئے کہ ان کتابوں میں کوئی یقینی مقدار تعیین کے ساتھ ایسی بتائی ہی نہیں جا سکتی جو یقیناً خدا کا کلام ہو جس کو ہم شک و شبہ کی صورتوں کا معیار قرار دیں۔

لیکن قرآن مجید میں اتنی مقدار کہ جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے وہ باتفاق کل اور روایت و درایت دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے اور وہ مشکوک و مشتبہ صورتوں کے لئے معیار بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسکے علاوہ دوسری کتابوں میں لفظ و معنی اور انداز بیان کے اعتبار سے کوئی ایسی ندرت بھی نہیں ہے جو کسی دوسرے کلام میں پائی نہ جا سکے لیکن قرآن مجید اپنے ذاتی خصوصیات کی بنا پر بے شک اپنا معیار بننے کے قابل ہے اور اس طرح وہ بے اصل توہمات کا قلع و قمع اور بے بات کی بات بنانے والوں کی زبان بندی کرنے کے لئے خود بہت کافی ہے۔

چھٹا تبصرہ

"جمع قرآن"

قرآن مجید تدریجی حیثیت سے تقریباً بیس برس کے عرصہ میں رسالتمآبؐ کے اوپر نازل ہوا اور مختلف حالات اور واقعات کی مناسبت سے آیات اور کبھی مستقل سورے آپ پر اترتے اور آپ انکی تبلیغ فرما دیتے تھے۔

درحقیقت اس صورت سے نازل ہونا اعجاز کے پہلو کو زیادہ نمایاں اور روشن بنانے کا باعث تھا۔ ایک پوری مکمل کتاب جس میں مختلف ابواب و فصول، مختلف رنگ کے مضامین اور مختلف علوم و فنون کے شعبے ہوں اس کا جواب بنانا زیادہ مشکل اور اسکے جواب میں اجتماعی

حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سپر انداختہ ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت اسکے کہ تھوڑا تھوڑا کلام ایک ایک سطر یا اس سے زیادہ پیش ہوتا ہے اور ہر جزو کے متعلق جواب دینے کا مطالبہ مساوی حیثیت سے قائم ہو۔ یقیناً اس صورت میں عام انسانی کلام کے حدود کو دیکھتے ہوئے جواب تیار کرنے کا موقع زیادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر اُن کو ہر ہر جزو کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے اور تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا موقع بھی حاصل ہوتا رہتا تھا۔ ایک جاہل ور امّی قوم کو یہ موقع اُسوقت نہ حاصل ہوتا جب وہ مجموعی طور پر کتاب کی صورت سے نازل ہوتا۔ اسکے علاوہ مصالح تبلیغ اور اسباب تشریع کے لحاظ سے بھی اس تدریجی حیثیت کا قائم رہنا بہت اہم اور ضروری تھا اسلئے کہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے تشریع کی مصلحت ابتدائی زمانۂ نبوت میں نہیں تھی اور پھر کچھ زمانہ گذرنے کے بعد انکی مصلحت پیدا ہوئی۔

جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ "تذکرہ حفاظ شیعہ" میں لکھا ہے اسلام آیا تھا امّی گروہ میں جو زیادہ تر کتابت و قرأت سے عاری تھے اور کسی چیز کو لکھنے اور اُس کو لکھکر پڑھنے کے عادی نہیں تھے اسلئے ذوق حفظ اُن میں ترقی پر تھا شعرا کے سو سو دو دو سو شعر کے قصیدے از بر حفظ کر لیتے تھے اور بڑے بڑے مقررین کی تقریریں زبانی سنا دیتے تھے۔

قرآن کو تواتر کی ضرورت تھی۔ اسکے علاوہ چونکہ وہ مذہبی تعلیمات کا سرچشمہ تھا مسلمانوں کو احکام مذہبی اور حقائق اسلامی سے واقف کرنے کے لئے بھی اُن میں قرآن مجید کے شایع ہونے کی ضرورت تھی۔

اُن کی زبان عربی ہی تھی اور قرآن اُنہی کے روزمرہ اور محاورات کے مطابق نازل ہوا تھا اسلئے وہ اگر صرف قرآن کو حفظ ہی کر لیتے تب بھی اُسکے ظواہر الفاظ اور مندرجہ احکام سے واقف ہو جاتے۔ لہذا اُن کو احکام سے باخبر کرنے کی صورت ہی یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ

مقداء میں قرآن کو حفظ کریں اور اس وجہ سے رسالتمآب کی جانب سے قرآن کی تعلیم کے لئے لوگ روانہ کئے جاتے تھے اور مختلف اشخاص متفرق حیثیت سے جتنا ممکن ہوتا تھا قرآن مجید کے آیات کو یاد کرتے تھے۔

لیکن ہمیں کوئی شبہہ نہیں کہ کسی شئے کا لوگوں کو محفوظ ہونا مضبوطی و استحکام میں کسی طرح اسکے کتابی صورت میں شایع ہونے کے برابر نہیں ہے۔

کتاب اگر ایک دفعہ لکھ لی گئی اور اس کا پورے طور سے مقابلہ کر کے تصحیح کا کام انجام دیدیا گیا تو وہ ابدیشہ کے لئے صحیح ہے جب تک خاص طور سے کوئی اسکو مسخ نہ کرنا چاہے وہ غلط نہو جائیگی لیکن حفظ ہر روز خطرہ کا مرکز ہے، فرض کیا جائے کہ ایک دفعہ کسی حافظ نے بڑی جانفشانی و اہتمام کے ساتھ کسی بڑے حافظ سے قرآن یاد کر کے اس کو سنا بھی دیا اور شروع سے آخر تک کہیں غلطی نہوئی اور اس نے تصدیق بھی کر دی لیکن طبع انسانی ہر وقت معرض تغیرات و انقلابات ہے۔ ایک تھوڑے دن کے فاصلہ میں بہت جگہ واو کی جگہ ف اور ف کی جگہ واو۔ مقدم کا موخر اور موخر کا مقدم ہو گیا۔ اب انسان نے جو اپنے حفظ کے رو سے پڑھا اگر اس کو تردد اور شبہہ پیدا ہو گیا کہ یہاں پر واو ہے یا ف تو خیر ممکن ہے کہ وہ اپنے استاد سے جا کر تجدید کرلے لیکن اگر غلطی نے حفظ کی صورت اختیار کر لی اور توجہ بھی نہ ہوئی کہ یہاں کچھ کا کچھ ہو گیا تو وہ اسی غلطی پر قائم رہ گیا، اسے تو یہ بھروسا ہے کہ میرا حفظ معیار امتحان میں کامل ثابت ہو چکا۔ استاد کی طرف سے سند حاصل کر چکا ہے۔ یہاں اس میں کتنے انقلابات و تغیرات ہو گئے ہیں جن کی اسے خبر بھی نہیں یہ صورتیں انسان کے محفوظات میں اکثر پیدا ہوتی ہیں جن کی ہر شخص تصدیق کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام متمدن قومیں جو زیور علم و ادب سے آراستہ ہو گئیں وہ کتابت و تحریر کی پابند ہیں۔ کتاب بیشک معلومات کے لئے ایک محفوظ قلعہ اور مضبوط جائے پناہ ہے جس کی ضرورت علم و

تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ محسوس ہوئی ہے۔

رسالتمآبؐ اگرچہ ایک اُمّی قوم میں مبعوث ہوئے تھے اور آپ نے ان پڑھ جماعت کے اندر نشوونما پائی تھی اور آپ بھی اپنی انسانی فطرت کی بنا پر اُن کے اخلاق و اوصاف سے متصف اور اُن کے شریک و حصہ دار تھے لیکن روحانی تعلیم اور خداوندی وحی کے فیض و برکت سے آپ حکیم کامل اور عظیم فلسفی کا درجہ رکھتے تھے اور آپ اس حکیمانہ رمز سے پورے طور پر مطلع تھے جو آپ کے ساختہ و پرداختہ شاگرد اور روحانی فرزند امیرالمومنین علی بن ابیطالبؑ نے آپ کے بعد فرمایا تھا کہ قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابَةِ "علمی فوائد کو کتابت کے ذریعے سے مقید و محفوظ کرو۔" اسی کا نتیجہ تھا کہ رسالتمآبؐ نے صرف اس عادت کے مطابق جو عام ابنائے زمانہ کی تھی۔ قرآن مجید کے متعلق زبانی محفوظ ہونے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اہتمام فرمایا کہ جو کچھ نازل ہو وہ فوراً قید تحریر میں لے آیا جائے اور اسلئے ایک جماعت کاتبان وحی کی مقرر فرمائی جو ہر آیت کو نزول کے بعد ہی حضرت کے ارشاد کے مطابق فوراً لکھ لیا کرتے تھے جس چیز پر بھی کہ وقتی حیثیت سے ممکن ہو پتھر یا چمڑے کے ٹکڑے یا درخت خرما کی چھال یا کوئی اور چیز جو اسوقت موجود ہو۔

یہ قرآن مجید کے تمام آیات کا ایک مکمل نسخہ تھا جو متفرق اور غیر مرتب صورت پر موجود تھا اسکے لئے ضرورت تھی کہ وہ یکجا ترتیب کے ساتھ کتابی صورت میں مدون کر دیا جائے۔

اُس کا اس ترتیب کے ساتھ کہ جس طرح وہ نازل ہوا تھا مرتب کرنا عام صحابہ کے بس کی بات نہیں تھی اسلئے کہ وہ مکتوبی حیثیت سے موجود تھا تو اجزاء، اوراق، اور کاغذ کے صفحات پر نہیں تھا کہ صرف اُنکی ترتیب ملالی جائے اور بس۔ بلکہ وہ آیتیں تھیں متفرق اور پراگندہ چھوٹے چھوٹے چمڑے کے حصوں پر پتھر کے ٹکڑوں پر اور درخت خرما کی چھالوں پر وہ سب کسی انسان کے پیش نظر رکھے جائیں تو کون بتائے کہ کیونکر انھیں اصل سلسلے کے مطابق مرتب کیا جائے اسکے لئے

ضرورت ہے کہ تمام آیات، اُنکی ترتیب، تاریخ و شان نزول بالکل پیش نظر اور محفوظ ہو اور اُسکے مطابق قرآن کو جمع کیا جائے۔

پھر صحابہ کرام تو ہر وقت رسولؐ کی خدمت میں موجود نہیں رہتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے حضرات مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کے بعد اسلام لائے تھے اور قرآن اسکے پہلے سے نازل ہو رہا تھا ان میں سے بہت تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے۔ اُن کو اتنی بھی مہلت نہ تھی کہ وہ قرآن مجید پورا یاد کر لیتے۔ چہ جائیکہ اسکے آیات کی پوری ترتیب اور شان نزول۔

بے شک اس کے لئے ایسی ہستی کی ضرورت تھی جس کو خاص طور سے رسولؐ کی جانب سے علم قرآن حاصل ہوا ہو۔ جو آیات کی ترتیب، شان، کیفیت نزول سے پورے طور پر مطلع ہو اور کہتا رہتا ہو کہ میں جانتا ہوں کون آیت سفر میں نازل ہوئی، کون حضر میں، کون دن کو کون رات کو اور کون زمین ہموار میں کون پہاڑ کی بلندی پر۔"

بے شک ایسی ذات علی ابن ابیطالبؑ کی تھی۔ رسولؐ کی ودیعتیں اور رسالت کی خاص امانتیں سب انہی کے سپرد تھیں اور قرآن مجید کا مکتوبی مجموعہ بھی جو مذکورہ بالا شکل میں تھا وہ بھی آپ ہی کی طرف منتقل ہوا۔ آپکے متعلق رسالتمآبؐ نے بارہا تصریح فرمادی تھی کہ "علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ ہے"۔ حضرتؐ نے ان کو قرآن کے ساتھ ایک ساتھ ذکر فرما کر انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہلبیتی کے الفاظ میں یہ بھی پتہ دیدیا تھا کہ قرآن کے متعلق اگر کوئی مشکل درپیش ہو تو اسکے حل کرنیوالے یہی بزرگوار ہیں۔

رسولؐ کا انتقال ہو گیا۔ دنیا والوں کے دلوں پر دنیا کی فکر کا غلبہ چھا گیا اور اُسکے لئے کمیٹیاں۔ کانفرنسیں۔ جلسے اور مشورے ہونے لگے اور سلطنت کے حصول کے لئے فکر و عمل کی تمام طاقتیں صرف ہونے لگیں۔ رسولؐ کے گھرانے والے اپنے انتہائی رنج و غم کے عالم میں اور اس

قیامت کے دور میں جو اُن کے سر پر رسولؐ کی وفات نے ڈھادی تھی ان تمام افعال و حرکات کانفرنسوں اور جلسوں کے انعقاد اور جاری شدہ کارروائیوں سے بالکل بے تعلق تھے انھیں اسکا موقع بھی نہ تھا کہ وہ ان امور کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اور دوسرے افراد اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کی محویت میں اُن سے بے تعلق تھے اور انھیں اسکی مصلحت نہ تھی کہ اُن کی طرف متوجہ ہو سکیں اس گوشہ گیری، بیکسی اور غم و رنج کی فراوانی کے عالم میں سب سے پہلی فکر جو حفاظت مذہب کے اصل ذمہ دار اور شریعت و دین پیغمبر کے سب سے بڑے حامی و محافظ حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ کو پیدا ہوئی وہ قرآن مجید کے کتابی صورت میں یکجا کر دینے کا مسئلہ تھا۔

حضرت نے اپنے نفس پر حتم کر لیا کہ اپنی عبا اپنے دوش پر نہ ڈالیں گے جب تک قرآن مجید کو ترتیب کے ساتھ مجتمع نہ فرمالیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت نے قرآن کو اسکی ترتیب نزول کے مطابق مجتمع فرما دیا۔

یہ سب سے پہلا مصحف تھا جو اسلام میں کتابی صورت سے مدون ہوا۔ حق و حقیقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان اس مصحف کو اپنا کعبہ اور قبلہ بناتے، اسی کو اصل قرار دیتے، اُسکی نقلیں اتارتے پڑھتے پڑھاتے اور حفظ کرتے اور اسی کی اشاعت کی کوشش کرتے۔

لیکن سیاسی مصالح جن کی بنا پر علی کی شخصیت کو بھلاوے میں ڈالنا ضروری تھا، وہ شخصیت کہ اگر کہیں اُسکے کمالات دنیا میں پھیلیں اور رونما ہوں تو دوسرے نقش مٹ ہو جائیں اور نظر اعتبار سے گر کر فنا کے درجہ پر پہونچ جائیں، وہ مصالح اسکے مقتضی نہیں تھے کہ علی کے کسی بڑے سے بڑے کام کو بڑا سمجھ کر اسکی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ پھر بالخصوص ایسا اہم کارنامہ یعنی قرآن کا معاملہ جس پر دین و مذہب کی بنیاد ہے جس کا سہرا اگر آپ کے سر بندھ جاتا تو تمام مسلمان آپکے دست نگر ممنون احسان اور آپکا مذہبی اقتدار تمام مسلمانوں میں قائم ہو جاتا۔

اسوجہ سے سیاسی اغراض کا تقاضا یہی تھا کہ آپکے جمع کئے ہوئے قرآن مصحف کی طرف توجہ نہ کی جائے اور وہ زینت طاق نسیاں بنا دیا جائے۔ علی نے جمع قرآن میں اپنی مصروفیت کا اظہار کر دیا، سبکو معلوم ہوا کہ آپ یہ کام انجام دے رہے ہیں اور آپنے پھر انجام بھی دیدیا۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس پر کوئی توجہ نہیں ہوئی اور اُسے لیکر غور سے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی حضرتؑ نے یہ دیکھا، خاموش ہوے۔ اپنے جمع کردہ مصحف کو سلک مروارید کی طرح اپنے خزانہ خاص میں محفوظ کیا۔ اُس طرف سیاسی تحریک شباب پر تھی۔ سیاسی پیچیدگیوں کا ہجوم تھا۔ اطراف و جوانب کے قبیلوں نے بغاوت کی تھی۔ اور حکومت کے تمام اجزا اُن بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف تھے اسلئے دو ایک برس اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی گئی کہ قرآن کے مجتمع ہونے کی ضرورت ہے۔ بیشک جب لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہو گئی اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں حاملان قرآن کے قتل ہونے کے سبب قرآن کا کثیر حصہ تلف نہو جائے تو اسوقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالتمآبؐ کے آخری زمانہ کے صحابہ میں سے ایک فرد تھے۔

انھوں نے بڑی جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ مختلف صحابہ کرام کے متفرق اجزاء سے جو پتھر، چمڑے، لیف خرما وغیرہ پر تھے اور نیز اُن سے دریافت کر کے اُنکے محفوظات کی مدد سے قرآن مجید جمع کیا، اسمیں یقیناً کوئی فرو گذاشت اور کمی نہیں تھی سوائے اسکے کہ وہ ترتیب نزول کے مطابق نہیں تھا۔

اس سے بیشک ایک خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ناسخ و منسوخ کی معرفت دشوار ہو گئی اور بعض آیات کی تاویل و تفسیر مشکل ہو گئی جو خود سیاق کلام سے مستفاد ہو سکتی تھی لیکن یہ ایسی بات نہ تھی جو قرآن مجید کی حقانیت اور اہم افادی حیثیت پر کوئی اثر ڈالتی اور رخنہ انداز ہوتی۔

امیرالمومنینؑ کو جو مفاد اسلامی کے محافظ اور حقیقی ذمہ دار تھے یہ امر نامناسب معلوم ہوا کہ آپ اپنے جمع کردہ قرآن مجید کو اظاہر کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں کیونکہ اس صورت میں یقیناً قرآن مجید کے ایسے اہم مسئلہ میں مسلمانوں کے اندر دو فرقے پیدا ہو جاتے یعنی مسلمانوں کا قرآن بھی ایک نہ رہ جاتا اور دو ہو جاتے۔

آپ کو مفاد اسلامی کی حفاظت اسی میں نظر آئی کہ آپ جمع قرآن کے سلسلہ میں اُن لوگوں کی قرارداد کو منظور کرلیں اور جس مجموعۂ قرآن پر اُن لوگوں کا اتفاق ہو گیا تھا اُسی سے آپ بھی اتفاق فرمالیں اور اُس کا امضا فرمادیں۔

اس طرح واقعی حقیقی اجماع ہو گیا اُس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفتین موجود ہے اور اسمیں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں رہا۔

اگر اس قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کوئی ایسی خرابی کمی یا زیادتی کی ہوتی جو اسکی حقانیت پر اثر ڈالتی تو یقیناً حضرت علیؑ پر یہ لازم تھا کہ وہ اس حقیقت کو آشکار کرتے اور اپنے پاس والے قرآن کو پوری کوشش کے ساتھ ظاہر فرما دیتے اور اسمیں ایک دم کی بھی تاخیر جائز نہ سمجھتے اسلئے کہ تقیہ بھی ایسی بات میں جائز نہیں ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اصل دین و بنیاد مذہب ہو اور جس پر تمام شریعت کی بنیاد قائم ہو۔

امیرالمومنینؑ کا صرف سکوت ہی کرنا اُس قرآن کے مقابلہ میں جو عام طور سے مسلمانوں میں شایع ہو رہا تھا اُسکی حقانیت کی ایک حقیقی و واقعی دلیل ہے۔

اور پھر حضرت کے کلمات کے مطالعہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے سکوت ہی نہیں فرمایا ہے بلکہ آپنے اسی قرآن کے اتباع کی دعوت دی ہے اور اسے معاش اور معاد کے تمام معاملات میں حجت خدا بتلایا ہے۔ نہج البلاغہ میں جو آپکے ارشادات کا مجموعہ ہے اس کی بہت سی مثالیں

موجود ہیں۔

ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:-

اللہ اللہ ایھا الناس فیما استحفظکم من کتابہ واستودعکم من حقوقہ فان اللہ سبحانہ لم یخلقکم عبثا ولم یترککم سدی ولم یدعکم فی جھالۃ ولا عمی قد سمّی آثارکم وعلم اعمالکم وکتب آجالکم وانزل علیکم الکتاب تبیانا لکل شیئ وعمّر فیکم نبیّہ ازمانا حتی اکمل لہ ولکم فیما انزل من کتابہ دینہ الّذی رضی لنفسہ۔

خدا کا خوف کرو اے گروہ مردم کتاب خدا کے بارے میں جس کی نگہداری کا وہ تم سے طالب ہوا ہے اور اُسکے حقوق کا تمھیں امانتدار بنایا ہے۔ خدا نے تم کو عبث نہیں پیدا کیا اور نہ مہمل و بیکار چھوڑا اور نہ جہالت و کور چشمی میں تم کو چھوڑ رکھا اُس نے تمھارے حالات کو نامزد کر دیا اور تمھارے اعمال پر نشان کھینچ دیے اور تمھاری عمروں کو لکھ لیا اور تمھارے اوپر کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کے بیان پر مشتمل ہے اور اُس نے تمھارے درمیان اپنے نبی کو ایک زمانہ تک زندہ رکھا یہانتک کہ اُس نے اُنکے لئے اور تمھارے لئے اس کتاب میں جو نازل کی ہے اپنے اُس دین کو مکمل کر دیا جسے اُس نے اپنے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے۔

دوسرے خطبہ کی عبارت:-

تعلّموا القرآن فانہ احسن الحدیث وتفقّھوا فیہ فانہ ربیع القلوب واستشفوا بنورہٖ فانہ شفاء للصّدور واحسنوا تلاوتہ فانہ انفع القصص۔

قرآن کی تعلیم حاصل کرو اسلئے کہ وہ بہترین کلام ہے اور اُسکے احکام کو سمجھنے کی کوشش کرو اسلئے کہ وہ کشتِ دل کے لئے بہار ہے اور اُسکی روشنی سے اپنی بیماریوں کو دور کرو اسلئے کہ وہ سینوں کیلئے شفا ہے اور اُسکی تلاوت خوب کرو کیونکہ وہ

بہترین واقعات کا تذکرہ ہے۔"

تیسرے موقع پر تحکیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

انا لم نحکم الرجال وانما حکمنا القرآن وھذا القرآن انما ھو خط مسطور بین الدفتین لاینطق بلسان ولابد لہ من ترجمان وانما ینطق عنہ الرجال ولما دعانا القوم الی ان نحکم بیننا القرآن لم نکن الفریق المتولی علی کتاب اللہ تعالیٰ۔

ہم نے انسانوں کو حکم نہیں بنایا تھا بلکہ قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہوئے تھے اور یہ قرآن وہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان لکھا ہوا تحریر کی صورت میں موجود ہے وہ زبان سے تو بولتا نہیں۔ اُسکے لئے ترجمان کی ضرورت ہے، انسان وہ ہوتے ہیں جو اُسکی ترجمانی کرتے ہیں اور جب ان لوگوں نے ہم کو دعوت دی کہ ہم قرآن کو حکم قرار دیں تو ہم ایسی جماعت نہیں بنے کہ جو قرآن سے روگردانی کرنے والی ہو۔

چوتھے مقام پر ایک کلام کے ضمن میں۔

انما حکم الحکمان لیحییا ما احیی القرآن ویمیتا ما امات القرآن واحیاؤہ الاجتماع علیہ وإماتتہ الافتراق عنہ فان جرنا القرآن الیھم اتبعناھم وان جرھم الینا اتبعونا۔

دونوں حکم اسلئے مقرر ہوئے تھے کہ وہ زندہ کریں اس بات کو جسے قرآن زندہ کرے اور مردہ کریں اُس بات کو جسے قرآن مردہ کرتا ہے قرآن کی بات کو زندہ کرنے کے معنی اُس پر متفق ہونا ہے اور اُس کو مردہ کرنا اسکو چھوڑ کر الگ ہو جانا ہے۔ تو اگر قرآن ہم کو کھینچے ہمارے مخالفین کے مطالبہ کی طرف تو ہم گردن جھکالیں اور اگر انھیں کھینچے ہماری طرف تو وہ ہمارے تابع فرمان ہو جائیں۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں :-

کتاب اللہ بین اظہرکم ناطق لا یعیی لسانہ وبیت لا تھدم ارکانہ وعز لا تھزم اعوانہ ۔	خدا کی کتاب تمہارے درمیان موجود ہے۔ یہ وہ بات کرنے والا ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور وہ عمارت ہے جس کے ستون گرنے والے نہیں

اور وہ سرمایۂ عزت ہے جس کی حمایتی شکست کھانے والے نہیں ہیں ۔

ایک اور موقع پر ہے ۔

انہ سیأتی علیکم من بعدی زمان لیس فیہ شیئ اخفی من الحق ولا اظہر من الباطل ولا اکثر من الکذب علی اللہ ورسولہ ولیس عند اھل ذلک الزمان سلعۃ ابور من الکتاب اذا تلی حق تلاوتہ ولا انفق منہ اذا حرف عن موضعہ ولا فی البلاد شیئ انکر من المعروف ولا اعرف من المنکر فقد نبذ الکتاب حملتہ وتناساہ حفظتہ فالکتاب واھلہ یومئذ طریدان منفیان وصاحبان مصطحبان فی طریق واحد لا یؤویھما مؤو فالکتاب واھلہ فی	یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنیوالا ہے جس میں کوئی شئے حق سے زیادہ مخفی اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی۔ اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی چیز بے قیمت نہ ہوگی جب اُسکو حق تلاوت ادا کرتے ہوئے پڑھا جائے (یعنی اسکے صحیح معنی کے ساتھ اسکے آیات کو پیش کیا جائے) اور اُسی قرآن سے زیادہ کوئی شئے رائج نہ ہوگی جبکہ اس کو اُسکے مقررہ مقامات سے ہٹا دیا جائے (یعنی اسکے معانی میں تراش خراش کر کے اصلی مقاصد سے دور کر دیا جائے) کوئی شئی عالم میں معروف سے زیادہ منکر اور منکر سے زیادہ معروف نہ ہوگی ، قرآن کو اُسکے حاملین نے پس پشت ڈالدیا ہوگا اور اسکے حفظ کے دعویدار افراد نے اس کو بھلا دیا

ذلك الزّمان فی الناس ولیسا فیهم ومعهم لان الضلالة لا توافق الهدیٰ وان اجتمعا فاجتمع القوم علی الفرقة وافترقوا عن الجماعة کانّهم ایمّة الکتاب ولیس الکتاب امامهم فلم یبق عندهم منه الا اسمه ولا یعرفون الا خطّه وزبره۔

ہوگا۔ اُس دن قرآن اور حقیقی اہل قرآن شہر بدر اور جلا وطن ہونگے وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم نفس اور ہمدم ہونگے کہ اُن دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ملتا ہوگا۔ قرآن اور اہل قرآن اس وقت لوگوں کے درمیان موجود ہوں گے لیکن گویا وہ اُن کے اندر اور اُنکے ساتھ نہیں ہیں اسلئے کہ ضلالت ہدایت کے موافق نہیں ہوسکتی اگرچہ ایک جگہ پر ہو۔ وہ لوگ افتراق پر مجتمع اور نقطۂ اجتماع سے متفرق ہونگے گویا وہ خود قرآن کے رہنما ہیں (کہ جدھر چاہیں اسکو پھیر لیں) قرآن اُنکا رہنما نہیں ہے۔ اُن کے پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اُسکے خط و حروف کو پہچانتے ہونگے ‘‘

ایسے ہی اور بھی بہت سے مقامات ہیں جن کو کافی تبصرہ کے ساتھ ہم نے اپنے رسالہ ’’تحریف قرآن کی حقیقت‘‘ میں درج کیا ہے اور جو عبارتیں یہاں بطور مثال پیش کی گئی ہیں اُنکے متعلق بھی وہاں کافی تشریح کر دی گئی ہے۔

امیر المومنینؑ کے بعد دوسرے ائمہ معصومینؑ بھی برابر اسی طریقہ پر قائم رہے اور باوجود اختلاف ازمنہ و حالات کے اور بہت سے ایسے اوقات کے جن میں تقیہ کا پردہ بہت ہلکا ہو گیا تھا اور زمانہ بیان حقیقت کا پورے طور سے مقتضی تھا اُنھوں نے برابر اسی قرآن کی تبلیغ و تعلیم کی اور اسی کو خلق خدا کے لئے حجت اور واجب العمل بتلایا، حدیثوں کے صحت و اعتبار کا اسے معیار قرار دیا اور یہ کہا کہ جو حدیث کتاب خدا کے خلاف ہو وہ ساختہ و پرداختہ اور بالکل باطل ہے۔ یہ حدیثیں

اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ اُن سے کتب احادیث و اخبار چھلک رہی ہیں اور تحریف قرآن کی حقیقت کے آخری حصہ میں ہم نے ان احادیث کے کافی حوالے درج کر دئے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیعہ برابر ائمہ اہلبیت کے اتباع کا دم بھرتے رہے ہیں۔ اُن کا مذہب انکے عقائد اُن کے مسائل و احکام سب ائمہ اہلبیت کے اقوال و ارشادات پر مبنی قرار پائے ہیں جس کا بعض منصف مزاج اُنکے مخالفوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام تو قرآن مجید کو حجت و سند بتلائیں۔ اس سے احتجاج و استناد کریں اُس سے تمسک کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرمائیں بلکہ اُس کو احادیث کی صحت کا معیار قرار دیں اور شیعہ بحیثیت مذہب اس کے برخلاف قرآن کی صحت میں شک کریں اور اُسکے اعتبار میں قدح کریں اور اُس میں زیادتی یا کمی کے قائل ہوں جس سے اُسکی سند مشکوک ہو جائے اور وہ قطعی حیثیت سے کلام الٰہی باقی نہ رہے۔

ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اکابر علمائے شیعہ جن کے اقوال و تحقیقات کے محور پر تشیع کے آسمان نے گردش کی ہے اُن کے اقوال و تصریحات اسکے خلاف ہیں۔ انھوں نے تصریح کی ہے کہ ہم قرآن مجید میں کسی زیادتی یا کمی کے قائل نہیں ہیں جس سے اُسکی صحت و اعتبار میں کوئی شبہہ واقع ہو سکے۔

یہ قرآن مجید کے ساتھ دوستی نہیں ہے کہ بہت سے دعویداران اسلام صرف اپنے اسلام کو ممتاز درجہ دینے کے لئے شیعوں کی طرف بحیثیت مجموعی اس عقیدہ کی نسبت دیتے اور اُس پر ضد کرتے ہیں کہ وہ قرآن میں زیادتی اور کمی کے قائل ہیں اور اُس کو معتبر نہیں سمجھتے۔

یہ وہ چیز ہے جو غیر مسلمین کی نظر میں قرآن مجید کی اہمیت کو کم کرنے کا سبب ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جب تم یعنی مسلمانوں میں کا ایک بڑا فرقہ خود قرآن مجید کی صحت میں

تیار کیا ہے تو تم اس کو ہمارے سامنے بحیثیت کلام الٰہی پیش کرنے کا کیا حق رکھتے ہو۔

اس کی ذمہ داری انہی ناعاقبت اندیش مسلمانوں پر عائد ہوتی رہی جو مناظرہ کے میدان میں صرف اپنی بات کو بالا رکھنے اور عوام کے خیالات کو اپنے مخالف فریق سے برگشتہ کرنے کے لئے اس فریق کی طرف ایسے اقوال کی نسبت دیدیتے ہیں جس سے وہ بالکل بری ہے اور اُس سے انکار کا اظہار کرتا ہے۔

ہم نے بارہا اعلان کیا اور پھر اعلان کرتے ہیں کہ ہم قرآن مجید، اسی دونوں دفتیوں کے درمیان والے قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کسی قسم کا شبہہ نہیں رکھتے اور ہم اس کو کلام الٰہی، رسول کا اعجاز، اسلام کی سچائی کا نشان اور تمام مسلمانوں کے لئے لازم العمل اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں۔

پھر اب دور از کار بحثوں سے فائدہ کیا اور اس اصرار کی ضرورت کونسی کہ نہیں، تمہارا ایمان قرآن پر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

ہمارا ایمان ہے یا نہیں۔ یہ ہمارے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے لیکن یاد رکھئے کہ آپ کے اس قول سے غیر مسلم فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور اس سے اسلام ضعیف ہوتا ہے۔ اب آپ اپنے اسلام کی خبر لیجئے جو کفر کا مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

میں نے اپنی مستقل کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" اسی الزام کے دفعیہ میں لکھی اور اُس میں مستند علماء کے تصریحات درج کئے جن سے قرآن مجید کے متعلق فرقہ شیعہ کا نقطہ نظر صاف طریقہ سے بے نقاب ہوتا ہے۔

بعض اصحاب کو میرے اس طرز عمل سے شکایت پیدا ہوتی رہی کہ میں بعض مباحث میں اپنی دوسری کتابوں کا حوالہ دیتا ہوں، ان حضرات کے خیال کا کمال احترام مدنظر رکھنے کے باوجود

ہیں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ایسے مباحث جن کو پوری تفصیل سے میں نے اپنی دوسری کتابوں میں لکھا ہے یا کسی بحث پر میں مستقل کتاب لکھ چکا ہوں اس کو کیونکر ممکن ہے کہ میں اس تمام تفصیل کے ساتھ اپنی بعد کی کتابوں میں بھی ہر اس مقام پہ درج کر دیا کروں جہاں اسکی مناسبت ہو۔

اس صورت میں تو میری کتابیں مجموعۂ مکررات ہونگی جو مطالعہ کرنے والے کے رخ کو پھیر دینگی اور اُن لوگوں کے لئے جو میری صرف ایک کتاب کو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ گذشتہ کتابوں کا بھی مطالعہ کر چکے ہیں بددلی کا باعث ہونگی۔

بیشک اتنا ضروری ہے کہ جہاں اس مسئلہ کے بیان کی ضرورت ہو وہاں مجھ کو کلام کو صرف حوالہ پر بھی ٹالنا نہیں چاہیئے اور اتنے اختصار و اشارہ سے کام بھی نہ لینا چاہیئے کہ اس کتاب کے دیکھنے والے کو کچھ معلوم ہی نہ ہو سکے اور شاید اگر اُسے پہلی کتابیں دستیاب نہوں تو وہ بالکل حیرت و سرگشتگی میں مبتلا رہے۔ یہ صورت یقیناً اس شخص کی بددلی کا باعث ہونا چاہیئے۔ جو صرف اسی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اور کتابوں کا نہیں۔

سب میں بہترین صورت ان دونوں کے درمیان کی ہے جو میں نے اختیار کی ہے اور وہ یہ کہ جس بحث کے بیان کا کسی خاص مقام پر محل ہو اور میں اُسے کبھی اسکے پہلے نہایت تفصیل سے لکھ چکا ہوں تو اس مقام پر اصل مطالب اور اپنا نقطۂ نظر بقدر ضروری استدلال کے ساتھ تحریر کر دوں اور اسکی تفصیل و تشریح کے لئے پہلی کتاب کا حوالہ دوں جہاں وہ بسط و توضیح کے ساتھ مندرج ہے۔

یہ صورت دونوں قسم کے لوگوں کے لئے یعنی وہ جو پہلی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں اور جو نہیں، مفید ثابت ہو سکتی ہے اور بددلی کا باعث نہیں ہوگی۔

مثلاً اسی تحریف کے مسئلہ میں ایک صورت تو یہ تھی کہ میں اس بحث تک پہونچتے ہی

لکھدیتا کہ میں اس مسئلہ پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا اسلئے کہ میں اُسے تفصیل سے اپنی فلاں کتاب میں لکھ چکا ہوں اس طرح یہ جزو حقیقۃً بالکل ہی ناقص رہجاتا اور یہ کتاب اس اعتبار سے ناکارہ ہی رہتی۔

دوسری صورت یہ ہی کہ میں پورا "تحریف قرآن کی حقیقت" کا رسالہ اس مقام پر نقل کردوں یہ اصول تصنیف و تالیف کے بالکل خلاف ہی اور اُن لوگوں کے لئے جو "تحریف قرآن کی حقیقت" کا مطالعہ کرچکے ہیں اس حصہ کو دریا بُردِ دانش سپرد ہونیکا مستحق قرار دیتا ہے۔

لیکن میں نے ان دونوں باتوں کے خلاف یہ کیا کہ اصل بحث کو مختصر طور سے یہاں درج کردیا۔ وہ دلائل لکھدیئے جن کی بنا پر میرے نقطۂ نظر سے قرآن مجید مستند و معتبر حیثیت رکھتا ہے اس نسبت کا دفعیہ کردیا جو ہمارے خلاف دیجاتی ہے کہ ہم قرآن موجود کو معتبر نہیں سمجھتے اور اپنے عقیدہ کا اظہار کردیا کہ میں اس قرآن کو بالکل صحیح جانتا اور مانتا اور یقین رکھتا ہوں اور اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ میں نے یہاں لکھ دیا جس سے مطالعہ کرنیوالا ایک نتیجہ تک پہونچ سکتا ہے لیکن اس سب کو یہاں میں نے مختصر لکھا تفصیل کے لئے "تحریف قرآن کی حقیقت" رسالہ کا حوالہ دیدیا۔

اب جس شخص کا ذوق تحقیق پورے تفصیلات پر مطلع ہونا چاہے اُسکے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے کہ وہ رسالۂ مذکورہ کو حاصل کرے اور اُس کا مطالعہ کرے۔

اور جس شخص کا مذاق اس سلسلہ میں قناعت پسند ہو (جیسا کہ اکثر اصحاب کا قاعدہ ہی) تو وہ اتنے ہی پر جو اس کتاب میں درج ہے اکتفا کرلیگا اور اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت نہ سمجھے گا۔

میں نے اُس رسالہ میں اُن تمام علماء کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے قرآن مجید میں

کسی قسم کے بھی نقص وزیادتی واقع ہونے کا انکار کیا ہے اور پھر میں نے اُن روایات پر نظر ڈالی ہے جن سے تحریف قرآن کے پتہ چلنے کا خیال کیا جاتا ہے۔ اور میں نے اُن روایات کے متعلق کافی قلح کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے اکثر روایات تحریف معنوی کی دلیل ہیں اور اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جو جزو بطور تفسیر و تشریح تھا وہ حذف ہوا ہے اور اصل قرآن میں سے کچھ ساقط نہیں کیا گیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت بلکہ شاید دوسری مرتبہ کے بھی طباعت کے بعد عراق کے مشہور علمی مجاہد متکلم روزگار آیۃ اللہ الشیخ محمد جواد البلاغی طاب ثراہ کی تفسیر آلاء الرحمٰن فی تفسیر القرآن" چھپ کر ہندوستان آئی اور اس میں میں نے دیکھا کہ تحریف کے باب میں بالکل وہی مسلک اختیار کیا گیا ہے جو میں نے اپنے رسالہ میں اختیار کیا تھا یہاں تک کہ اس مسلک کے ثبوت میں جو دلائل و شواہد پیش کیے گئے وہ بھی تقریباً وہی تھے کہ جو میں نے اپنے رسالہ میں درج کیے تھے۔

میری کتاب کی اشاعت کے موقع پر موصوف کی کتاب ملک شام میں طبع ہو رہی تھی اور یہ اجزاء تفسیر کے یقیناً مطبع میں اُس وقت چھپ چکے ہیں جب میری کتاب لکھی گئی ہے۔ اور یہاں وہ اجزاء پوری تفسیر کے اختتام کے بعد پہونچے ہیں اس وقت جب میری کتاب کا دوسرا اڈیشن بھی طبع ہو چکا تھا۔ ایسے توارد فکر کی نظیریں بھی دنیا میں کم پائی جاتی ہیں، مجھ کو اس بات کی انتہائی خوشی ہوئی کہ میرے کم حقیقت پریشان خیالات ایک ایسے محقق وحید روزگار متکلم کے نتیجۂ فکر سے متحد ثابت ہوئے۔ اور اسی خوشی میں میں نے ممدوح کی خدمت میں اپنے رسالہ کو بھیجتے ہوئے تحریر کیا کہ یہ آپ کے فیض روحانی اور توجہ باطنی کا اثر تھا جس نے میرے قلم سے بھی بالکل وہی مطالب نکلوا دیے جو جناب کی تفسیر میں نظر آ رہے ہیں۔

موصوف نے اسکے جواب میں اپنی شفقت و مرحمت کا اظہار کیا۔ خدا اُن کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اس دور آخر میں اُن کا سا کلم محقق مجاہد قلمی دور فلک نے پیدا نہیں کیا۔

میں اپنی اس تفسیر میں چاہتا ہوں کہ اس بحث کے متعلق ممدوح کے افادات عالیہ کو زینت دہ قرطاس بناؤں تاکہ ایک طرف اس کتاب میں یہ بحث تشنہ نہ رہ جائے۔ دوسری طرف ایک ایسے محقق کے کلمات سے عام افراد کو مستفید ہونے کا موقع ملے تیسری طرف جو کچھ میں نے اپنے رسالہ میں لکھا تھا اُسکی پوری پوری تائید ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ صرف میرے ذاتی خیالات نہیں ہیں بلکہ اکابر محققین اس خیال میں مجھ سے متفق اور میرے ہم آواز ہیں۔

ملاحظہ ہو "آلاء الرحمن فی تفسیر القرآن" ج ۱ مطبوعہ مطبع "العرفان" صیدا ص۲۵-۲۹

(قول الامامية بعدم النقيصة فی القرآن)

لا يخفى ان شيخ المحدثين والمعروف بالاعتناء بما يروی وهو الصدوق طاب ثراه قال فی كتاب الاعتقاد اعتقادنا ان القرآن الذی انزل الله على نبيه هو ما بين الدفتين وليس باكثر من ذلك ومن نسب الينا انا نقول انه اكثر من ذلك فهو كاذب انتهى وحمل الروايات الواردة فی النقصان على وجوه اخر - وفی اواخر فصل الخطاب عن كتاب المقالات للشيخ

(فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی)

واضح ہو کہ طبقہ محدثین کے اُستاد کل جنکی مشغولی احادیث کے نقل کرنے میں شہرہ آفاق ہے یعنی جناب صدوق "وہ کتاب الاعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں" ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جسے خداوند عالم نے اپنے نبی پر نازل فرمایا وہ یہی ہے کہ جو دونوں دفتیوں کے درمیان موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں تھا اور جو شخص ہماری طرف نسبت دے کہ ہم اصلی قرآن کو اس سے زیادہ مانتے ہیں وہ بالکل جھوٹا ہے، موصوف نے اُن تمام روایات کو جو کمی کے بارے میں وارد ہوئی

المفید قدس سرہ انہ قال جماعۃ من
اھل الامامۃ انہ (ای القرآن) لم ینقص
من کلمۃ ولا من آیۃ ولا من سورۃ ولکن
حذف ما کان مثبتا فی مصحف
امیر المومنین ع من تاویلہ وتفسیر
معانیہ علی حقیقۃ تنزیلہ وعن
السید المرتضی قدس سرہ
قولھم بعدم النقیصۃ وان من
خالف فی ذلک من الامامیۃ
والحشویۃ لا یعتد بخلافھم فان
الخلاف فی ذلک مضاف الی قوم من
اصحاب الحدیث نقلوا اخبارا ضعیفۃ
ظنوا صحتھا. وفی اول التبیان
للشیخ الطوسی قدہ اما الکلام فی
زیادتہ ونقصہ فمما لا یلیق بہ
ایضا لان الزیادۃ فیہ مجمع علی
بطلانھا والنقصان فالظاھر ایضا
من مذھب المسلمین خلافہ و
ھو الالیق بالصحیح من مذھبنا وھو

ہیں دوسرے معانی پر محمول کیا ہے فصل الخطاب کے
آخری حصہ میں شیخ مفیدؒ کی کتاب مقالات سے یہ عبارت
درج کی ہے کہ فرقۂ امامیہ میں سے بہت سے لوگ یہ
کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک کلمہ ایک آیت اور
ایک حرف کی بھی کمی نہیں ہوئی ہے. بیشک جناب امیرؑ
کے جمع کردہ قرآن میں جو تاویل اور تفسیر اسکے معانی
کی اسکے اصلی شان نزول کے موافق ہوئی تھی
وہ کم کردی گئی ہے اور جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ
کا بھی قول ہے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے اور
معدودے چند افراد جو فرقۂ امامیہ اور حشویہ میں سے
اسکے خلاف قائل ہو گئے ہیں وہ توجہ کے بھی مستحق
نہیں ہیں۔ اسکے خلاف جو قول ہے وہ اخباریوں
میں سے کچھ افراد کی طرف منسوب ہے جنھوں نے کچھ
ضعیف روایتوں کو صحیح سمجھ کر یہ قول اختیار
کر لیا ہے شیخ طوسیؒ کی کتاب تفسیر تبیان کے
شروع میں ہے کہ قرآن مجید کے متعلق زیادتی
یا کمی کا سوال اٹھایا جانا بھی مناسب نہیں ہے اسلئے
کہ زیادتی کے نہونے پر تو اجماع ہے اور کمی اسکے
متعلق بھی تمام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ

الذی نصرہ المرتضیٰ وھو الظاھر فی
الروایات غیر انہ رویت روایات
کثیرۃ من جھۃ الخاصۃ والعامۃ
بنقصان کثیر من ای القرآن ونقل
شیئ منہ من موضع الی موضع طریقھا
الاحاد التی لا توجب علما ولا عملا و
الاولی الاعراض عنھا انتھی وتبعد علی
ذلک فی مجمع البیان وفی کشف الغطا
فی کتاب القرآن المبحث الثامن فی
نقصہ لاریب انہ محفوظ من النقصان
بحفظ الملک الدیان کما دل علیہ
صریح القرآن واجماع العلماء
فی کل زمان ولا عبرۃ بالنادر
وما ورد من اخبار النقص تمنع البدیھۃ
من العمل بظاھرھا الی ان قال
فلا بد من تاویلھا باحد وجوہ وعن
الشیخ البھائی وایضا اختلفوا فی
وقوع الزیادۃ والنقصان فیہ
والصحیح ان القرآن العظیم محفوظ

واقع نہیں ہوئی اور خصوصیت سے ہمارے مذہب
میں بھی صحیح قول یہی ہے اور اسی کی حمایت جناب
سید مرتضیٰؒ نے کی ہے اور احادیث سے بھی
یہی ظاہر ہے، بیشک شیعہ اور سنی طرق سے بہت سی
روایتیں ایسی وارد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے
کہ بہت سی آیتیں قرآن کی کم ہو گئیں اور بعض
اپنی جگہ سے ہٹکر دوسری جگہ پہونچ گئیں لیکن
یہ روایتیں بطریق آحاد منقول ہیں جن پر نہ
علم کی بنیاد ہو سکتی ہے نہ عمل کی اور بہتر یہ ہے کہ
ان روایات سے کنارہ کشی ہی اختیار کی جائے"
تفسیر مجمع البیان میں بھی بالکل اسی سے اتفاق
کیا ہے اور کشف الغطا کتاب قرآن میں ہے کہ
"آٹھواں مبحث نقص قرآن کے بارے میں یقیناً
قرآن مجید نقص کے عیب سے محفوظ ہے خدا کی
غیبی حفاظت کے ساتھ جس کے اوپر صریحی قرآن
کی آیت دلالت کر رہی ہے اور ہر زمانہ کے علماء
کا اجماع بھی اسی کے موافق ہے اور شاذ و نادر بعض
لوگوں کا قول قابل توجہ نہیں ہے۔ اور جو روایات
ایسی ہیں کہ ان سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے

عن ذلك زيادة كان او نقصانا ويدل عليه قوله تعالى "وانا له لحافظون" وما اشتهر بين الناس من اسقاط اسم امير المومنين ع منه فی بعض المواضع مثل قوله تعالیٰ یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک فی علیؑ و غیر ذلک فهو غیر معتبر عند العلماء و عن المقدس البغدادی فی شرح الوافیة وانما الکلام فی النقیصة والمعروف بین اصحابنا حتی حکی علیه الاجماع عدم النقیصة ایضا وعنه ایضا عن الشیخ علی بن عبد العالیؒ انه صنف فی نفی النقیصة رسالة مستقلة وذکر کلام الصدوق المتقدم ثم اعترض بما یدل علی النقیصة من الاحادیث واجاب بان الحدیث اذا جاء علی خلاف الدلیل من الکتاب والسنة المتواترة

ضرورت مذہب اُن کے ظاہر پر عمل سے مانع ہے لہٰذا کسی نہ کسی طرح اُنکی تاویل کرنا چاہیے شیخ بہائیؒ کا قول ہے کہ زیادتی اور نقصان کے متعلق اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ قرآن ہر طرح کی زیادتی و کمی سے محفوظ ہے اور قول خداوند عالم کہ "ہم اسکی حفاظت کرنیوالے ہیں"۔ اسکی دلیل ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ امیر المومنین کا نام تھا وہ حذف ہوگیا جیسے یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک فی علی وغیرہ یہ بالکل غیر معتبر ہے" اور سید محسن بغدادی نے شرح وافیہ میں لکھا ہے کہ ہمارے علماء میں جو قول مشہور ہے اور جس پر اجماع کا دعویٰ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ کمی واقع نہیں ہوئی اور محقق ثانی علی بن عبد العالی کرکی نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی واقع نہونے کی متعلق تحریر فرمایا ہے پھر انھوں نے صدوق کا کلام ذکر کیا ہے اور بطور اعتراض ان احادیث کا حوالہ دیتے ہوے جن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے جواب دیا ہے کہ حدیث جب قرآن اور احادیث متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو اور اسکی تاویل ممکن نہ ہو تو اُسے ساقط کرنا چاہیے۔

ولا الاجماع ولم يمكن تاويله ولا حمله
على بعض الوجوه وجب طرحه.
هذا وان المحدث المعاصر جهد في
كتاب فصل الخطاب في جمع الروايات
التي استدل بها على النقيصة و
كثر اعداد مسانيدها باعداد
المراسيل عن الائمة عليهم السلام
في الكتب كمراسيل العياشي وفرات
وغيرها مع ان المتتبع المحقق يجزم
بان هذه المراسيل ماخوذة من
تلك المسانيد و في جملتها ما ورد
من الروايات ما لا يتيسر احتمال
صدقها ومنها ما هو مختلف باختلاف
يؤل به الى التنافي والتعارض وهذا
المختصر لا يسع بيان النحوين الاخرين هذا
مع ان القسم الوافر من الروايات
ترجع اسانيده الى بضعة انفار قد
وصف علماء الرجال كلا منهم اما
بانه ضعيف الحديث فاسد المذهب

ان تمام علماء کے برخلاف ہمارے ہمعصر محدث
افاضل نوری نے فصل الخطاب میں کوشش
کے ساتھ اُن روایات کو جمع کیا ہے جن سے وہ
قرآن میں کمی واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں
اور ان روایات کے اسناد میں کثرت پیدا کی ہے
اُن روایتوں سے کہ جو مرسل طریقہ پر یعنی بغیر
ذکر سند کے تفسیر عیاشی و فرات ابن ابراہیم
وغیرہ میں مذکور ہیں حالانکہ جو شخص جستجو کرے اور
ذوق تحقیق رکھتا ہو وہ یقین کریگا کہ یہ مرسل
روایتیں اُنہی چند مسند روایتوں سے ماخوذ
ہیں۔ اور پھر جو روایتیں اس سلسلہ میں ذکر
ہوئی ہیں اُن میں سے بعض تو ایسی ہیں جو کسی
طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتیں اور بعض آپس میں
اتنا اختلاف رکھتی ہیں کہ خود ہی متعارض
ہو جاتی ہیں اس مختصر کتاب میں یہ گنجائش
نہیں ہے کہ ان آخری دونوں قسموں کو
توضیح کے ساتھ لکھا جائے۔ اس کے علاوہ
اکثر مسند روایتیں جو ہیں انکی سندیں چند
اشخاص تک منتہی ہوتی ہیں جن میں سے

مجفوّ الرّوایۃ واماّ بانہ مضطرب
الحدیث والمذہب یعرف حدیثہ
وینکر ویروی عن الضعفآء واماّ
بانہ کذّاب متّہم لا استحلّ ان اروی
من تفسیرہ حدیثاً واحداً اوانّہ
معروف بالوقف واشدّ النّاس
عداوۃ للرّضاؑ واماّ بانہ کان غالیاً
کذّاباً واماّ بانہ ضعیف لا یلتفت
الیہ ولا یعوّل علیہ ومن الکذابین
واماّ بانّہ فاسد الروایۃ یرمی
بالغلوّ ومن الواضح انّ امثال ھٰؤلآء
لا تجدی کثرتھم شیئاً ولو تسامحنا
بالاعتنآء بروایاتھم فی مثل ھٰذا
المقام الکبیر لوجب من دلالۃ
الرّوایات المتعددۃ ان نتنزلھا
علی انّ مضامینھا تفسیر للآیات
او تاویل او بیان لما یعلم یقیناً
شمول عمومھا لھم لانہ اظہر
الافراد واحقھا بحکم العام او ماکان

کسی کے متعلق علمائے رجال لکھتے ہیں کہ وہ
لا مذہب شخص ہے، اُسکی حدیثیں کمزور اور روایتیں
متروک ہیں کسی کے متعلق یہ کہ اُسکے احادیث
اور مذہب دونوں مشکوک ہیں، اُسکی حدیث
کبھی قابل قبول ہوتی ہے اور کبھی ناقابل قبول
اور وہ کمزور راویوں سے احادیث کو نقل کرتا
ہے اور کسی کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ بہت
زیادہ غلط بیان اور ناقابل اعتماد ہے۔
میں جائز نہیں سمجھتا کہ اُس کی تفسیر سے ایک
روایت بھی نقل کروں اور یہ کہ وہ واقفی ہونے
میں مشہور ہے اور امام رضاؑ سے سخت عداوت
رکھتا تھا اور کبھی یہ کہ وہ غالی اور سخت دروغ
گو تھا اور کبھی یہ کہ وہ کمزور تھا اور نظر اُٹھا کے
دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہے اور اُس پر بھروسا
نہیں تھا اور وہ انتہائی غلط بیان راویوں
میں سے ہے اور کبھی یہ کہ اُسکی روایتیں بالکل خراب
ہوتی ہیں۔ اُسکی غلو کی طرف نسبت دی گئی ہے
ظاہر ہے کہ ایسے راویوں کی تعداد کی کثرت کوئی
فائدہ نہیں دے سکتی اور اگر ہم چشم پوشی کر کے اتنے

مراد بخصوصه و بالنصّ علیه فی
ضمن العموم عند التنزیل و ما کان
هو المورد للنزول او ما کان هو المراد
من اللفظ المبهم و علی احد الوجوه
الثلاثة الاخیر یحمل ما ورد فیها انه
تنزیل و انّه نزل به جبرئیل کما
یشهد به نفس الجمع بین الرّوایات
کما یحمل التحریف فیها علی تحریف
المعنی و یشهد لذلک مکاتبة
ابی جعفر علیه السلام لسعد الخیر[۱]
کما فی روضة الکافی ففیها و کان من
نبذهم الکتاب ان اقاموا حروفه
و حرّفوا حدوده و کما یحمل ما فیها
من انه کان فی مصحف امیر المومنین ع
او ابن مسعود و ینزل علی انّه کان
فیه بعنوان التفسیر و التاویل و ممّا
یشهد لذلک قول امیر المومنین ع
للزّندیق و لقد جئتهم بالکتاب
کملا مشتملا علی التنزیل و التاویل

بڑے اہم موقع پر ان لوگوں کی روایتوں کو
قبول بھی کر لیں تو دوسری متعدد روایتوں
کی بنا پر ہم کو ان روایات کے معنی میں یہ کہنا
چاہیئے کہ جو فقرات ان میں حذف شدہ
بتلائے گئے ہیں وہ تفسیر کی حیثیت رکھتے
تھے یا تاویل تھے یا بیان تھے اُس فرد کا جو
یقیناً اُس عموم کے تحت میں داخل ہے اپنے
اظہر افراد اور مستحق ترین فرد ہونے کی جہت سے
حکم عام کے ساتھ یا اُس فرد کا جو عموم کے ضمن
میں تنزیل قرآن کے وقت خصوصیت سے
ملحوظ تھی یا اصل جس کے بارے میں آیت نازل
ہوئی تھی یا جو مبہم الفاظ (مائے موصولہ وغیرہ)
سے مراد اصلی تھے۔ انہی آخری تین پہلوؤں
پر اور محمول ہونا چاہیئے اُن روایات کو
جن میں لکھا ہے کہ یہ تنزیل ہے اور اس کو جبرئیل
لیکر آئے تھے اور اس معنی کی دلیل خود ان روایات
میں جمع کا عمل میں لانا ہے اور تحریف سے مراد
تحریف معنوی ہے جس کی شاہد امام محمد باقر ع[۱] کی
وہ تحریر ہے جو آپ نے سعد خیر کو تحریر فرمائی ہے اور

وممّا اشرنا اليه من الرّوايات ان
المحدث المعاصر اورد فی روايات
سورة المعارج اربع روايات ذكرت
ان كلمة (بولاية علی) مثبتة فی
مصحف فاطمة وهكذا هی فی
مصحف فاطمةؑ ولا يخفی ان مصحفها
عليها السلام انما هو كتاب تحديث
باسرار العلم كما يعرف ذلك
من عدة روايات فی اصول الكافی
فی باب الصحيفة والمصحف والجامعة
وفيها قول الصادقؑ ما فيه من
قرانكم حرف واحد وما ازعم ان
فيه قرانا كما فی الصحيح والحسن
ومنها ما فی الكافی فی باب ان الائمة
عليهم السلام شهداء علی الناس فی
صحيحة بريد عن ابی جعفرؑ ورواية
عن ابی عبد اللهؑ من قولهما فی
قوله تعالی وجعلناكم امة
وسطا عن الامة الوسطی فی شرحه

جو کافی کی کتاب روضہ میں مذکور ہی، اُس میں لکھا
ہی کہ اُن لوگوں کی طرف سے کتاب خدا کا پس پشت
ڈالدینا یہ تھا کہ انھوں نے اُسکے مکتوبی الفاظ کو
تو قائم رکھا اور اُسکی جو مقررہ حدیں تھیں اُن میں
تحریف یعنی تبدیلی کر دی۔ اسی طرح وہ روایات
جن میں یہ ہی کہ مصحف جناب امیرؑ یا مصحف ابن
مسعود میں اس طرح لکھا ہے اُس سے مراد یہی
ہی کہ بطور تفسیر وتاویل تحریر تھا اسکی شہادت
دینے کے لئے موجود ہی جناب امیرؑ کا قول جو آپنے
زندیق سے فرمایا ہی، میں اُنکے پاس لایا پوری
کتاب جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھی"
اُن روایات میں سے جن کی نسبت ہم نے
اشارۃً تحریر کیا یہ ہی کہ فاضل معاصر (محدث
نوری) نے چار روایتیں درج کی ہیں جنھیں
یہ ہی کہ "بولایۃ علی" کا فقرہ مصحف حضرت فاطمہؑ
میں تحریر تھا کسی میں ہی کہ وہ مصحف فاطمہؑ
میں یونہی تھا اور واضح ہونا چاہیئے کہ جناب
فاطمہؑ کا مصحف قرآن نہیں تھا بلکہ وہ ایک
کتاب تھی جسمیں علمی رموز واسرار کا تذکرہ تھا

عن امیر المومنین علیہ السّلام
ونحن الّذین قال اللہ وجعلنا کم
امّۃ وسطا اذن فما روی مرسلا
فی تفسیر النعمانی وسعد من ان
الاٰیۃ ایمّۃ وسطا لابدّ من
حملہ علی التفسیر وان التحریف
انما ھو للمعنی ومنہا کما رواہ
فی الکافی فی باب ان الائمّۃ
ھم الھداۃ عن الفضیل سألت
اباعبد اللہؑ عن قول اللہ تعالیٰ
ولکلّ قوم ھاد فقال کل امام ھو
ھاد للقرن الّذی ھو فیھم وروایۃ
برید عن ابی جعفرؑ فی قولہ تعالیٰ
انما انت منذر ولکل قوم ھاد فقال
رسول اللہ المنذر ولکل زمان
منّا ھاد یھدیھم الی ماجاء بہ النبیؐ
والھداۃ من بعدہ علیؑ ثم الاوصیاء
واحد ابعد واحد ونحوھا روایۃ
ابی بصیر عن ابی عبداللہؑ وروایۃ

جیساکہ اصول کافی کی متعدد روایتوں سے جو
صحیفہ اور مصحف اور جامعہ کے باب میں درج
ہیں ثابت ہوتا ہے اُن میں امام جعفر صادقؑ کا
یہ قول ہے کہ اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف
بھی نہیں ہے، کہیں یہ ہے کہ میں نہیں کہتا ہوں
کہ اس میں قرآن ہے جیساکہ صحیح و حسن حدیثوں
میں وارد ہوا ہے اسکے علاوہ کافی میں اس باب میں
کہ ائمہ معصومین لوگوں کے گواہ ہیں صحیح حدیث
برید کی امام محمد باقرؑ سے اور دوسری روایت
امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ان دونوں
حضرات نے اس آیت کے بارے میں کہ جعلنا کم
امّۃ وسطا فرمایا "امت وسطیٰ ہم ہیں" امیر المومنین
سے اسکی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ ہم وہ ہیں جن کے
بارے میں خدا نے فرمایا کہ "ہم نے تمکو امت وسطیٰ
قرار دیا" اب جو مرسل طور پر تفسیر نعمانی اور سعد میں
وارد ہے کہ آیت میں "ائمۃ وسطا ہے" اس کو تفسیر
ہی پر محمول کرنا چاہیئے اور یہ کہ معنی امّۃ وسطاً
کے ائمۃ وسطا تھے جس کو لوگوں نے بدل دیا۔
نیز کافی میں اس باب میں کہ ائمہ معصومین ہادی ہیں

عبد الرّحیم القصیر عن ابی جعفر
علیہ السلام ان رسول اللّٰہ المنذر
وعلیّ الھادی وبعضوبہا جاءت
روایات الجمہور مسندۃ عن طریق
ابی ھریرۃ وابی برزۃ وابن عباس و
طریق امیر المؤمنین وصحّحہ الحاکم
فی مستدرکہ . واذا احطت
خبرا بھذا انحل بروق لک التجاء
فصل الخطاب فی تلفیقہ وتکثیرہ
الی النقل عن بعض التفاسیر
المتأخرۃ وعن الدّاماد فی حاشیۃ
القبسات من قولھم ان الاحادیث
من طرقنا وطرقھم متظافرۃ بانہ
کان التنزیل انّما انت منذر
لعباد وعلیّ لکل قوم ھاد انتھیٰ ھذا
الشعر الّذی ینشدہ المدّاحون
ولا یرضی العارف باللغۃ العربیۃ
ان ینسب الیہ نظمہ ولا اظنک
تجدہ من طرقنا وطرق اھل السنۃ

در راہنما ہیں۔ فضیل کی روایت ہے کہ میں نے امام
جعفر صادقؑ سے اس آیت کے معنی دریافت کیے
کہ لکل قوم ھاد "ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے"؟
حضرتؑ نے فرمایا "ہر امام رہنما ہے اس طبقہ کا
جس میں وہ ہے" اور بریدہ کی روایت ہے امام
محمد باقرؑ سے اسی آیت کی تفسیر میں کہ رسالتمآبؐ
منذر (عذابِ الٰہی سے خوف دلانے والے) ہیں
اور ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک راہنما ہے جو
رسالتمآبؐ کے احکام کی طرف ہدایت کرتا ہے
اور راہنما جو رسالتمآبؐ کے بعد ہوئے ہیں وہ
جنابِ امیر ہیں اور ان کے بعد کے اوصیاء یکے بعد
دیگرے اور اسی کے مثل ہے روایت ابو بصیر کی
امام جعفر صادقؑ سے اور روایت عبدالرحیم قصیر
کی امام محمد باقرؑ سے اور ان سب میں یہی ہے کہ
رسالتمآبؐ منذر ہیں اور علی بن ابی طالبؑ ہادی
اور اس مضمون کی روایتیں اہلسنت کے یہاں بھی
ہیں ابوہریرہ اور ابو برزہ اور ابن عباس
اور نیز خود امیر المومنینؑ کے اسناد سے اور حاکم
نے مستدرک میں اس روایت کو صحیح السند قرار دیا ہے

غیر ما سمعتہ اولاً و ہو غیر
ما نقلہ فاعتبروا ومنہا روایۃ الکافی
عن ابی حمزۃ عن ابی جعفر علیہ السلام
قال قولہ عز وجل ربنا ما کنا
مشرکین یعنون بولایۃ علیؑ وھٰذا
صریح فی کونہ تفسیرا فہی حاکمۃ
ببیانہا علی ضعیفتی ابی بصیر فی ظہورہا
بان لفظ بولایۃ علیؑ محذوف من الآیۃ
ویبری البیان من روایۃ ابی حمزۃ الی
امثال ذلک ومنہا روایۃ عمر بن خنظلۃ
عن ابی عبد اللہؑ فی قولہ تعالیٰ
فی سورۃ البقرۃ متاعا الی الحول غیر
اخراج مخرجات . ولا اظن الا انک
تقول ان الحاق الامام لکلمۃ مخرجات
انما ہو تفسیر للمراد من کلمۃ
اخراج لا بیان للنقیصۃ من القرآن
الکریم ولکن فصل الخطاب اوردہ
بعنوان البیان للنقیصۃ فاعتبروا
منہا صحیحۃ محمد بن مسلم عن

ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی
شخص پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے
فصل الخطاب کی اس کاوش کو جو انھوں نے
بعض متاخرین کی تفسیروں سے اور میر باقر
داماد کے حاشیۂ قبسات سے بعض روایتوں کے
درج کرنے میں اختیار کی ہے اور لکھا ہے کہ روایات
شیعہ اور سنّی دونوں طریقوں سے کثرت کیساتھ
ہیں کہ اصل آیت یوں تھی کہ انما انت منذر
لعباد و علی لکل قوم ھاد " تم بس بندوں کے
ڈرانے والے ہو اور علی ہر قوم کیلئے رہنما ہے" یہ شعر
ہے کہ جس کو قصیدہ خوان پڑھا کرتے ہیں اور کوئی
شخص جو عربی زبان سے واقف ہو وہ اس کو
گوارا نہ کریگا کہ اسکی طرف اس شعر کے نظم کرنے کی
نسبت دیجائے۔ اور طرق شیعہ و اہلسنت کا جو
حوالہ دیا گیا تو بے شک و شبہ ان طرق میں سوا
اسکے جو ہم نے سابقاً درج کیا اور کچھ نہیں ہے
اور وہ اسکے خلاف ہے جو محدث نوری نقل کر رہے ہیں

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

نیز کافی کی روایت ہے ابو حمزہ سے امام محمد باقرؑ

ابی عبد اللہؑ کما فی الکافی فی اوّل
باب منع الزکوٰۃ وفیہا ثم قالؑ ھو قول
اللہ عزوجل سیطوّقون ما بخلوا بہ
یوم القیامۃ یعنی ما بخلوا بہ من
الزکوٰۃ فالرّوایۃ کالصریحۃ بان
لفظ من الزّکوٰۃ انّما ھو تفسیر من
الامام لا من القرآن فھی حاکمۃ
ببیانھا علی مرسلۃ ابن ابی عمیر
عمّن ذکرہ عن ابی عبد اللہؑ فی
قول اللہ عزوجل سیطوّقون ما
بخلوا بہ من الزکوٰۃ یوم القیامۃ
وصادفۃ لھا عن کونھا بیانا للنقیصۃ
ومنھا صحیحۃ ابی بصیر عن ابی
عبد اللہؑ کما فی الکافی فی باب
نصّ اللہ ورسولہ علی الائمۃ
واحدا بعد واحد وفیھا فقلت لہ
ان النّاس یقولون فما لہ لم
یسمّ علیّا واھل بیتہ فی کتاب
اللہ قال فقولوا لھم ان رسول اللہ

نے فرمایا کہ کفار کا قول ربنا ما کنا مشرکین
اس سے مراد ولایت علی بن ابیطالبؑ کا انکار
تھا۔ یہ الفاظ صراحۃً بتلا رہے ہیں کہ تفسیر کی
حیثیت سے ہیں، اس صراحت کے سبب سے توضیح ہو جائیگی
ابوبصیر کی ان دونوں ضعیف روایتوں کی جن سے
بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ بولایۃ علی کی لفظ قرآن
میں داخل تھی اور وہ حذف کر دی گئی ہے۔ عمر
بن حنظلہ کی روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے
سورہ بقرہ کی اس آیت میں کہ متاعا الی الحول
غیر اخراج آپنے فرمایا مخرجات۔ عبارت کو
دیکھتے ہوئے شبہہ بھی نہیں ہو سکتا سوائے اسکے
کہ یہ مخرجات کا فقرہ بطور تفسیر بیان ہوا ہے
یعنی اخراج کی لفظ سے مخرجات مراد ہے۔ نہ یہ کہ
یہ لفظ یہاں پر تھی اور وہ قرآن مجید سے کم کر دی گئی
ہے لیکن کتاب فصل الخطاب میں اس کو بطور بیان
نقصان درج کیا ہے۔ نیز ان روایات میں سے
محمد بن مسلم کی صحیح السند روایت ہے امام جعفر صادقؑ
سے جو کتاب کافی میں باب منع زکوٰۃ کے شروع
میں درج ہے اس میں ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا یہی

نزلت علیہ الصلوۃ ولم یسم اللہ
لھم ثلثا ولا اربعا حتی کان رسول
اللہؐ ھو الذی فسر لھم ذلک وکذا
قال فی الزکوۃ والحج ومقتضی الروایۃ
تصدیق الامامؑ لقول لناس ان
اللہ لم یسم علیا فی القران وان
التسمیۃ کانت من تفسیر رسول
اللہؐ فی حدیث من کنت مولاہ و
حدیث الثقلین ویشھد لذلک
ما رواہ فی الکافی ایضا فی ھذا
الباب بعد ذلک بیسیر فی صحیحۃ
الفضلاءؑ عن ابی جعفر علیہ السلام
وروایۃ ابی الجارود عنہ ایضا
وروایۃ ابی الدیلم عن ابی عبد اللہؑ
انھما تلوا فی مقام الاحتجاج وعدم
التقیۃ قولہ تعالی یا ایھا الرسول
بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم
تفعل فما بلغت رسالتہ ولم
یذکرا فی تلاوۃ الایۃ کلمۃ "فی علی"

مراد ہی اس ارشاد حضرت احدیت سے کہ ان لوگوں
کو طوق پہنائے جائینگے اُس شے کے جس کے
ساتھ انھوں نے بخل کیا ہے یعنی جو انھوں نے
بخل کیا ہی مال زکوۃ میں سے، یہ روایت بالکل
صراحت کیساتھ اس امر کو بتلاتی ہے، کہ من الزکوٰۃ
کی لفظ بطور تفسیر ہے جو امام نے بیان فرمائی
ہے نہ یہ کہ وہ جزو قرآن ہی۔ اس روایت کی
بصراحت شرح قرار پائیگی ابن ابی عمیر والی
مرسل روایت کی جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے
کہ قول باری تعالی ہی سیطوقون ما بخلوا بہ
من الزکوۃ یوم القیامۃ اور اس روایت کے معنی
بھی وہی ہونگے کہ ما بخلوا بہ سے مراد من الزکوٰۃ
ہی، نہ یہ کہ وہ قرآن کا جزو ہی اور کم کر دیا گیا ہی
نیز انھی روایات میں سے صحیحہ ابو بصیر ہی امام
جعفر صادقؑ سے جیسا کہ کافی میں باب "نص علی الائمۃ"
میں مذکور ہے اُس روایت میں ہی کہ ابو بصیر نے
عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے
حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا نام قرآن میں ذکر
کیوں نہ کر دیا حضرتؑ نے فرمایا ان لوگوں سے کہو کہ

وهذا ایدل علی ان ما روی فی ذکر
اسم علیؑ فی هذا المقام بل وفی غیرہ
انما هو تفسیر وبیان للمراد فی وحی القران
یکون التفسیر والبیان جاء بہ
جبرائیل من عند الله بعنوان الوحی
المطلق لا القران وما ینطق عن الهوی
ان هو الا وحی یوحی ومنها روایة
الفضیل عن ابی الحسن الماضیؑ فی
باب النکت من التنزیل فی الولایة
من الکافی قال قلت هذا الذی
کنتم به تکذبون قال یعنی امیر
المؤمنینؑ قلت تنزیل قال نعم
فانہ ذکر امیر المؤمنینؑ بقولہ
یعنی بعنوان التفسیر وبیان المراد
والمشار الیه فی قوله تعالیٰ هذا
فقولہ فی الجواب نعم دلیل علی ان
ما کان مرادا بعینه فی وحی القران
یسمونه علیهم السلام تنزیلا
فتکون هذه الروایة وامثالها

رسالتمآبؐ پر قرآن میں یہ نازل ہوا کہ نماز واجب ہے،
لیکن خدا نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ مغرب کی تین
رکعتیں ہیں اور عشا کی چار رکعت یہانتک کہ رسالتمآبؐ
وہ تھے جنھوں نے لوگوں کے سامنے اسکی تفسیر کرکے
بتلایا اور اسی طرح زکوٰۃ و حج کے بارے میں قرآن میں
اجمال سے کام لیا اور رسولؐ نے تفصیل بتلائی
اس روایت سے ظاہر ہے کہ امام نے لوگوں کے
اس قول کو صحیح قرار دیا کہ قرآن مجید میں امیر المومنینؑ
کا نام صراحۃً مذکور نہیں ہے۔ اور نام جو بتلایا گیا ہے
وہ رسالتمآبؐ کی طرف سے بطور تفسیر حدیث من کنت
مولاہ اور حدیث ثقلین وغیرہ میں وارد ہوا ہے۔
اسکی گواہ وہ روایت بھی ہے جو کافی میں اس کے
تھوڑی دور بعد صحیحہ فضلا میں وارد ہے۔ امام محمد باقرؑ
سے اور ابو الجارود کی روایت حضرت سے اور ابو
الدیلم کی روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے
کہ ان دونوں بزرگوں نے مقام استدلال میں اپنے
اصحاب کے سامنے جبکہ تقیہ کا موقع بھی نہ تھا یا ایہا
الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و
ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ کی تلاوت فرمائی

قاطعۃ لتشبثات فصل الخطاب بما
حشدہ من الروایات التی عرفت
حالہا اجمالاً والی ما ذکرناہ وغیرہ
یشیر ما نقلناہ من کلمات العلماء
الاعلام قدست اسرارہم فان
قیل ان ھٰذہ الروایۃ ضعیفۃ
وکذا جملۃ من الروایات المتقدمۃ
قلنا ان جل ما حشدہ فصل الخطاب
من الروایات ھو مثل ھٰذہ الروایۃ
واشد منہا ضعفا کما اشرنا الیہ
فی وصف رواتہا علی ان ما ذکرناہ
من الصحاح فیہ کفایۃ لاولی
الالباب ۔

اور اسمیں "فی علی" کے فقرہ کا تذکرہ نہیں کیا۔
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں جو اس
مقام پر یا اور دوسرے مقامات پر فی علی کی لفظ
کا اضافہ ہے وہ بطور تفسیر بیان ہے جیسے جبریل
بطور وحی خدا کی طرف سے لائے ہیں لیکن جزو قرآن
نہیں ہے اور اس طرح کی وحی تو ہر کلام رسالتمآب کے
موافق تھی اسلئے کہ (قرآن میں موجود ہے) آپ اپنی
خواہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے جو کچھ آپ کا
کلام ہوتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے نازل
ہوتی ہے نیز ان روایات میں سے فضیل کی روایت
ہے امام رضاؑ سے کافی کے باب النکت من
التنزیل فی الولایۃ میں کہ راوی نے عرض کی
یہ آیت ھٰذا الذی کنتم بہ تکذبون

حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنینؑ راوی نے عرض کی یہ تنزیل ہے۔ فرمایا ہاں" اس روایت میں حضرت نے امیر المومنینؑ کا نام یعنی کی لفظ کے ساتھ ذکر کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جزو قرآن نہیں ہے بلکہ بیان مراد اور ہذا کی لفظ کے اصلی مشار الیہ کے طور پر ہے۔ اب سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے؟ اور حضرت کا فرمانا کہ "ہاں" اس سے صاف ظاہر ہے کہ تنزیل سے مراد جزو قرآن ہی نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ جو چیز قرآن کی کسی آیت میں خصوصیت کیساتھ مراد ہو اس کو وہ حضرات تنزیل کی لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ یہ روایت اور اسکی ایسی دوسری روایتیں تمام ان دلائل کو ختم کر دیتی ہیں جن سے

فصل الخطاب کے اوراق پُر کئے گئے ہیں اور اُن روایات کی حقیقت بھی اسکے پہلے کھولی جا چکی ہے اور انہی مطالب کی طرف جو ہم نے بیان کئے علمائے اعلام کے کلمات میں جو ہم نے نقل کئے تھے اشارہ موجود ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ روایت ضعیف السند ہے اور اسی طرح بعض اسکے قبل کی روایات۔ تو ہم جواب میں کہیں گے کہ اکثر روایتیں جنھیں فصل الخطاب نے نقل کیا ہے وہ ایسی ہی یا اس سے زیادہ ضعیف السند ہیں جیسا کہ اشارۃً ہم نے اُسکے روایات کے ضعف کا پتہ دیا۔ اسکے علاوہ ہم نے جو صحیح السند روایتیں پیش کی ہیں وہی کیا کم ہیں اور وہ اثبات مطالب کیلئے کافی ہیں اُن لوگوں کیلئے جو صاحبان عقل و تمیز ہوں"۔

یہ گرانقدر عبارت باوجود طویل ہونے کے ہم نے تمام و کمال اس لئے نقل کردی کہ اسمیں علاوہ اُن مطالب کے جو ہم نے اپنے رسالہ میں لکھے تھے بہت سے ایسے معلومات موجود ہیں جن تک ہماری نظر اُس رسالہ میں نہیں پہونچی تھی اور اس لئے اس کا پورا ہی نقل کرنا بحث کو پورے طور پر مکمل کرنے کے لئے انتہا سے زیادہ ضروری و لازم تھا۔

اب اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم بہت سے اُن پہلوؤں کے متعلق اپنا صحیح نقطۂ نظر پیش کر دینا چاہتے ہیں جن کا تعلق قرآن مجید کے متن الفاظ و کلمات کے ساتھ ہے اور جس کے صاف ہو جانے کی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں بہت شدید ضرورت ہے اسلئے کہ معانی و مطالب کے نکالنے میں اس سے زمین آسمان کا تفرقہ ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید کے آیات کلمات و الفاظ میں کمی و زیادتی کی بحث تو پورے طور سے واضح ہو چکی اور ہم نے صاف طور پر اظہار کر دیا کہ ہم اس قسم کی تحریف کے قائل نہیں ہیں۔ اسلئے سلسلۂ تفسیر میں جو کچھ بھی معانی و مطالب اخذ کئے جائینگے وہ آیات کے انھی الفاظ سے کہ جو مابین الدفتین موجود ہیں اور کسی ایسی روایت سے مدد نہ لی جائے گی جس میں کسی لفظ کا قرآن کے اندر

موجودہ الفاظ کے علاوہ بطور اضافہ یا تبدیلی موجود ہو یا مذکور ہو۔ بیشک وہ روایتیں اگر ایسی ہوں کہ ان میں وہ الفاظ بطور تفسیر وتشریح مذکور ہوئے ہیں جس کے نظائر سابقہ عبارت میں مذنظر ہیں ہوئے تو ایسے روایات کی طرف اُن کے اسناد کی جانچ کے ساتھ بطور تفسیر توجہ کی جاسکے گی۔

آیتوں کے الفاظ کی بجائے خود ترتیب یعنی تقدیم وتاخیر بھی یقیناً بجائے خود متواتر حیثیت رکھتی ہے اور اسی لئے ہر آیت مستقل طور سے حجت واجب العمل اور لازم الاتباع ہے اگر کہیں ہر آیت کی لفظوں میں اُلٹ پھیر اور تقدیم وتاخیر ہو گئی ہوتی تو پھر تو پورا کلام مشتبہ، مشکوک اور بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتا اسلئے کہ الفاظ کی ترتیب کے بدلنے سے زمین کا آسمان ہو جاتا اور معنی میں انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے تغیر وتبدّل کا کسی صورت سے قرآن مجید کے آیات میں امکان نہیں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آیات قرآن سے استدلال میں نظم الفاظ وترتیب کلمات سے بھی نتائج پیدا کئے جاسکتے ہیں اور معانی کے اخذ میں الفاظ کی ترتیب کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے جو تفسیر قرآن میں ایک بہت اہم جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

بے شک یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر ہر آیت سے مراد وہ پورا سلسلۂ کلام نہیں ہے جس پر گول گول نشان آیتوں کے بنے ہوئے ہیں کیونکہ یہ گول نشانات زمانۂ رسالتمآب میں نہ تھے نہ زمانۂ خلفائے سابقین میں بلکہ یہ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانہ میں دئیے گئے ہیں جن کے قطعی ومعتبر ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُن نشانوں کے درمیان ایسے متعدد اجزا ہوں جن میں سے ہر ایک مستقل آیت کی حیثیت رکھتا ہو لیکن نشان لگانے میں اُن سب کو دو نشانوں کے درمیان کر دیا گیا ہو جیسے آیت تطہیر متواتر احادیث اور روایات مفسرین ومورخین ومحدثین کی بنا پر جنمیں شک وشبہ کی گنجایش نہیں یہ مستقل آیت ہے اور خاص موقع پر نازل ہوئی ہے لیکن موجودہ نظم قرآنی

میں اسے ایک بڑی آیت کا جزو بنا دیا گیا ہے لہذا آیات کی تعیین میں سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔
کہیں پر تو خود معانی قطعی صورت سے پتہ دینگے کہ آیت پوری ہوئی یا نہیں۔ کہیں پر متواتر روایات و اخبار سے معلوم ہوگا کہ اصل آیت کہاں سے کہاں تک ہے، لیکن اکثر قرآن مجید کے آیات ایسے ہی ہیں کہ انکی صورت و شکل سے پتہ چل جاتا ہے کہ مستقل آیت کہاں سے کہاں تک ہے، اس سلسلہ میں وہ علامات جو قاریوں کی طرف سے قرار دئے گئے ہیں (ط۔ج۔م وغیرہ) یہ کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ نہ تفسیر و تشریح قرآن میں ان علامات سے کوئی استدلال کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔
قرآن مجید کے آیات یقیناً شان نزول کے مطابق مرتب نہیں ہوئے ہیں بلکہ اکثر سورتوں میں کچھ آیات مکی اور کچھ مدنی بعض مقام پر مدنی آیات مکی سے مقدم اور کہیں پر مخلوط ہو گئے ہیں اسلئے نظم آیات سے مستقل طور پر تفسیر قرآن اور معانی و مطالب کی تشریح میں کوئی مدد لینا صحیح نہ ہوگی۔
بے شک اگر کچھ آیات ایسے ہوں جن کے متعلق احادیث و روایات سے یقینی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہو کہ وہ بوقت واحد ایک ساتھ نازل ہوئے ہیں اور ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہیں جیسے اکثر چھوٹے سورے جو متعدد آیات پر مشتمل ہیں اور یکجا نازل ہوئے ہیں تو یہ متعدد آیات حقیقۃً اس اعتبار سے ایک آیت کے حکم میں ہونگے اور ان کے نظم و ترتیب سے اگر کوئی نتیجہ نکلتا ہو تو وہ معتبر سمجھا جائے گا۔
سور قصار جو آخری پارہ میں مندرج ہیں وہ ایسے ہی ہیں کہ ان کے اجزا بالکل معینہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی آتیں اسی ایک سورہ سے متعلق ہیں۔ اسکے علاوہ بعض سورے ایسے ہیں جنکی ساخت مخصوص حیثیت رکھتی ہے۔ انہیں بھی یہ شبہہ نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے سورہ کی آتیں ان میں مخلوط ہو گئی ہوں جیسے سورہ رحمٰن، سورہ دہر وغیرہ لیکن انکے علاوہ جو بڑے سورے ہیں ان کے آیات کے متعلق بالکل قطعی حیثیت سے

نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسی صورت سے نازل بھی ہوئی تھیں جس طرح اب موجود ہیں اسلئے ان کی ترتیب سے کوئی تفسیری نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔

بے شک دیگر احکام سوروں کے جیسے نماز میں انکی تلاوت کرنا، انکی تلاوت سے مخصوص ثواب کا قصد کرنا اجیر بننے یا نذر کرنے کی صورت میں کسی سورہ کا پڑھنا واجب ہونا یہ تمام امور وہ ہیں جو بوجہ امضائے ائمہ معصومینؑ اسی نظم قرآنی پر جو ہمارے سامنے موجود ہے مرتب ہیں اور بحیثیت حکم شرعی اس میں کوئی خلل نہیں ہے۔

بے شک سوروں کی ترتیب، اسکے توقیفی ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسی بنا پر صحابہ کرام کے مصاحف ترتیب سور میں باہم انتہائی اختلاف رکھتے تھے لہذا قرآن مجید کی تلاوت میں کسی طرح ضروری نہیں ہے کہ اسی ترتیب کے ساتھ سوروں کی تلاوت کی جائے جس طرح وہ قرآن مجید میں مندرج ہیں لہذا اگر کوئی شخص تلاوت قرآن کی نذر کرے یا باجرت تلاوت قرآن کرنیکا ذمہ دار ہو تو اس کو سوروں کے پڑھنے میں ترتیب کے ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر تمام سورے قرآن مجید کے پڑھ لے تو اُسے مجموع قرآن کی تلاوت کا ثواب حاصل ہو جائیگا اور اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیگا اگرچہ ترتیب ملحوظ نہ رکھی ہو۔

پاروں کی تقسیم تیس ۳۰ اجزاء کی طرف، اس کی بھی کوئی اصلیت ہمارے خیال میں شرعی و مذہبی حیثیت سے نہیں ہے اور نہ اسکے اوپر کسی حکم شرعی کی بنیاد ہے۔

بے شک اگر اجیر ہو ایک پارہ کی تلاوت کا یا نذر کرے تو چونکہ الفاظ معنی متعارف کے اوپر محمول ہوتے ہیں اس صورت میں اسی تقسیم کے لحاظ سے جو موجود ہے ایک پارہ پڑھنا ضروری ہوگا۔

یہی صورت رکوعات کی ہے کہ اصل شرع میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن بصورت اُجرت یا نذر بے شک اس کا پابند ہونا لازمی ہے۔

جمع قرآن کے سلسلہ میں یہاں تک تاریخی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ علاوہ اس قرآن مجید کے جو امیر المومنین ؑ نے جمع فرمایا تھا اور وہ آیات و سورہ دونوں کے لحاظ سے بالکل ترتیب نزول کے مطابق تھا موجودہ مصحف کی جمع آوری میں سب سے پہلی کوشش حضرت ابوبکر کی ہے جو آپ نے حضرت عمر کے مشورہ سے زید بن ثابت کے ذریعہ سے انجام دی اور اسکا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید کے آیات جدا گانہ سوروں میں یکجا حیثیت سے مجتمع ہو جائیں لیکن ان سوروں میں کوئی خاص ترتیب جس سے وہ تمام ایک مرتب کتاب کی شکل میں مدوّن ہو جائیں نہیں تھی یہ کام حضرت عثمان نے انجام دیا ہے اور آپ نے علاوہ اسکے کہ دوبارہ زید بن ثابت کے ذریعہ سے آیات قرآن کو سوروں کے تحت میں جمع کر کے اُس کا مقابلہ حضرت ابوبکر والے صحیفوں کے ساتھ کرایا پھر اُن تمام سوروں کو ترتیب دیکر ایک مصحف کی شکل میں مدوّن کر دیا۔ اس لحاظ سے قرآن مجید کے بطور کتاب مصحف کی صورت میں بصورت حاضرہ مدوّن ہونے کا سہرا جو کچھ ہے وہ حضرت عثمان کے سر ہے۔ اسی لئے حضرت ابوبکر کے جمع کردہ مجموعہ پر مصحف کا اطلاق کسی تاریخ سے اور کتاب سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُس زمانہ میں "صحف" کی لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وحدانی شکل میں نہیں بلکہ متفرق صحیفوں کی صورت میں تھے۔ کچھ مصحف بے شک دوسرے صحابہ کے بھی موجود تھے جیسے حضرت ابی بن کعب کا مصحف حضرت عبداللہ بن مسعود کا مصحف لیکن وہ سوروں کی ترتیب میں بالکل اس مصحف سے مختلف تھے۔ اسی طرح اکثر صحابہ کے پاس مختلف سورے اور آیتیں متفرق صحیفوں کی صورت میں بھی موجود تھیں حضرت عثمان نے اپنے جمع کردہ مصحف کو عام طور سے شائع کرنے کے لئے شاہانہ سطوت و جبروت کو کام میں لے کر تمام وہ مصحف اور صحیفے جلوا دئے جو دوسرے صحابہ کے پاس موجود تھے۔

یہ ایک خاص بنائے مخاصمت تھی جو حضرت عثمان کے ساتھ دوسرے اکابر صحابہ کو

پیدا ہوئی اور جس کے نتیجے افسوسناک صورتوں سے ظاہر ہوئے ۔

ہم اس بحث کا یہاں پر فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ حضرت عثمان کا یہ طرز عمل حق بجانب تھا یا نہیں؟ ہمیں تو صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن مجید کو جو بعض اکابر علماء "بیاض عثمانی" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اسکی نبیاد کس چیز پر ہے۔ یہ اسی ترتیب تالیف کی بنا پر ہے جو قرآنی سوروں کے مدون کرنے کے سلسلہ میں عمل میں آئی ہے ۔ یقیناً اس میں بہت کچھ نظر کی گنجائش ہے کہ آپنے جس طرح قرآن کی ترتیب قرار دی ہے وہ کس حد تک صحیح ہے اور کتنے فوائد ہیں کہ جو اس سے نظر انداز ہو گئے ہیں لیکن اس کا اثر قرآن مجید کے آیات کے استناد و اعتبار پر کچھ نہیں پڑتا ۔ کلام بہر حال کلام الٰہی ہے اور معجزہ رسول ہے اُس کا بصورت موجودہ جمع کرنا بیا اللہ کوئی بھی ہے اسلئے کہ دوسرے افراد نے جو حقیقۃً ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے اس مجموعہ کو تسلیم کرلیا اور اُس کو مستند و معتبر سمجھا ۔ اسکے بعد اسکے اعتبار و استناد میں کوئی شبہہ کرنا صحیح نہیں ہے ۔

ساتواں تبصرہ

قرّاءِ سبعہ اور سبعۃ احرف

قرآن مجید جب سے یکجا ہو کر مکتوبی صورت سے عالم اسلامی میں منتشر ہوا اُسکے حروف و الفاظ خصوصیات لفظی اور رسم الخط کی انتہائی حفاظت کی گئی اور اُسکے الفاظ کی صورت و ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہ سمجھی گئی جس کی بنا پر اُس کو وہ تواتر کا درجہ حاصل ہوا جو دنیا کی کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے ۔

اس پابندی و حفظ خصوصیات میں انتہائی اہتمام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض املائی غلطیاں جو پہلے کاتب سے اتفاقاً ہو گئی تھیں جیسے لا اذبحنہ کا درمیانی الف

اور اسی طرح لا او ضعوا میں وہ ابتک قائم رکھی گئیں اور کاتبان قرآن اس الف کو ترک نہیں کرتے۔

میں اتنی پابندی کو بلا ضرورت کہوں یا اس پر ہنسوں (جیسا کہ میں نے "تحریف قرآن کی حقیقت" میں اس سے کافی لطف لیا ہے) لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انضباط و اعتبار کی حیثیت کو اس طرز عمل سے کافی تقویت پہونچ گئی ہے۔

یورپ میں اسوقت ایسا کیا جاتا ہے کہ قلمی قدیم کتابوں کا بالکل فوٹو اتار کر شایع کر دیا جاتا ہے یا اگر اس کو نقل کراتے ہیں تو یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ جو لفظ جس طرح لکھی ہو اس کو اسی صورت سے نقل کیا جائے اسمیں اگر کہیں کتابت اور املائی غلطی بھی ہوتی ہے تو اس کو باقی رکھتے ہیں اور حاشیہ پر لکھدیتے ہیں کہ یہ لفظ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ بظاہر اس میں یہ غلطی ہے اور صحیح یوں ہے۔

اس طرح حفاظت اور اہتمام پر روشنی پڑتی ہے جس سے کتاب کے اعتبار کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ قرآن مجید جو دنیائے اسلام میں شایع و ذایع ہے یہ بالکل ہر حیثیت سے اسی کے ساتھ متحد ہے جسے حضرت عثمان نے جمع کراکے مختلف بلاد میں روانہ کیا تھا اور جبکہ ائمہ معصومین علیہم السلام نے اُس قرآن کا امضا کیا یعنی اُس کو سند قرار دیا کہ جو حضرت عثمان نے مشتہر کرایا تھا تو اس سے موجودہ قرآن مجید اپنے تمام خصوصیات لفظی کے ساتھ مستند اور معتبر قرار پایا جس پر عمل پیرا ہونے میں کوئی دغدغہ نہیں ہے۔

لیکن جس طرح موجودہ زمانہ میں قاری ہوتے ہیں کہ جو قرآن مجید کے پڑھنے میں صرف طریقۂ تلفظ اور ادائے حروف کے سلسلہ میں ایسی ایسی طبع آزمائیاں کرتے ہیں کہ لفظ کی آواز میں کچھ کا کچھ انقلاب ہو جاتا ہے اور سننے میں بہت بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح صدر اسلام میں بھی قاریان قرآن بہت سے تھے اور ہر ایک کا طریقۂ قرارت و ادائے حروف مختلف تھا مثلاً "ملک" کی لفظ کسی نے میم کو ذرا بڑھا کر کہدی "مالک" ہو گیا کسی نے میم کو ذرا ملا کر

کہا۔ لام کی حرکت پر کچھ بلندی کی طرف مائل کرتے ہوئے زور دیدیا "ملاّث" ہو گیا اس سے بہت سی قرأتیں پیدا ہو گئیں اور ہر ایک قاری کے جو شاگرد تھے وہ استاد کی پیروی میں اسی طریقۂ خاص کے پابند ہو گئے۔

ان قاریوں کی قرأتیں نہ رسول یا امام سے ماخوذ تھیں اور نہ انھیں مذہبی حیثیت سے کوئی سند حاصل تھی نہ انکی تعداد کچھ محدود تھی۔ بلکہ یہ کثیر التعداد اشخاص تھے اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہتے تھے۔ اپنے اپنے ذوق طبعی کی مناسبت سے ادائے الفاظ میں جدتیں کرتے تھے اور اسے مستقل قرأت کا درجہ دیدیتے تھے لیکن بالکل اسی طرح جیسے فقہا کی کثیر التعداد جماعت میں سے جب بادشاہ کی نظر توجہ اور عام خلقت کے میلان طبع نے چار آدمیوں کو خاص طور سے پسند کر لیا تو وہ چاروں بزرگ ائمہ اربعہ بنکر اس طرح مستند قرار پا گئے کہ انکے سوا اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور انہی چاروں اماموں کے فتاوے عرش الٰہی سے نازل شدہ قرار پا گئے اسی طرح ان تمام قاریان قرآن میں سے توجہ خاص نے سات آدمیوں کو منتخب کر کے انھیں "قراء سبعہ" کے نام سے تمام امت کا مرجع و ملاذ قرار دیا کہ انہی سات آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی قرأت کے مطابق پڑھنا جائز اور انکے علاوہ دوسری قرأتوں سے ناجائز ہے۔

ان ساتوں قرأتوں پر اتفاق حاصل ہو جانے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے واسطے مذہبی حیثیت سے بھی سند تلاش کی جانے لگی اور "جو ینده یابنده" سند ملی اور خوب ملی۔ رسالتمآبؐ کی ایک حدیث دستیاب ہوئی کہ نزل القرآن علی سبعۃ احرف "قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے" سات حرف یعنی کیا؟ ہاں یقیناً اسکے معنی ہیں سات قرأتیں" پھر سات قرأتیں کون سی ہو سکتی ہیں یقیناً وہی قراء سبعہ والی جو دوسری صدی ہجری کے اول اور آخر تک میں تدریجی حیثیت سے پیدا ہوتی رہی ہیں اور اپنے ذاتی اجتہادوں سے انھوں نے اپنی قرأتیں

مقرر کی ہیں۔ یہی وہ سات قراءتیں ہیں جن پر قرآن مجید نازل ہوا۔

پھر ان سات قراءتوں کی پابندی لازم کس طرح نہ ہوگی جبکہ خدائے آسمانی نے انہی ساتوں کو اپنے کلام کے لئے مخصوص طور سے نازل فرمایا ہے اور اتارا ہے۔

اسکے علاوہ ان قراءتوں کے تواتر کا دعویٰ کیا گیا اور یہ کہ وہ قطعی حیثیت سے رسالتمآبؐ کی زبان سے صادر ہوئی اور آپ سے سینہ بسینہ ان قراء سبعہ کے واسطہ سے ہم تک پہونچی ہیں۔

لیکن جسوقت ہم حقیقت کے اوپر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قراءتیں جناب رسالتمآبؐ سے متواتر حیثیت سے منقول ہونا تو درکنار خود ان قراء سبعہ سے بھی متواتر حیثیت پر نقل نہیں ہوئی ہیں۔

تواتر کے معنی کیا ہیں؟ ہر طبقہ میں اتنے راویوں کی زبانی نقل ہونا جن کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط بیانی کا شبہہ باقی نہ رہے۔

یہاں یہ حالت ہے کہ قراء سبعہ میں ایک شخص عاصمؒ ان کے دو شاگرد ہیں حفص اور شعبہ انہی کے ذریعہ سے عاصم کی قراءت کا دنیا کو علم حاصل ہوا ہے اور خود ان دونوں میں عاصم کی قراءت کے متعلق کبھی اختلاف ہوتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ اور کوئی کچھ۔

اسی طرح نافعؒ کے دو شاگرد قالون اور ورش۔ ابن کثیرؒ سے روایت کے سلسلہ میں قنبل اور بزی۔ ابو عمروؒ بن العلاء کے شاگرد صرف ایک یزیدی اور اُن کے دو شاگرد ابو عمرو اور ابو شعیب۔

ابن عامرؒ سے سلسلۂ روایت میں زکوان اور ہشام۔ حمزہؒ کے ایک شاگرد سلیم اور اُن کے دو راوی خلف اور خلاد۔ کسائی کے بھی دو راوی ابو عمر اور ابو الحارث۔

پھر یہ سلسلہ جب قراء سبعہ تک منتہی ہوا تو قراء سبعہ میں سے ہر شخص تو ایک ہی ہے

پھر تواتر کہاں باقی رہا۔

اسکے آگے جاکر قراء سبعہ کے اساتذہ بھی ہمکو معلوم ہوئے ہیں وہ بھی گنتی ہی کے اشخاص ہیں جن سے تواتر کا وجود نہیں ہو سکتا۔

ان قراء سبعہ میں اکثر کا سلسلۂ روایت کسی ایک نقطہ پر متحد بھی ہوتا ہے مثلاً امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام تک ان میں سے اکثر کا طریق روایت منتہی ہے لیکن ایک طرف انکی باہمی اختلاف دوسری طرف ہے کہ ان کے مقابلہ میں اکثر قراءت اہلبیت، کا تذکرہ علیحدہ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کچھ خاص باتیں ہونگی جو ان لوگوں کو مشترک طریقے سے امیر المومنین ع سے پہونچی ہونگی لیکن ان باتوں کے علاوہ ان لوگوں نے خود بھی اپنی طبع آزمائی یا دوسرے استادوں کی تعلیم سے کچھ طریقے ایجاد کئے جن کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض مثلاً حمزہ کے متعلق یہ جو کتابوں میں لکھا ہے کہ انھوں نے امام جعفر صادق ع سے قراءت کا فن حاصل کیا تھا اسکی بھی نوعیت یہی ہوگی۔ یعنی کچھ امام جعفر صادق ع سے استفادہ کیا ہوگا لیکن انکی پوری قراءت حضرت کی طرف نسبت رکھتی ہے؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

پھر ہمارے نقطۂ نظر کے لحاظ سے تو ان قراء سبعہ میں سے اکثر کی عدالت، وثاقت یا شیعیت بھی ثابت نہیں ہے اور وہ خود نیز ان سے اخذ قراءت کرنے والے ان کے شاگرد بالکل مجہول الحال اشخاص ہیں جن کے اقوال و روایات پر اعتماد ممکن نہیں ہے۔

ایسی صورت میں ہمارے علماء میں سے بھی بعض حضرات نے جو قراء سبعہ کے مسئلہ کو اہمیت دی ہے اور قراءت سبعہ کو متواتر و لازم العمل قرار دیا ہے وہ حقیقت حال سے ناواقفیت اور نظر کی چوک کے سوا کچھ نہیں ہے۔

نزول القرآن علیٰ سبعۃ احرف کی حدیث اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے اس درجہ

مبہم مضطرب اور تاریک ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اسکے معانی درج کرتے ہوئے لکھدیا ہے کہ اختلف فی معنی سبعۃ احرف علی اربعین قولا "ان سات حرفوں کے معنی سمجھنے میں چالیس قول ہوئے ہیں" ان میں سے سینتیس ۳۵ قول ابن حبان کی کتاب سے درج بھی کئے ہیں آخر میں خود حافظ سیوطی نے لکھا ہے۔

وقد ظن کثیر من العوام ان المراد بھا القراءات السبعۃ وھو جھل قبیح "بہت سے عوام (جہال) نے یہ گمان کیا ہے کہ اس سے مراد ساتوں قراتیں ہیں لیکن یہ بہت شرمناک جاہلانہ بات ہے"

دوسرے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان سات حرفوں سے مراد سات باب ہیں کہ جنکے متعلق قرآن مجید میں آیات موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو مستدرک حاکم کی روایت ابن مسعود سے کہ رسالتمآب ص نے فرمایا نزل القرآن من سبعۃ ابواب علی سبعۃ احرف زاجرا وامرا وحلالا وحراما ومحکما ومتشابھا وامثالا۔

"قرآن مجید سات بابوں میں سے سات قسموں پر نازل ہوا ہے۔ منع حکم۔ حلال۔ حرام محکم۔ متشابہ۔ امثال۔

اور ابن جریر کی روایت میں ابو قلابہ کی زبانی جناب رسالتمآب ص سے منقول ہے انزل القرآن علی سبعۃ احرف امر وزاجر وترغیب وترھیب وجدل وقصص ومثل۔

"قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ امر۔ نہی۔ ترغیب۔ تہدید۔ مجادلہ قصص وامثال"

یہ روایتیں سبعۃ احرف کی تفسیر میں ایسی ہیں جن کا مضمون بالکل اصول مسلمہ مذہب

اور عقل سلیم کے مطابق ہے۔

اسکے برخلاف روایتوں میں سبعۃ احرف کے ایسے معنی ذکر کئے گئے ہیں جو کسی طرح قرآن مجید کی شان و عظمت کے موافق نہیں ہیں۔

ملاحظہ ہو امام احمد بن حنبل کی روایت جس میں یہ ہے کہ حضرت رسول نے تقاضا کر کے جبرئیل سے قرآن مجید کے الفاظ میں ردوبدل کی اجازت حاصل کی یہاں تک کہ وہ سات حرفوں تک پہونچے جبرئیل نے کہا کلھا شاف کاف مالم تختم ایۃ عذاب برحمۃ وایۃ رحمۃ بعذاب۔

"یہ جتنے طریقے ہیں سب ہی کافی اور شافی ہیں جب تک اتنا تغیر نہ کر دیا جائے کہ آیت عذاب آیت رحمت اور آیت رحمت آیت عذاب سے تبدیل ہو جائے"۔

دوسری حدیث میں ان جائز تغیرات کی مثال بھی دی گئی کہ جیسے تعال کی جگہ اقبل۔ ھلم۔ اذھب۔ اسرع۔ اعجل وغیرہ۔

ابوداؤد کی حدیث میں ہے لیس منھا الا شاف کاف ان قلت سمیعا علیما عزیزا حکیما مالم تختم ایۃ عذاب برحمۃ او ایۃ رحمۃ بعذاب۔

"یہ سب طریقے کافی اور شافی ہیں مثلاً سمیعاً علیما کی جگہ عزیزاً حکیما کہدیا تو کوئی مضائقہ نہیں جبتک آیت عذاب کی رحمت سے اور آیت رحمت کی عذاب سے بدل نہ جائے"۔

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ان ھذا القرآن نزل علی سبعۃ احرف فاقرأوا ولا حرج ولکن لا تجمعوا ذکر رحمۃ بعذاب ولا ذکر عذاب بمغفرۃ۔

"یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے لہذا تم شوق سے خاطر خواہ پڑھو۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بے شک رحمت اور عذاب کی آیتوں میں ادل بدل نہ کرو"۔

امام احمد کی ایک روایت حضرت عمر سے ہے القرآن کلہ صواب مالم تجعل مغفرۃ عذابا او عذابا مغفرۃ۔
"قرآن ہر طرح ٹھیک ہی ہے جب تک کہ مغفرت کو عذاب اور عذاب کو مغفرت نہ بنا دو"
ان روایات کے لحاظ سے قرآن کی شان اعجاز تو بالکل رخصت ہو جاتی ہے اور نہ اسکی فصاحت و بلاغت کا کوئی خیال مدنظر رہ جاتا ہے۔ بس صرف معانی کی اتنی تبدیلی نہ ہو کہ بالکل کچھ کا کچھ ہو جائے اور چاہے جتنے الٹے پلٹے ہوں کوئی مضائقہ نہیں۔
یہ روایتیں بالکل اصول مذہب کے خلاف ہیں اور قابل توجہ نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو اسلام کے حقیقی محافظ تھے انھوں نے اس غلطی کے پردہ کو چاک کر دیا ہے اور صاف فرما دیا کہ ان القرآن واحد نزل من عند واحد "قرآن بس ایک ہے اور ایک ذات کے پاس سے نازل ہوا ہے۔" (حدیث امام محمد باقرؑ بروایت کافی کلینیؒ)
دوسری روایت صحیح میں فضیل بن یسار کی زبانی امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے جب فضیل نے عرض کیا ان الناس یقولون ان القرآن نزل علی سبعۃ احرف "لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔"
حضرت نے فرمایا کذبوا ولکنہ نزل علی حرف واحد من عند الواحد "یہ لوگ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔ وہ ایک حرف کے اوپر نازل ہوا ہے ایک ذات (خداوند عالم) کے پاس سے۔"
ان احادیث سے سبعۃ احرف والی روایت کی حقیقت بالکل کھل گئی اور بہر صورت قراء سبعہ کی قراءتوں سے تو اس روایت کو کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا لہذا ان قراءتوں پر اعتماد و اعتبار کی کوئی صورت نہیں ہے۔

قرآن کی موجودہ مکتوبی صورت جو مسلمانوں کے درمیان شایع و ذایع ہی تواتر کا درجہ حاصل کرچکی ہے اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے اس کا امضا ہوا ہے لہذا یہی مستند ہی۔ نماز اور دوسرے موقعوں پر اسی کی تلاوت صحیح ہے۔

اور اسکے علاوہ دوسرے قاریوں کی قرأت کے ساتھ نہ تو اسکا تلاوت کرنا صحیح ہے اور نہ اس پر عمل کرنا اور نہ اُس سے استدلال کرنا اور کسی موقع پر سند میں پیش کرنا درست ہے۔

بے شک ائمہ معصومین علیہم السلام سے باسناد صحیحہ کسی خاص آیت کے موقع پر اگر کسی خاص قرأت کا ثبوت ہو جائے تو اسکا اتباع لازم ہوگا کیونکہ پتہ چلیگا کہ اس آیت میں قرأت متداولہ کا امضا نہیں ہوا ہے اور یہ ہمارے گذشتہ بیانات سے ظاہر ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ متداول صورت کتنی ہی تواتر کی حد پر پہونچی ہو لیکن اس کا استناد اور قطعی اعتبار امضائے معصومین کی بنا پر ہے اور بغیر اُس کے نہیں۔ لہذا اگر کسی خاص آیت میں خود اُن حضرات سے قرأت اسکے خلاف ثابت ہو جائے تو وہ معتبر ہوگا اور قابل عمل جیسے آیۂ وضو میں وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین۔ قرأت متداولہ میں ارجلکم لام کے فتحہ کے ساتھ ہی لیکن قرأت معتبر اس میں ارجلکم کسر لام کے ساتھ ہے جو سیاق قرآن کے ساتھ بھی بالکل متحد ہے اس میں تلاوت کے موقع پر ارجلکم بکسرِ لام کہنا درست ہوگا اور حکم شرعی کے استفادہ میں بھی اُس سے استناد درست ہوگا۔

اسی طرح سورہ صافات میں سلام علی الیاسین لفظ میں کسی اعتبار سے مطابق ذوق نہیں ہے۔ قرأت اہلبیت کی بنا پر سلام علی ال یٰسین درست ہے اور اکثر علمائے اہلسنت نے اسکے مطابق روایات درج کئے ہیں۔

آٹھواں تبصرہ

تمسک بالقرآن کی اہمیت

اور

اسکے قیود و شرائط

قرآن مجید یقیناً خلق خدا کے لئے ہدایت بن کر آیا تھا اور دنیا کو صحیح راستہ دکھلانیکا ذریعہ جس کا پہلے ہی پارہ میں اعلان موجود ہے کہ الم ذلك الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین " یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ۔ یہ رہنما ہے پرہیزگاروں کے لئے " دوسرے مقامات پر کہیں اسکو " ضیا " (روشنی) کہیں " ذکر " (یاد آوری کا ذریعہ) کہیں " تبصرہ " (آنکھیں کھولنے والا) " شفاء لما فی الصدور " (سینوں کے باطنی امراض شک و شبہہ کفر و نفاق وغیرہ کا علاج) کہیں " فرقان " (حق و باطل میں جدائی ڈالنے والا) کہیں " بیان " (حقیقتوں کا واضح کرنیوالا) وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے جس سے مجموعی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً وہ عام خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کے لئے اتارا گیا ہے اور دنیا کو اسکے مندرجہ مضامین پر غور کرنے ، اس سے نتیجہ نکالنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت ہے۔ وہ صرف بطور اوراد و ادعیہ کے زبانوں سے تلاوت کر لینے اور بطور تعویذ و نقش کے گلے میں ڈال لینے اور بطور ایک محترم و مقدس چیز کے سر آنکھوں پر رکھ لینے بوسہ دے لینے کیلئے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اسکے مطالب و حقائق کا درس لیا جائے اور اس میں غور و

غوض کیا جائے نیز اُس سے اپنی عملی زندگی کے لئے سبق حاصل کئے جائیں۔

یہی چیز وہ ہے جس کے معنی "تمسک بالقرآن" کے ہیں لوگوں نے تمسک بالقرآن کے معنی نہ معلوم کیا سمجھ لئے لیکن تمسک کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ اپنی عملی زندگی میں اُسکے ہدایات کی پابندی کی جائے اور کوئی قول و عمل اسکے خلاف اختیار نہ کیا جائے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن مجید ایک خاموش رہنما ہے نیز اس میں اکثر مضامین بطور اجمال و اختصار بیان ہوئے ہیں۔

لہذا اُسکے ساتھ تمسک کے واسطے ناطق بات کرنے والے معلّم اور ہادی کی ضرورت ہے جو اُسکے تعلیمات کو اپنے قول و عمل سے دنیا کے ذہن نشین کرے اُسکے مجملات کو بیان کرکر اور اُسکے مبہمات کی توضیح و تفصیل کرے۔

یہ معلم و ہادی اپنے زمانہ میں رسول عربی پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اسی بناء پر خود قرآن مجید میں حضرت کے اقوال و افعال پر مہر تصدیق ثبت کی وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ ان کے اقوال کے مطابق منشائے الٰہی ہونے کی سند اور لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ نیز ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اُن کے افعال کے قابل اتباع ہونے کی دستاویز ہیں۔ یہ دو چیزیں قول اور عمل وہ ہیں جنھیں سنت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے کتاب کے ساتھ سنت کے واجب العمل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

بہت لوگ جنھوں نے تعلیمات اسلامی کو حقیقت کی روشنی میں نہیں دیکھا انھوں نے قرآن مجید کے ہدایات کو اپنے لئے کافی قرار دیکر "سنت" کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

یہ فرقہ آج کل "اہل قرآن" کے نام سے موجود ہے وہ اپنے تمام افعال، عبادات اور

احکام شرعیہ کی بنیاد قرآن مجید پر رکھنے کے مدعی ہیں اور اس طرح وہ عجیب و غریب شریعت تیار ہوئی ہے جس کو اصلی شریعت اسلام سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔

یہ خیال کہ قرآن مجید کافی ہے اور اسکے ساتھ رسولؐ کی ہدایت کی ضرورت نہیں اس فقرہ سے کہ "حسبنا کتاب اللہ" اس موقع پر ہی کہ جب رسولؐ کا وقت آخر تھا اور عالم احتضار تھا بعض صحابہ کی زبان سے مبہم اور مختصر طور پر ظاہر ہو گیا تھا اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اس عقیدہ کی داغ بیل اس وقت پڑی تھی یا بیج اس کا اسوقت ڈالا گیا تھا لیکن اسوقت یہ بالکل ہنگامی و وقتی تھا اور اس میں شاخ و برگ پیدا نہ ہوئے تھے نہ عملی طور سے اسکی پابندی کی جا سکی ورنہ رسولؐ کی بیٹی کو میراث سے محروم کرنے میں قرآن مجید کے بالکل خلاف اپنی مرویہ حدیث کی مدد لینا نہ پڑتی۔

بہرحال حق شخصیتوں اور ان کے اقوال کا پابند تو ہو نہیں سکتا۔ ہمکو خود قرآن کی ہدایات کے دیکھنے کی ضرورت ہے اور قرآن نے صاف طور سے قول و عمل رسولؐ کو مستند اور قابل عمل بتلایا ہے لہذا اگر معتبر و مستند قابل وثوق ذریعے سے ہمکو قول و عمل رسولؐ کا پتہ چلے تو اس پر عمل نہ کرنے کے کیا معنی؟ یہ تو خود قرآن سے بغاوت ہوگی جسکے بعد خود قرآن کنارہ کشی کرے گا اور "اہل قرآن" ہونے کا دعویٰ باطل ہو جائیگا اور قول رسولؐ کی بنا پر رسولؐ کے بعد قرآن اور عترت کا ساتھ ہے حضرت کی مستند معتبر بلکہ متواتر حدیث ہے۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہلبیتی ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی و انھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض یوم القیامۃ

"میں تم میں (اے مسلمانو) دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں ایک خدا کی کتاب اور ایک میری عترت میرے خاص اہلبیت۔ اگر تم ان دونوں کے ساتھ تمسک کرو تو میرے بعد

ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہوگے اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جبتک کہ دنیا کا دور آخر نہ ہو اور حوض کوثر پر میرا سامنا ہو"۔

یہ حدیث کوئی قابل بحث۔ محتاج تحقیق یا مشکوک و مشتبہ غیر معلوم حدیث نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کی متفق علیہ، متواتر اور قطعی حدیث ہے جسے صحابۂ کرام کی جماعت میں تیس سے زیادہ بزرگوں نے روایت کیا ہے اور جسے تمام حفاظ حدیث اور اصحاب جوامع و مسانید نے ہر دور و زمانہ میں اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

عبقات کی ایک مستقل جلد اس حدیث کی صحت و تواتر کے اثبات میں موجود ہے جس کے بعد اسمیں شک و شبہہ کی گنجایش نہیں ہے۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ تمسک بالعترۃ کا حکم ہے اور تمسک کے معنی سوائے اقوال و افعال پر عمل پیرا ہونے کے اور کچھ نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رسالتمآب کے زمانہ میں قرآن مجید کے ساتھ ذات رسول کو بطور تفسیر و توضیح و تفصیل پیش نظر رکھنا ضروری تھا اور بغیر اسکے تمسک بالقرآن صحیح طریقے سے نہیں ہو سکتا تھا اسی طرح بعد رسول عترت رسول اور اہلبیت طاہرین کے اقوال کو پیش نظر رکھنے کی حاجت ہے اور بغیر اسکے کبھی تمسک بالقرآن پورے طور سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

نواں تبصرہ
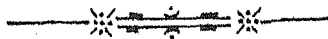
تفسیر و اصولِ تفسیر

تفسیر بالرّائے کے معنی تنزیل و تاویل میں فرق

محکم و متشابہ میں امتیاز تفسیر قرآن کے شرائط

قرآن فہمی اور تفسیر کلام پاک کے بارے میں مختلف جماعتوں کے نقطۂ نظر میں بہت بڑا تفرقہ ہے ایک جماعت قرآن مجید کے بارے میں اتنی مرعوب ہوئی ہے کہ وہ عقل انسانی کو اسکے معانی کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہی سمجھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے والے خاص اشخاص تھے جو اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ ہم صرف اُن حضرات کے اقوال و ارشادات پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ قرآن سے براہ راست ہم کسی حکم شرعی یا اعتقادی مسئلہ کا نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ اخباری جماعت ہے جس نے ادلّہ احکام سے کتاب الٰہی کو بالکل خارج ہی کر دیا ہے اور اپنے عمل کا دار و مدار صرف اخبار و احادیث پر رکھا ہے۔

دوسری جماعت وہ ہے جس کا ابھی گذشتہ تبصرہ میں تذکرہ ہوا ہے کہ اُس نے قرآن کو اپنے ہر درد کا مداوا قرار دے کر احادیث و اخبار سے بالکل کنارہ کشی ہی کر لی ہے اور اس لئے اپنا نام "اہل قرآن" رکھا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایک (بخیال خود) "روشن خیال" گروہ وہ ہے جو ہر بات کا ثبوت

قرآن مجید سے مانگتا ہے اور جو کچھ قرآن مجید سے سمجھ میں نہ آئے اُسکے ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔

بعض واعظین ایسے ہیں جو منبروں پر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ ہم ہر مسئلہ کو قرآن مجید سے ثابت کریں گے اور اس سلسلہ میں آیات قرآن کی توجیہ و تفسیر میں ایسے طبعزاد معانی کا اختراع کرتے ہیں جو آیات قرآن سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔

مذکورہ بالا خیالات کو دیکھنے کے بعد جب ہم ہادیان دین کے ارشادات پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کی نوعیت بظاہر مختلف نظر آتی ہے۔

ایک طرف تو اکثر مقامات پر قرآن مجید سے استفادۂ احکام کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اکثر احکام شرعیہ میں بطور استدلال آیات قرآن کو اس پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے کہ خود وہ آیت اس حکم کے بتانے کے واسطے کافی تھی اور راویوں کو خود اسی آیت سے حکم شرعی سمجھ لینا چاہیئے تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کے معانی کا سمجھنا عام اہل علم و فضل کے لئے ناممکن نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ انما یعرف القرآن من خوطب بہ "قرآن کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسکے حقیقی مخاطب ہیں"۔ اسکے ساتھ تفسیر بالرائے کو عظیم گناہ بتلاتے ہوئے ارشاد کیا من فسر القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار "جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی وہ اپنا ٹھکانا آتش جہنم میں بنالے" یہ بھی ارشاد کیا کہ من فسر القرآن برأیہ فان اصاب فقد اخطاء "جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اُس نے اگر ٹھیک بھی کہا ہو تب بھی غلطی کی"۔ اس طرح قرآن مجید میں عقل کی رایوں کا سدباب کر دیا۔

ضرورت ہے کہ ایک طرف مذکورہ سابق حد افراط یا تفریط تک نکلجانے والے خیالات

کی تعدیل کی جائے یعنی اس نقطۂ اعتدال کا پتہ لگایا جائے جہاں تک تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جانے کا حق ہے اور اُس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں اور دوسری طرف ان احادیث و اخبار میں مطابقت پیدا کر کے اُن کو ایک نقطہ پر جمع کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ انکا اجتماعی مفاد کیا ہے۔

اسکے لئے حسب ذیل تمہید پر غور سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

الفاظ سے استفادۂ معانی جو الفاظ و معانی کے مخصوص ارتباط کا نتیجہ ہے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اسکے متعدد مرتبے اور مختلف درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ لفظ جو کسی معنی کے لئے وضع ہوئی ہے جب گوش گزار ہو تو فوراً ذہن اُس معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ معنی دماغ میں گردش کرنے لگیں۔ اسکے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ متکلم نے وہی معنی مراد بھی لئے ہوں بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس لفظ کا ظاہر کرنیوالا کوئی بافہم و شعور متکلم ہو بلکہ دروازہ کے کھولنے بند کرنے میں اسکے چوکھٹ بازو اور چولوں سے اگر آواز نکلتی ہو اور کسی خاص لفظ کی تشکیل کر رہی ہو جو کسی معنی کی حامل ہو تو ذہن میں وہ معنی آئینگے ضرور حالانکہ معلوم ہے کہ وہ کسی متکلم کے زبان و دہن کی لفظ نہیں کہ اُس سے یہ معنی مراد بھی ہوں۔

یہ دلالت دلالت تصوریہ ہے اسلئے کہ لفظ کے سننے کے بعد صرف معنی کا خطور ذہن میں ہوتا ہے اُس پر کوئی حکم ایجابی یا سلبی نہیں لگایا جاتا ہے لہذا تصور ہی تصور ہے۔ تصدیق کا پتہ نہیں ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کے ساتھ معنی ذہن میں آئیں اور اسطرح کہ متکلم نے یہی معنی مراد بھی لئے ہیں اور استعمال لفظ کا اسی معنی میں کیا ہے۔ اس کو کہا جائیگا دلالت تصدیقیہ

اسلئے کہ یہاں تصور ہی تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ حکم بھی ہے کہ متکلم نے یہی معنی مراد لیے ہیں۔ یہ دلالت اُسی وقت پیدا ہوگی جب متکلم فہم و شعور رکھتا ہو اور ارادہ کے ساتھ کلام کیا ہو دروازہ سے سنائی دینے والی آواز میں یہ دلالت پائی نہیں جاسکتی کیونکہ اس دلالت کی بنیاد قصد متکلم پر ہے۔ اسی طرح اگر متکلم باشعور ہستی یعنی انسان ہو مگر بوقت تکلم معلوم ہے کہ قصد و ارادہ موجود نہیں ہے جیسے سرسامی کا ہذیان اور مست بیہوش کی بکواس۔ اس صورت میں بھی دلالت تصدیقیہ کا وجود نہ ہوگا کیونکہ متکلم میں قصد و ارادہ کا وجود نہیں ہے۔

دلالت تصوریہ تو لفظ کے گوش زد ہوتے ہی فوراً پیدا ہوتی ہے اور بدلتی نہیں ہے لیکن دلالت تصدیقیہ معتبر صورت سے اُسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کلام ختم ہوجائے اور کوئی قرینہ اسکے خلاف نہ آئے اسلئے کہ اکثر خاتمۂ کلام کے موقع تک ایسے قرائن آجاتے ہیں جو لفظ کو پہلے معنی سے ہٹاکر کسی دوسرے معنی کا جامہ پہنا دیتے ہیں مثلاً متکلم کی زبان سے نکلا "رأیت اسداً" مخاطب کے کان میں اسد کی دال پہونچتے ہی "شیر" کے معنی ضرور آجائینگے یہ دلالت تصوریہ ہے لیکن یہ فیصلہ کہ اسد سے مراد بھی یہی ہے اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب اسکے بعد "یرمی" کی لفظ آنہ جائے ورنہ دلالت تصدیقیہ منقلب ہوجائیگی۔ فوراً یہ رائے قائم کرنا پڑے گی کہ "اسد" سے مراد مجازی معنی یعنی "رجل شجاع" ہے۔

ان دونوں دلالتوں کے پورے ہونے کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ کلام کے مقصود اصلی کا پتہ چلایا جائے اسلئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ کے لفظی معنی کچھ ہیں اور وہ بحیثیت استعمال الفاظ مراد بھی ہیں لیکن اصلی مقصود وہ نہیں ہیں بلکہ ذہن کا منتقل کرنا منظور ہے اس معنی کیطرف اور جسکی طرف جو درحقیقت بتلانا منظور ہے۔

جیسے کنایہ کی صورت میں کہنے والا کہتا ہے "میں اب تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا"

یہ جملہ حسب ذیل الفاظ پر مشتمل ہے۔ میں۔ تمہارے۔ گھر۔ قدم۔ نہ رکھوں گا۔ ان میں سے ہر لفظ کے ایک معنی ہیں اور جب متکلم ان الفاظ کو ادا کرتا ہے تو وہ اُن معانی کا قصد بھی رکھتا ہے۔ یعنی میں سے مراد ذات متکلم ہے اور اُسکے بعد ہر لفظ جو ہے اُس سے وہی معنی مراد ہیں جو اس لفظ سے باعتبار وضع لغوی ہونا چاہیئے ہیں۔

کوئی لفظ اپنے اصلی معنی کے علاوہ دوسرے معنی میں مستعمل نہیں ہے لیکن پھر بھی اصلی مقصود اس جملہ کے کہنے سے یہ نہیں ہوتا کہ " میں قدم نہ رکھوں گا " بلکہ یہ کہ " میں آؤں گا نہیں " اس بنا پر اگر وہ خود اپنے پیروں پر اُسکے گھر میں نہ جائے بلکہ کسی سواری پر داخل ہو تب بھی اُس کا دعویٰ غلط سمجھا جائیگا حالانکہ اس صورت میں وہ خود قدم نہیں رکھتا بلکہ اُسکے مرکب کے قدم پڑتے ہیں۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ لفظ، معنی اور مقصود کلام اس سب کے تمام ہونے کے بعد یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کلام سے اشارہ کس امر کی طرف ہے مثلاً اتفاق سے مخاطب نے کبھی اس متکلم کو کہا تھا کہ " میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا "

آج یہ اسی طرح کہہ رہا ہے کہ " میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا " اور اس کہنے سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ یہ بدلا ہے تمہاری اُس دن کی بات کا جو تم نے کہی تھی۔

یہ قسم پہلے تینوں درجوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ درجے حقیقتاً لفظ اور اُسکے معنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لفظ کے اصلی معنی اور وہ کہ جو مراد ہیں اور اُس معنی کے ادا کرنے سے جس بات کا کہنا منظور ہے یہ سب لفظ ہی تک منتہی ہوتے ہیں لیکن یہ چیز جسے ہم نے چوتھے درجہ پر قرار دیا ہے لفظ اور اُس کے معنی سے بالکل خارج ہے۔

اسی بنا پر کسی شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں نقل بالمعنی کی صورت میں یہ حق حاصل ہے کہ انسان اُن الفاظ کے تحت اللفظی معنی کو الفاظ کی اُلٹ پلٹ کے ساتھ یا مرادفات

کی تبدیلی کے ساتھ بیان کرے مثلاً کسی نے کہا تھا لا اضع قدمی فی دار فلان اس بات کو انسان یوں کہے کہ فلاں شخص نے کہا "میں اپنا پاؤں اسکے گھر میں نہ رکھوں گا۔ اب میں قدم اسکے گھر میں نہیں رکھوں گا"۔

حالانکہ یہ الفاظ اُسکے دہن سے نہیں نکلے تھے لیکن چونکہ ان الفاظ سے معنی وہی پیدا ہوتے ہیں اسلئے ان الفاظ کا منسوب کرنا اُسکی طرف صحیح ہے۔

اسی طرح یہ بھی حق حاصل ہو کہ نقل کرنے والا اُن الفاظ کے مقصود اصلی کو اُس متکلم کی طرف منسوب کرے مثلاً "تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا" اس قول کو اس طرح نقل کرے کہ فلاں شخص نے کہا "میں تمہارے یہاں اب کبھی آؤں گا نہیں"۔

یہ اگرچہ اُنہی الفاظ کا ترجمہ اور تحت اللفظی مضمون نہیں ہو لیکن پھر بھی چونکہ ان الفاظ کے ذریعے سے اصل میں یہی کہنا مقصود ہو اسلئے یہ بھی اُن الفاظ کے ذریعہ سے مقولۂ قائل قرار پا سکتا ہے اور اُسکی طرف منسوب کرنا درست ہے۔

مگر وہ خارجی چیز جو چوتھی قسم میں ذکر کی گئی ہے، جو کلام سے بطور اشارہ نکالی جاتی ہو وہ ہرگز ہرگز مقولۂ متکلم قرار نہیں پا سکتی اور نہ نقل قول کے موقع پر اس کا ذکر کرنا صحیح ہے۔

مثلاً مثال مذکورہ بالا میں یہ کہنا کہ اُس نے کہا "یہ تمہاری بات کا جواب ہے، اُس دن کی" بالکل غلط ہے کیونکہ اُس نے یہ مضمون کہا نہیں تھا۔ درحقیقت ایک بات کہی تھی جس سے سننے والے نے اپنی ذہانت سے یہ اشارہ پیدا کیا تھا کہ اُس دن کی بات کا جواب ہے، اس کو اُس قائل کی طرف بطور قول منسوب کرنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

دوسرا فرق ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ الفاظ کے پہلی قسم کے معنی یعنی جو الفاظ کے ذریعہ سے مراد و مقصود متکلم ہوں ہمیشہ ایک ہی ہو سکتے ہیں۔ اُن میں کبھی کثرت پیدا نہیں ہو سکتی نا ممکن ہے

کہ ایک لفظ سے بوقت واحد ایک سے زیادہ معنی کا لحاظ کیا جائے لیکن وہ معانی کہ جو بطور اشارہ نکل سکتے ہیں وہ ایک سے بہت زیادہ ہو سکتے ہیں بلکہ کلام اتنا ہی اعلیٰ پایہ کا ہوگا جتنے اس قسم کے معانی اُس میں زیادہ پیدا ہو سکیں۔

پہلی قسم کے معانی الفاظ کی وضع لغوی سے تعلق رکھتے ہیں اور قرائن لفظیہ و معنویہ کلام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دوسرے قسم کے معانی میں سننے والے کی عقل اور افتاد طبیعت کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے یہ معنی لفظ کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ لفظ کے معنی و مطلب کو ملحوظ رکھکر سامع ایک رائے قائم کرتا ہے اس میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ معنی صرف سامع کے حسن ظن یا بدگمانی یا خاص افتاد طبع کا نتیجہ ہوں اور حقیقۃً متکلم کو مقصود بھی نہوں۔ جیسے محفل میں ایک شخص دزدی پیشہ کسی کہنے والے کے ان الفاظ کو کہ "خدا کے فضل سے مجھے چوری کی عادت نہیں ہے" سنکر یہ رائے قائم کرے کہ اس سے مجھ پر تعریض منظور ہے کہ "اس شخص کو چوری کی عادت ہے"۔

یہ معنی مذکورہ الفاظ سے تو کوئی تعلق رکھتے ہی نہیں ہیں کیونکہ وہ جملہ سلبیہ ہے یہ ثبوتیہ وہ اپنی نسبت نفی ہے۔ یہ غیر کے متعلق ثبوت ہے لہذا یہ نہ اس کا مضمون ہے۔ نہ مطلب لیکن یہ تعریض وہی حیثیت رکھتی ہے جو دلالت اشارہ کے ذیل میں ذکر ہوئی۔

بہت ممکن ہے کہ کہنے والے کو خبر بھی نہ ہو کہ اس مجمع میں کوئی چوری کی عادت رکھنے والا موجود ہے لیکن "چور کی ڈاڑھی کا تنکا" وہ اپنی طرف لیجائیگا اور سمجھے گا کہ مجھکو کہا جارہا ہے۔

اسی طرح سابق و حال کے حالات کو پیش نظر رکھکر کبھی یہ اشارہ پیدا کر لیا جاتا ہے حالانکہ متکلم کو بوقت کلام اُن حالات کا لحاظ نہیں ہے۔ جیسے مذکورہ سابق مثال میں مخاطب کا کبھی متکلم کو یہ کہہ چکنا کہ "میں تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا" اور آج اتفاق سے اس متکلم کی زبان سے اُس مخاطب کی نسبت انہی الفاظ کا جاری ہونا پتہ دیتا ہے کہ اُس سے اُس دن کے

جواب کی طرف اشارہ ہو مگر بہت ممکن ہے کہ متکلم کو اس وقت اُس دن کی بات کا خیال بھی نہو۔

مختصر یہ ہو کہ اس قسم کے اشارے پیدا کرنے میں وسعت بہت بڑی ہو مگر اس میں قدم قدم پر غلطیاں واقع ہونے کا امکان بہت زیادہ ہو۔

ایک شخص جو کسی کو اپنا دشمن سمجھے ہوئے ہو اسکی ہر بات میں کچھ نہ کچھ اپنے لئے برا پہلو پیدا کرتا ہے اگرچہ وہ ہر طرح نیک نیتی کے ساتھ کلام کرتا ہو اور کسی برے پہلو کا قصد نہ کرتا ہو۔ ایک شخص جو دوسرے کو اپنا دوست سمجھے ہوئے ہو ہر بات میں محبت ہی کا پہلو نکالتا ہے چاہے کسی خاص کلام میں اسکے وہ پہلو نہ بھی پایا جاتا ہو۔

اسکی مثالیں بہت زیادہ ہیں اور ہر شخص جب غور کرے تو اسکی تصدیق کرسکتا ہو۔

یہ چار درجے ہیں جو کسی نہ کسی طرح مقصودِ کلام کی تعیین کے سلسلہ میں قائم کئے جاسکتے ہیں۔

ایک پانچویں چیز اور ہو۔ اور وہ تعیین مصداق کلام یعنی ایک لفظ اور اسکے خاص معنی ہیں اور یہ تلاش کیا جائے کہ وہ معنی کس فرد میں پائے جاتے ہیں اور کون اُن کا مصداق قرار پاسکتا ہے یا اُس مصداق کی فرد اکمل ہو۔

اس چیز کو مدلول کلام اور مقصودِ خطاب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو۔ یہ بالکل خارجی چیز ہے۔ اس کی تعیین شرح کلام کے تحت میں کسی طرح داخل ہی نہیں ہوسکتی۔

شرح کلام میں اگر آسکتے ہیں تو لفظ کے معنی مطلب مقصد۔ اور وہ معانی کہ جو بطور اشارہ اُس کلام سے پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ امر کہ اس معنی کا مصداق کہاں پایا جاتا ہے اور کہاں نہیں۔

اسکو بیان مقصود و شرح الفاظ کلام سے کوئی تعلق نہیں ہو اور نہ کوئی واسطہ ہو"۔

"تفسیر قرآن" جس چیز کا نام ہے اُس کو اس پانچویں چیز سے کوئی ربط نہیں ہو کسی آیت کے

معانی و مطالب کی تعیین کے بعد یہ بحث کہ اس آیت کا صحیح مصداق کیا ہو سکتا ہے؟ کسی طرح تفسیر کے تحت میں داخل نہیں ہوتا۔

اور اس لئے اس تعیین مصداق میں اگر مشاہدہ تجربہ یا عقل کی رہنمائی کی ضرورت ہو تو اُس سے کام لینا "تفسیر بالرائے" کے تحت میں مندرج نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو

(۱)

قرآن مجید میں ہے رب المشرقین و رب المغربین۔

اسکے معنی صاف ظاہر ہیں کہ خداوند عالم مالک ہے دو مشرقوں کا اور دو مغربوں کا مشرق سے مراد بھی جیسا کہ اسکے ظاہری معنی ہیں مشرق آفتاب مغرب سے مراد مغرب آفتاب ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ اس معنی کو بدل دے اپنی عقل کے اوپر زور دیکر مثلاً یہ کہدے کہ مشرقین سے مراد "مشرق آفتاب نبوت" اور "مشرق خورشید امامت" ہے تو یہ یقیناً معنی میں تصرف ہے اسلئے وہ ہماری آیندہ بحث سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق و مغرب کے ظاہری معنی نقطہ طلوع و غروب قرار دیتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ یہ دو مشرق اور مغرب کون سے ہیں تفسیر نہیں ہے۔

سابق زمانہ کے مفسرین نے مشرقین و مغربین کا مصداق گرمی اور جاڑے کا مشرق و مغرب قرار دیا اسلئے کہ انکے ذرائع معلومات محدود تھے۔ اُن کو اس زمانہ کے ایسے انکشافات حاصل نہ ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص جدید انکشاف کی بنا پر یہ کہے کہ مشرقین و مغربین کا مصداق حقیقی امریکہ کے انکشاف سے پایۂ ثبوت کو پہونچا ہے اور دو مشرق دو مغرب آفتاب کا نقطہ مشرق و مغرب اس قطعہ زمین پر اور دوسرے اُس قطعہ زمین پر جہاں امریکا واقع ہے، اور یہ آیہ قرآن امریکا کے وجود کا پتہ دے رہی ہے جو اُس کے جہت اعجاز کا معمولی کرشمہ ہے تو یہ کسی طرح

تفسیر بالرائے نہ ہوگا۔

اس انکشاف کے لئے ہمکو حدیث و قول معصوم سے سند کی ضرورت نہیں ہے جب کہ خود قرآن مجید میں دو مشرق اور دو مغرب کا پتہ موجود تھا لیکن ہم اپنی کوتاہی معلومات کی وجہ سے اُسکے مصداق کا پتہ نہیں چلا سکے تھے۔

اب جبکہ ہمارے ذرائع معلومات میں وسعت پیدا ہوئی تو ہمیں اس کا پتہ لگا ہے اس میں کوئی غلطی نہیں ہے اور نہ اس کہنے میں کوئی گناہ ہے۔

(۲)

ربُّ المشارق و ربُّ المغارب

سابق زمانہ کے مفسرین کو اس کے مصداق کے سمجھنے میں بڑی دشواری ہوئی آفتاب تو ایک ہے پھر بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب کہاں سے آئیں، اسلئے اُنھوں نے مشارق اور مغارب سے مراد ہر دن کا مشرق و مغرب قرار دیکر یہ کہا کہ آفتاب اپنی ذاتی حرکت کی بنا پر سال میں ہر دن ایک نئے مشرق سے نکلتا ہے اور ایک نئے مغرب سے اس بنا پر "مشارق" اور "مغارب" کہا گیا ہے۔

حال کی تحقیقات میں یہ ثابت ہوا ہے کہ آفتاب ایک نہیں ہے۔ جتنے ثوابت ستارے سمجھے جاتے ہیں وہ ہر ایک آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مستقل نظام ہیں اور اس نظام کے تحت میں سیارے ہیں۔ اُن تمام آفتابوں کے لئے اپنے اپنے سیارات کے اعتبار سے طلوع ہے اور اسی طرح غروب اسلئے مشارق اور مغارب کا بہترین مصداق ان تمام آفتابوں کے مشرق ہیں اور اُن کے مغرب۔

ایسا کہنا اگر صرف ذاتی عقل کے صرف کرنے سے بھی ہو تب بھی تفسیر بالرائے نہ ہوگا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتابوں کا متعدد ہونا ائمہ معصومین علیہم السلام کے احادیث میں بھی وارد ہوا ہے اسلئے رب المشارق والمغارب کے مصداق کی تعیین اقوال ائمہ معصومینؑ سے بھی ممکن ہے۔

(۳)

الحمد للہ رب العالمین

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم متعدد ہیں اور حضرت احدیت ان تمام عوالم کی پرورش کرتا ہے معنی آیت کے صاف ہیں اور ان میں کوئی گنجلک نہیں ہے لیکن یہ بہت سے عالم آئیں کہاں سے؟ عالم تو یہ ایک ہی ہے جو فلک الافلاک سے شروع ہوتا اور اس مرکز ارض پر ختم ہو جاتا ہے اسلئے محدود علم والے مفسرین نے "عوالم" سے مراد انواع کائنات لئے۔ حالانکہ کسی طرح صحیح نہیں ہے یہ تمام انواع ایک ہی عالم کے اجزاء ہیں متعدد عالم نہیں ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس کے آگے نظر کی رسائی ہی نہ ہوئی۔

اب جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ دنیا اس نظام شمسی میں محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے نظام بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک دنیا موجود ہے تو یہ عالموں کے بہت تعداد میں ہونے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن نے پہلے ہی اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیاؤں کے وجود کی خبر دی تھی تو اسے تفسیر بالرائے کے تحت میں لانا صحیح نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ تو احادیث سے بھی ثابت ہے کہ عالم ایک نہیں ہے بلکہ متعدد ہیں تفصیلی بحث کیلئے اس آیت کی تفسیر کا انتظار کرنا چاہیئے۔ آیتیں اس قسم کی بہت ہیں لیکن مثال کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔

اس قسم کے نمونے جتنے آئیں جہاں معنی و مطلب میں کوئی تبدیلی نہ کی جا رہی ہو بلکہ مصداق کی تلاش کر کے دکھایا جا رہا ہو اسکے لئے کبھی حدیث و تفسیر کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے عقل سے اپنے ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ ہرگز ہرگز تفسیر بالرائے کے تحت

میں مندرج نہ ہوگا۔

تفسیر معانی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسکے معنی ہیں "کشف المبہم" یعنی غیر واضح کو واضح کرنا اور اسی مناسبت سے "استفسار" بمعنی استفہام مستعمل ہے یعنی کسی امر کو واضح کرنے کی خواہش۔

مذکورہ سابق مدارج جو معانی الفاظ کے متعلق تحریر کئے گئے اُن میں سے پہلا ایک فطری چیز ہے جو لفظ کے کسی معنی کے لئے وضع ہونے کا نتیجہ ہے اور لفظ کے گوش زد ہونے اور سامع کے اس معنی پر مطلع ہونیکے ساتھ اس کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

لفظ سے اُسکے معنی کا ذہن میں آجانا فطرت کا لازمہ ہے جو کسی کے بس کی بات نہیں ہے لہذا تفسیر بالرائے کا اس سے تو تعلق ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ انسان کا اختیاری امر نہیں ہے کہ جس سے طبیعت کا روکنا ممکن ہو۔

دوسرا درجہ یعنی الفاظ کو سنکر قرائن حالیہ و مقالیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرنا کہ اس لفظ کے کلام متکلم میں یہ معنی ہیں۔ یہ بھی ہر زبان دان کا فطری حق ہے جو سلب نہیں ہو سکتا تمدن و اجتماع کی بنیاد افہام و تفہیم پر ہے اور وہ اسی بنیاد پر قائم ہے کہ ایک متکلم کے کلام سے دوسرے کو معانی سمجھنے کا حق ہو۔ بیشک یہ حق اُسوقت سلب ہو جاتا ہے جب متکلم نے اس امر کی تصریح کردی ہو یا خارج سے کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کا کلام عام روزمرہ کے محاورات پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ شروع سے آخر تک مخصوص اصطلاحات پر مبنی ہے۔

اس طرح بے شک الفاظ کے متعلق مراد متکلم کے سمجھنے کا دروازہ بند ہو جائیگا جبتک کہ اُن کے معانی بھی اُسی کی طرف سے بیان نہ کئے جائیں۔

لیکن قرآن مجید اس طرح نہیں ہے۔ وہ عام زبان و محاورہ کے مطابق اور مروجہ اصطلاحات و استعمالات ہی کے موافق نازل کیا گیا ہے۔ اسی لئے بار بار لوگوں کو اس میں

تدبر اور اُس کے معانی میں غور و تامل کی ہدایت ہوئی ہے افلا یتدبّرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا "یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں"۔

اُسکی سچائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً "اگر یہ غیر خدا کی جانب سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف نظر آتا"۔

اگر معانی قرآن میں افہام و تفہیم کے لئے رہبری کا راستہ ہی بند ہوتا اور اُسکے معانی سمجھنے کا حق نہ ہوتا تو پھر تدبر و تامل اسکے معانی میں بیکار تھا اور اختلاف و عدم اختلاف کے جانچنے کا بھی کوئی موقع نہ تھا اسلئے کہ اختلاف الفاظ میں باعتبار معانی ہی ہو سکتا ہے۔

اُس میں صاف تصریح موجود ہے کہ انا انزلناہ قرآناً عربیاً "ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے"۔ کہیں ارشاد ہوا بلسان عربی مبین "یہ صاف کھلی ہوئی عربی زبان میں ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ عام روزمرہ عربی زبان میں ہے اور مبین کی لفظ سے تو اور زیادہ صاف ہوتا ہے کہ وہ بالکل واضح اور کھلے ہوئے محاورات کے مطابق آیا ہے جس میں کوئی گنجلک نہیں ہے۔

غور کیا جائے تو عقلی دلیل بھی ان آیات کے مفاد میں مضمر نظر آتی ہے۔ قرآن مجید رسالتمآبؐ کا معجزہ ہے اور اعجاز کی بنیاد اس امر پر ہے کہ جس شعبہ میں ایک زمانہ کے لوگوں کو ادعائے کمال ہو اُسی میں اُنکی طاقتوں کو شکست دیجائے۔ اسکی مثالیں سابق میں بحث اعجاز کے سلسلہ میں آچکی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا اور شعراء

واد بار کو اس میں کمال و سربلندی کا ادعا تھا، اس لئے اسی نوعیت کا معجزہ قرآن کریم عطا ہوا جس نے اُن کے سر تسلیم کو خم کرا لیا لیکن حجت خدا اس کے ذریعے سے اُس وقت تمام نہیں ہو سکتی جب وہ زبان و محاورات میں اُن کی اصطلاح سے جداگانہ ہو اس لئے کہ ایک زبان کے کامل ترین فصیح و بلیغ شخص کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی دوسری زبان و محاورہ کی کتاب کا بھی بلحاظ فصاحت و بلاغت جواب دے سکے۔

بیشک یہ حجت اُسی وقت تمام ہو گی جب قرآن مجید عام روزمرہ زبان کے مطابق اور اسی اصطلاح پر مبنی ہو جس میں بحیثیت فصاحت و بلاغت اُن کو دعوائے خدائی تھا۔

اب اگر وہ فصاحت و بلاغت میں اس درجہ پر فائز ہوا کہ کوئی اس کے جواب دینے پر قادر نہ ہو تو اُسکی حقانیت کا ثبوت ہو گا۔

متعدد آیات میں اس امر کا اظہار کہ یہ قرآن عربی زبان میں ہے غالباً اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ دیکھو یہ کوئی نئی زبان نہیں ہے اور نہ جدید اصطلاحات ہیں بلکہ یہ اسی عربی زبان کے روزمرہ میں ہے جس میں تم کو فصاحت و بلاغت کا انتہائی دعویٰ ہے۔ اسکے باوجود بھی اگر تم اس کے جواب میں عاجز رہے ہو تو تم کو اپنی طاقت سے بلند ایک چیز سمجھنی چاہیئے۔

اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ قرآن مجید مخصوص محاورات و اصطلاحات پر مبنی نہیں ہے اور اسکے بعد ہر عربی زبان کے واقف کار کو اُس کے معانی و مطالب سمجھنے کا حق حاصل ہے اور اس میں سوائے محاورات عرب سے واقفیت کے کوئی شرط نہیں ہے۔

بے شک یہ صورت حال درد انگیز ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر شخص جو عربی سے کوئی حس و مس نہ رکھتا ہو وہ بھی قرآن فہمی کا مدعی ہے۔ اسکو سوائے دماغی "بو الہوسی" کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا جس کے بعد "شیوۂ اہل نظر" کی آبرو کا جانا یقینی و لازمی ہے۔

اسی صورت سے بالکل تیسرا درجہ یعنی کلام کے مقصود اصلی کی تعیین جو بضمیمہ قرائن وغیرہ ہو۔

یہ بھی الفاظ کے ایسے ہی معانی ہوتے ہیں جو محاورہ و استعمال پر مبنی ہیں اور اسلئے ہر لفظ کے معنی میں صلاحیت نہیں ہو کہ اس سے کسی دوسرے معنی کو بطور مقصود اصلی قرار دے لیا جائے بلکہ وہ دوسرے معنی وہی ہو سکتے ہیں جو اس لفظ کے اصلی معنی کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتے ہوں کہ ذہن اس لفظ کے سننے سے اس معنی کی طرف منتقل ہو سکے اور اسلئے الفاظ کے محاورات و اصطلاحات سے واقفیت کی صورت میں جس طرح انسان ان کے معانی تحت اللفظ کے سمجھنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ان معانی کے مطالب و مقصود اصلی کے استفادہ کا حق بھی ہے۔

اسی لئے کثیر التعداد احادیث میں مختلف مقامات پر ائمہ معصومین علیہم السلام نے احکام شرعیہ کے استفادہ کے لئے آیات قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے رواۃ احادیث کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن مجید سے شرعی احکام کو حاصل کریں۔

بے شک یہ امر ملحوظ رہے کہ کنایات اور مجازات کی تعیین میں ان تمام اصول و شرائط کو مد نظر رکھنا ہوگا جو اہل زبان نے مقرر و معین کئے ہیں۔

مثلاً اگر معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن ہے اور اس کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ معنی مجازی یا کنایہ پر اس کا محمول کرنا اصول تکلم کے لحاظ سے درست نہ ہوگا اور صرف اپنے ذاتی خیال کے مطابق جو کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے ایسا کرنا تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج ہوگا۔

اسکے علاوہ جب معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے کنایہ یا مجازی معنی کو مراد لینا درست ہوگا جو محاورہ اور استعمال عرفی کے مطابق ہوں۔ ایک ایسے بعید معنی پیدا کرنا جو اس معیار کے تحت میں داخل نہ ہوتے ہوں اصول تکلم کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں یہ کہنا کہ مراد خداوند عالم یہی ہے تفسیر بالرائے کا صحیح مصداق ہوگا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

(۱)

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کے معجزات کا تذکرہ ہے۔

انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ وابرئ الاکمہ والابرص واحیی الموتیٰ باذن اللہ۔

اسکے صاف یہ معنی ہیں کہ حضرت عیسیٰ مٹی سے ایک مجسمہ بصورت طائر بناتے تھے اور اس میں پھونکتے تھے وہ بحکم خدا سچ مچ کا پرندبن جاتا تھا کور مادر زاد اور کوڑھی کو شفا بخشتے تھے اور مردوں کو بحکم خدا زندہ کرتے تھے۔"

یہ امر کسی عقلی بداہت اور نظریہ کے خلاف نہیں ہے کہ حضرت احدیت کے حکم سے اسکے کسی مخصوص بندہ کے ہاتھ پر اس قسم کے عجائب کا ظہور ہو۔

لیکن بعض اصحاب نظر نے جو معجزات انبیاء کے قائل نہیں ہیں آیت کے عجیب عجیب معانی بتلائے ہیں ۔

"مٹی سے" کی لفظ سے مراد ہی انسان کہ جو مٹی سے بنایا گیا ہے۔

"پرند کی صورت" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صلاحیت پیدا کی جائے فضائے روحانیت میں اڑنے کی" پھونکنے سے" مراد ہی ہدایت کی روح کا پہونچانا اور" تکون طیرًا باذن اللہ" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معارف وہدایات کو حاصل کر کے ہوائے معرفت میں پرواز کرنے لگتا ہے، اندھے اور کوڑھی کو شفا دینے کے معنی ہیں ان لوگوں کو ہدایت کرنا جو بالکل علوم و معارف سے بے بہرہ تھے۔ اور" مردوں کو زندہ کرنے" کے معنی کافروں کو مومن بنانا اور گمراہوں کو ہدایت کرنا۔

ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح الفاظ کی دنیا میں کایا پلٹ ہوگئی۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو کلام الٰہی چیستان بنجائے اور بالکل اصول وقوانین کلام سے دور جا کر گر پڑے۔

اس کو تفسیر بالرائے سمجھنا ضروری ہے اور کسی سیدھے سادھے مسلمان کو اسکی جرأت نہیں ہوسکتی اور نہ جائز سمجھی جاسکتی ہے۔

(۲)

قرآن مجید میں روز قیامت اور اسکے علامات، حشر ونشر اور مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کا بہت آیتوں میں تذکرہ ہے۔

یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی چیز قرآن میں اس کثرت کیساتھ اور اتنی اہمیت دیکر نہیں بیان کی گئی ہے جس قدر روز قیامت کا تذکرہ۔

لیکن حضرت بہاء اللہ مازندرانی کی امت جو "بابی بہائی" کے نام سے معروف ومشہور ہے وہ ان تمام آیتوں کے معانی دوسرے کہتی ہے۔ وہ "قیامت" سے مراد ظہور الٰہی یعنی خداوند عالم کے خاص نمایندہ کا ظہور "نفخ صور" سے مراد ہدایت کرنے والے کی آواز" مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے" سے مراد بے علم وعرفان افراد کا روح علم سے زندہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس طرح دنیائے لفظ ومعنی میں انقلاب پیدا کردیتے ہیں۔ اس کو کسی طرح کلام الٰہی کی صحیح تفسیر کے تحت میں نہیں لایا جاسکتا۔

(۳)

قرآن میں آیت ہے۔

ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم "مہر لگادی خدانے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور انکی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے لئے سخت عذاب ہے"

بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کفار ومشرکین کی مذمت ہے لیکن بعض ارباب عرفان نے اس کو اہل معرفت اور ارباب عشق صادق کی مدح قرار دیا ہے۔

خدا نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی یعنی علامت قرار دیدی کہ یہ خاص میرے لئے ہیں اور انکی آنکھوں پر پردے ہیں یعنی ماسوی اللہ کوئی چیز اُن کی نظروں میں سماتی ہی نہیں اور اُن کے لئے عذاب دردناک ہے یعنی وہ محبت کی سختیوں کو جھیل رہے ہیں اور پھر عذاب " عذوبت " سے بھی مشتق ہے جس کے معنی " خوشگواری " کے ہیں اور محبت کی سختی میں ایک خاص خوشگواری و شیرینی بھی ہوتی ہے ۔

اس قسم کے تاویلات صرف تفریح طبع کے لئے خوب ہیں لیکن کلام الٰہی اور اسکے معنی سے اُن کو دور کا بھی تعلق نہیں ہے ۔
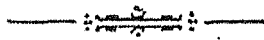
اسی باب سے ملحق ایک شعبہ یہ ہے کہ عام مفہوم کی لفظ کو کسی ایک فرد مخصوص میں متعین کیا جائے اسکے لئے دلیل خاص کی ضرورت ہے اگر ایسا نہ ہوگا تفسیر بالرائے قرار پائے گی ۔ مثال والعصر ان الانسان لفی خسر " قسم ہے وقت عصر کی ۔ یقیناً انسان نقصان اور گھاٹے میں ہے " بعض واعظین سے سنا جاتا ہے کہ عصر جس کی قسم کھائی گئی ہے عصر روز عاشورا ہے ورنہ کوئی عصر اس کی مستحق نہیں کہ حضرت احدیت اُس کی قسم کھائے ۔

یہ بہت کھلی ہوئی تفسیر بالرائے ہے جو کسی طرح جائز نہیں ۔ بے شک اگر ایسے امور بطور احتمال ذکر کئے جائیں کہ شاید یہ مراد ہو اور بعید نہیں کہ ایسا مقصود ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ۔
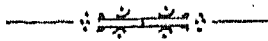
چوتھا درجہ یعنی الفاظ کے معانی و مطالب پورے ہو چکنے کے بعد اس بات کا پتہ لگایا جائے جس کی طرف اُس کلام سے اشارہ ہو ۔ یہ الفاظ کے معنی و مطالب سے خارج چیز ہے اور اس لئے نہ افہام و تفہیم کے حدود اُس کو اپنے اندر لیتے ہیں اور نہ محاورہ و گفتگو کے اصول اُس کو معتبر قرار دیتے

ہیں اور اسی بنا پر جیسا کہ سابق میں ذکر ہوا یہ معنی جو اشارۃً نکالے جاتے ہیں نہ متکلم کی طرف منسوب ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ اُن کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے ۔

قرآن مجید میں ایسے اشارات و رموز موجود ضرور ہیں اور یہی وہ ہیں جن کو باطن قرآن بتلایا گیا ہے جس طرح کہ پہلے درج والے معانی و مطالب ظاہر قرآن میں داخل ہیں ۔

اور اسی بنا پر ظاہر قرآن ایک ہے لیکن بطون قرآن متعدد ہیں یہاں تک کہ ارشاد ہوا ہے ان للقرآن سبعین بطنا "قرآن کے ستر باطن ہیں" کیونکہ ظاہر قرآن کی بنیاد معانی الفاظ پر ہے اور معنی ایک لفظ کے بوقت واحد ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے لیکن باطن کی بنیاد رموز و اشارات پر ہے اور اشارہ ایک چیز سے متعدد امور کی طرف ممکن ہے ۔

وہ ظاہر قرآن وہ ہے جس کے سمجھنے کا سب کو حق دیا گیا ہے جو عربی زبان کے خصوصیات سمجھ سکیں لیکن باطن قرآن وہ ہے جس کے مخصوص اہل ہیں اور ہر شخص کو اس میں طبع آزمائی کا حق نہیں ہے ۔

بات یہ ہے کہ اس قسم کے اشارات کی تعیین لفظ اور اس کے معنی سے تو تعلق رکھتی نہیں جس کو عام اصول و محاورہ کے مطابق سمجھا جا سکے بلکہ زیادہ تر سامع کی افتاد طبع اور ذہنیت کی تابع ہوا کرتی ہے اور اس لئے عام اشخاص کے کلام میں جب ہم اس قسم کے اشارات کی تعیین کریں تو وہ ہمیشہ واقع کے مطابق نہیں ہوا کرتی بلکہ سوء ظن یا سابق و حال واقعات کے جوڑ توڑ کا نتیجہ ہوتی ہے اور اکثر متکلم کو وہ اشارہ یا تعریض مد نظر بھی نہیں ہوتی جسے ہم نے اُس کے سر منڈھ دیا ہے ۔

پھر جب معمولی اشخاص کے کلام میں عقل انسان مکمل رہنمائی نہیں کرتی تو خداوند عالم کے کلام میں یہ ناقص و غیر مکمل عقول کہاں صحیح نقطہ تک رہبری کر سکتے ہیں ۔ اسلئے غلطی کا ہونا اس میں ناگزیر ہے ۔

ایسے رموز و اشارات کی تعیین اور ظاہر لفظ سے آگے معنی نکالنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے جسکی

ممانعت کی گئی ہے الفاظ کے ظاہر معنی کو سمجھ کر اسکے مضمون پر عمل کرنا یا اُس کو بیان کرنا ہرگز ہرگز تفسیر نہیں ہے کیونکہ تفسیر کے معنی تو غیر ظاہر کو ظاہر بنانے کے ہیں۔ یہ اُسی پر منطبق ہے جس میں ایک غامض و مخفی امر کا کشف ہوتا ہے اور وہ یہ چوتھی صورت ہے۔

پھر اس کے علاوہ ممانعت تفسیر بالرائے کی ہوئی ہے۔ پہلے مراتب مدارج جو ہیں انکی بنیاد محاورات عرب کے تتبع اور زبان دانی، واقفیت الفاظ و معانی پر ہے۔ وہ اگرچہ عقل پر موقوف ہے، بایں معنی کہ ایک مجنون اُس کو حاصل نہیں کر سکتا لیکن اُن معانی کی تعیین براہ راست عقلی غور و خوض سے تعلق نہیں رکھتی۔ برخلاف چوتھے درجہ کے کہ وہ نہ تو تتبع لغات پر مبنی اور نہ زبان دانی و وسعت نظر سے متعلق ہے بلکہ پورے طور سے اس میں عقل آرائی و طبع آزمائی کو دخل ہے کہ ہو نہو متکلم نے اس کلام سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ چیز وہ ہے جس سے ممانعت ہوئی ہے۔

قرآن مجید کے آیات میں خود قرآن مجید نے تفریق کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے منہ ایات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم۔

"اُس میں کچھ تو محکم آیتیں ہیں جن پر عمل بالقرآن کی بنیاد قائم ہے اور کچھ متشابہات ہیں، وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجروی ہے وہ متشابہ حصہ کی پیروی کرتے ہیں تاکہ فتنہ پردازی کریں اور طرح طرح کی تاویلیں کریں حالانکہ اُس کی حقیقی تاویل سے سوائے خدا اور راسخین فی العلم کے کوئی واقف نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے دو حصے ہیں۔ ایک محکم اور ایک متشابہ۔

یہ تفریق بھی درحقیقت اسی پر مبنی ہے یعنی بعض آیات تو وہ ہیں جس کے معنی ظاہری موجود ہیں

اور کوئی عقلی و نقلی قرینہ اسکے خلاف موجود بھی نہیں ہے۔ یہ محکمات ہیں اور ان کے ظاہری معنی تنزیل قرآن ہیں اور انکے سمجھنے اور اتباع کرنیکا ہر شخص کو حق دیا گیا ہے۔ اور بعض آیات وہ ہیں کہ جن کے کوئی معنی ظاہری نہیں بلکہ مجمل و مبہم الفاظ ہیں یا جو کچھ معنی ظاہری ہیں وہ کسی دلیل عقلی یا نقلی کی بنا پر غیر ممکن الوقوع ہیں اور مراد نہیں لئے جاسکتے اور اسکے خلاف کوئی معنی ظاہری ہیں نہیں، بلکہ ان آیات کے معانی صرف رموز و اشارات کے طور پر ہیں۔

یہ معانی باطن قرآن ہیں اور ان کی تعیین و تشخیص تاویل قرآن ہے اور اس کا دروازہ عام افراد کے اوپر بند کیا گیا ہے اور راسخین فی العلم کے ساتھ مخصوص قرار دیدیا گیا ہے۔

وہ لوگ جو دنیا کے ہر مسئلہ کو قرآن سے ثابت کرنے کے متوقع ہیں اور اپنے مطالبہ کے ثبوت میں ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین کو پیش کرتے ہیں اور اس بنا پر جس چیز کا ثبوت قرآن مجید میں نہو اسکے ماننے پر تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ قرآن میں دنیا کا ہر خشک و تر موجود ہے تو اگر یہ بات بھی کوئی اصلیت رکھتی تو قرآن میں ضرور موجود ہوتی اور جبکہ قرآن میں نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے۔

ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ قرآن مجید نے تو خود اپنی تفریق دو حصوں میں کردی ہے ایک حصہ محکمات۔ دوسرا متشابہات۔ محکمات کے معانی ظاہر قرآن ہیں اور متشابہات کے معانی باطن قرآن۔

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین اسکے ضرور یہ معنی ہیں کہ ہر چیز قرآن کے اندر ہے لیکن اس میں یہ نہیں بتلایا گیا ہے کہ وہ ظواہر قرآن کے اندر ہی موجود ہے بلکہ کثیر حصہ ان اشیا کا بواطن قرآن سے تعلق رکھتا ہے۔

اب قرآن مجید کے ظاہری مطالعہ و جستجو کے بعد کسی خاص امر کے متعلق حکم لگا دینا کہ وہ قرآن مجید میں نہیں ہے دیسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص ہندوستان کے صوبہ اودھ میں کسی شخص کی جستجو کرکے

حکم لگادے کہ وہ ہندوستان میں نہیں ہے حالانکہ وہ صوبہ پنجاب میں موجود ہے۔

قرآن مجید کا بسم اللہ کی ابتداء سے سورۂ ناس کی انتہا تک پورا تتبع بھی کیا جائے تو اگرچہ پورے قرآن کی جستجو ہوگی لیکن حقیقۃً وہ ظواہر قرآن کے حصہ تک محدود ہے کیونکہ بواطن تک عام عقلیں پہونچنے سے عاجز ہیں۔

وہ لوگ کہ جو ہر چیز کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کا خود دعویٰ کر بیٹھتے ہیں جیسا کہ بعض واعظین اہل منبر کا وتیرہ ہے اور وہ اس کو اپنے تبحّر واقتدار علمی کا ایک روشن برہان دکھلاتے ہیں وہ خود چونکہ راسخین فی العلم میں سے نہیں ہیں اور اسلئے ان کے عقول وافہام بواطن قرآن تک پہونچنے سے قاصر ہیں اسلئے اس علم بالقرآن کی ہوس میں وہ قدم قدم پر تفسیر بالرائے کے خطرناک اور مہلک میدان میں پہونچ جاتے ہیں جس سے فلیتبوأ مقعدہ من النار (اپنی جگہ آتش دوزخ میں بنائے) والی ہولناک وعید کی زد میں آجاتے ہیں۔

درحقیقت انسان کے لئے یہ امر کامیابی کی نشانی ہے کہ اگر وہ کسی بات کو نہیں جانتا تو احساس بھی کرے کہ میں نہیں جانتا اس لئے کہ اس صورت میں وہ رہنما کا طالب ہوگا اور حقیقت کو دریافت کرے گا لیکن خطرناک ہے وہ صورت کہ لاعلمی میں علم کے خواب دیکھے یعنی کسی بات کو نہ جانتا ہو اور خیال یہ کرے کہ میں اسے خوب جانتا ہوں۔ وہ ہر ہر قدم پر غلطی کا مرتکب ہوگا کسی منزل پر چلنے والا یا خود آنکھیں رکھتا ہو جن سے دیکھکر راستہ قطع کرے یا کسی آنکھوں والے کا ہاتھ پکڑے جو اس کو اپنے ساتھ لے جائے نتیجہ میں یہ بھی منزل تک پہونچ ہی جائیگا لیکن غضب یہ ہوگا کہ خود آنکھیں نہوں اور دماغ میں فتور ایسا ہو کہ سمجھے میرے آنکھیں موجود ہیں۔ یہ قدم اٹھائیگا تاریکی میں اور کسی کو ہاتھ پکڑنے کے لئے آواز بھی نہ دیگا بلکہ مونھ اٹھا کر چل کھڑا ہوگا۔ اس کو ہر قدم پر خطرہ ہے کہ دیوار سے ٹکرا جائے۔ گاڑی کے نیچے دب جائے۔ موٹر سے لڑ جائے یا

نالے کھولے گڑھے میں گر جائے اور ہلاک ہو جائے۔ یہی صورت ہے اُن اشخاص کی جو خود علم قرآن رکھتے نہ ہوں لیکن خیال یہ ہو کہ حسبنا کتاب اللہ "کتاب خدا ہمارے واسطے کافی ہے"۔

یہ قرآن کے غامض وتاریک راستوں میں قدم اٹھائیں گے بغیر کسی راہنما کی ہدایت کے نتیجہ یہ ہوگا کہ بھٹکیں گے اور منزل مقصد سے دور جا گریں گے اور یہی معنی ہیں قول جناب رسالتمآبؐ کے انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی وانھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض "میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں ایک کتاب خدا اور ایک اپنی عترت۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی میرے بعد گمراہ نہ ہوگے اور یہ دونوں جدا نہ ہو سکیں گے۔ جب تک میرے پاس حوض کوثر تک نہ پہونچیں یعنی قیامت کا موقع نہ آئے"۔

لوگوں کو لن یفترقا کے معنی سمجھنے میں دھوکا ہوا اور انھوں نے خیال کیا کہ اس کے معنی مکانی یا زمانی تفرقہ کے ہیں اس بنا پر اکثر ہمارے سامنے یہ سوال بھی پیش کیا گیا ہے کہ رسالتمآبؐ نے تو فرمایا ہے لن یفترقا یہ دونوں جدا نہ ہوں گے حالانکہ بحالت موجودہ قرآن مجید ہمارے پاس موجود اور امام غائب ہیں۔

لہٰذا دونوں میں تفرقہ ہو گیا لیکن درحقیقت لن یفترقا کے معنی یہ ہیں ہی نہیں بلکہ جس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے لا نفرق بین احد من رسلہ۔ یریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ۔ ان الذین امنوا باللہ ورسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اور ان تمام آیات میں تفریق سے مراد یہ ہے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں اسی طرح کتاب و اہلبیت میں بحیثیت تمسک تفریق اس طرح ہے کہ ان میں سے ایک کا تمسک کیا جائے اور دوسرے کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔

رسالتمآب نے ارشاد فرمایا ہے ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے گمراہ نہو گے، لن یفترقا کے جملے سے درحقیقت اس "دونوں" کے لفظ کی تاکید کی گئی ہے یعنی کبھی یہ خیال نہ کرنا کہ ہم ایک سے تمسک کرلیں یہ کافی ہے۔ نہیں یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ اگر ان میں سے ایک یعنی قرآن کیساتھ تمسک کا دعوی ہوا لیکن اہلبیت کا دامن ہاتھ میں نہ ہوا تو خود قرآن بھی دامن چھوڑ کر الگ ہو جائیگا۔ اسی بنا پر کہ قرآن کے حقیقی اسرار و دقائق سمجھنے کے لئے ذاتی بصارت نہ ہونے کی صورت میں رہنما کی ضرورت ہے جبکہ خود راسخین فی العلم میں سے نہیں تو راسخین فی العلم کا دامن ہاتھ میں ہو۔

بے شک اس وقت تمسک بالقرآن بھی ہوگا اور تمسک بالعترۃ بھی اور اگر نہ خود راسخین فی العلم سے اور نہ ان کا دامن ہاتھ میں تو فہم قرآن کے عمیق وادی میں نہ ذاتی بصارت نہ رہنمائی کو حاضر اور نہ ہاتھ پکڑ کر ساتھ لیجانے والا موجود۔ اب جو قرآن پر عمل کے لئے قدم بھی اٹھایا تو ہر ہر قدم پر لغزش اور رفتہ رفتہ نقطۂ حقیقت سے ہزار ہا کوس دور۔ اس طرح عترت کا دامن تو ہاتھ سے چھوٹا ہی تھا عمل بالقرآن بھی رخصت ہوا۔ اور قرآن اور عترت دونوں ہی سے محرومی ہوئی۔

——— ※ ———
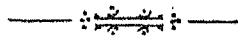
سابق اور حال تبصرہ کے بیانات کی مدد سے غور و فکر کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں

(۱) قرآن مجید کا ترجمۂ ظاہری یعنی الفاظ کے تحت اللفظی معنی کہنے کا حق ہر واقف زبان عربی کو ہے جس کو عربی الفاظ کے معانی پر اتنا عبور حاصل ہو کہ وہ لغت کی مدد سے سہی ہر لفظ کے معنی سمجھ سکتا ہو اور قرائن مقام کی مدد سے مشترک الفاظ میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کر سکتا ہو لیکن ایسے اشخاص کا ترجمۂ قرآن کے لئے کھڑے ہونا جو عربی کے محاورات سے اسطرح واقف نہیں ہیں خود غلطی میں مبتلا ہونا اور دنیا کو گمراہی میں ڈالنا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تراجم قرآن جو موجود ہیں ایسا

سے اکثر ایسے ہی اشخاص کے قلم سے ہیں اور اس لئے اُن کا ضرر نفع سے بیشتر ہے۔

(۲) قرآن مجید کے معانی و مطالب جہاں تک ظواہر قرآن کے ساتھ متعلق ہیں ہر شخص کو اُن میں غور و فکر کرنے کا حق اور نتائج نکالنے کا موقع حاصل ہے۔ قرآنی آیات سے استدلال کبھی انکے ظواہر معانی کی بنا پر ہر شخص کے لئے صحیح ہے بشرطیکہ اس میں اصول محاورہ و تکلم کا لحاظ رکھا جائے عام و خاص مطلق و مقید مجمل و مبین منسوخ و ناسخ کا خیال کرنا ضروری ہے۔

اگر انسان میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھ سکے تو بے شک جو کچھ ظواہر قرآن سے وہ استفادہ کرے اُس کو صحیح سمجھنا اور اُس سے استدلال کرنا اُس کے لئے درست ہوگا۔ اس کے لئے احادیث معصومینؑ سے مدد لینے کی ضرورت نہ ہوگی لیکن افسوس ہے کہ قرآن فہمی کا دعویٰ رکھنے والے افراد اکثر مذکورہ بالا خصوصیات کی واقفیت سے عاری ہوتے ہیں۔

اس صورت میں قرآن کے مطالب پر غور کرنے اور اُس سے استدلال کرنے سے سوائے گمراہی کے کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہو سکتا۔

(۳) قرآن کے مضامین پر غور و فکر کرنے سے جو رموز و اسرار پیدا ہوں، علمی نکات برآمد ہوں فلسفی انکشافات کا پتہ چلے۔ ادبی محاسن کا اندازہ ہو انھیں سمجھنے کی کوشش کرنا سمجھنا اور پھر دنیا کے سامنے پیش کرنا مستحسن خدمت ہے جس کے مقبول ہونے کے لئے معانی و مطالب کے گذشتہ معیار پر سمجھنے کے ساتھ ذوق سلیم اور قوت نظر و فراست اور ایک حد تک ذہانت و ذکاوت کی ضرورت ہے اس قسم کی نکتہ پردازی و موشگافی بارگاہ تفسیر میں اُس وقت مقبول ہو سکے گی جب اُس علمی نکتہ رمز، یا انکشاف کے ثابت کرنے کے لئے صحیح معنی و مضمون قرآن میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو اور اُس کے انہی معانی سے کہ جن کا معیار ابھی بیان کیا جا چکا ہے وہ نکات و رموز پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) قرآن مجید کے اصلی معانی و مطالب کو محفوظ رکھنے کے ساتھ اُن کے مصداق صحیح کا پتہ

لگانے میں اگر تاریخی اور جغرافیائی، فلسفی معلومات اور جدید انکشافات سے مدد مل رہی ہو تو ان معلومات سے مدد لینا اور قرآنی آیت کے صحیح مصداق کا پتہ چلانا درست ہوگا قابل اعتراض سمجھا نہیں جائے گا۔

(۵) "متشابہات" یعنی ایسے آیات جن کے ظاہری معنی کچھ متعین نہیں ہیں۔ بلکہ صرف رموز واشارات کے طور پر ان کے معانی کا تعین ہو سکتا ہے ان کے معانی کے تعین میں عقل سے کام لیکر ان اشارات و رموز کا قطعی طور پر انکشاف کرنا درست نہیں ہے بلکہ اس میں "راسخین فی العلم" سے تمسک کی ضرورت ہے۔

بے شک اگر عقل پر زور دیکر کچھ اشارات بطور احتمال پیدا کئے جائیں اور انھیں صرف امکانی حدود کے اندر رکھا جائے یقین کے ساتھ کہنے کی جرأت نہ کی جائے کہ ان آیتوں سے مراد یہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کے لئے اسوقت بھی دروازہ بند نہیں ہوگا کہ جب کسی حادثے نے اس رمز و اشارہ کی کوئی خاص جہت بتلادی ہو۔ اسلئے کہ قرآنی آیات کے یہ اشارات صرف دو ایک جہتوں میں منحصر نہیں بلکہ کثیر التعداد وجوہ رکھتے ہیں جیسا کہ احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام سے ثابت ہے اسلئے کوئی ایک جہت احادیث سے ثابت ہو گئی ہے تو اس کی بنا پر غیر ممکن نہیں ہے کہ اور جہتیں بھی پائی جاتی ہوں اور ان کا احتمالی طور پر ذاتی غور و فکر سے استخراج کیا جا سکے۔

(۶) وہ آیات جن کے اصلی و حقیقی معنی قرینۂ عقلی یقینی کی بنا پر مراد لئے جانا ممکن نہیں ہیں جیسے الرحمٰن علی العرش استوی۔ ید اللہ فوق ایدیھم وغیرہ ان میں معنی حقیقی سے علیحدہ ہونے کے بعد پھر اگر اصول محاورہ و تکلم ہی کی بنا پر معنی قریب عام روزمرہ پائے جاتے ہوں تو یہ "متشابہات" نہ سمجھے جائینگے جیسے ید کے معنی "ہاتھ" نہ ہونے کی صورت میں "قدرت و طاقت" یہ بالکل اصول محاورہ کے مطابق ہیں۔

ان معانی کی تعیین بھی صرف عقل سلیم اور محاورہ دانی سے متعلق ہے لیکن اگر اصلی معنی مراد لئے جانا
ممکن نہوں اور اُن کے علاوہ کوئی معنی قریب عرفی یعنی عام روزمرہ کے مطابق نہوں تو پھر یہ آیات
"متشابہات" قرار پائینگے اور ان کے لئے یقینی طور پر بغیر "راسخین فی العلم" کے بتلائے ہوئے
کچھ کہا نہیں جاسکے گا امکانی اور احتمالی وجوہ کا بیان کرنا بے شک صحیح ہے اور ممنوع نہیں ہے۔

(۷) وہ الفاظ جن کے لئے ظاہری معانی موجود ہیں اُن کے لئے کبھی بطور رمز و اشارہ کچھ
معانی پائے جاسکتے ہیں انھیں بھی جبکہ اہل الذکر اور راسخین فی العلم سے ماخوذ نہوں بطور
احتمال بیان کرنا درست ہے احادیث ائمہ میں اس قسم کے معانی باطنیہ بہت مذکور ہیں انہی کا نام
"تاویل" ہے اور یہ انہی حضرات کا مخصوص حصہ ہے۔

(۸) جن آیات کے لئے معنی باطنی بطور تاویل ائمہ معصومینؑ کی جانب سے بیان کئے گئے ہوں
یا ذاتی غور و فکر سے بصورت احتمال پیدا کئے جائیں اس تاویل کی بنا پر اُس آیت کی تنزیل یعنی اصلی
ظاہری معنی بالکل نظر انداز نہ ہوجائینگے بلکہ وہ پھر بھی قابل لحاظ اور واجب الاتباع ہوں گے
اور اگر کسی عقیدہ یا عمل کا اُن کے ساتھ تعلق ہے تو اُن کی پابندی لازم ہوگی۔

یہی بہت بڑا فرق ہے معنی مجازی میں کہ جو لفظ کے اصلی معنی کو چھوڑ کر مراد ہوا کرتے ہیں اور
معنی رمزی میں کہ جو بطور اشارہ مقصود ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں اصلی معنی بالکل نظر انداز ہوتے ہیں
اور اُن سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ دوسری صورت میں اصلی معنی بھی محفوظ رہیں گے اور اُنکی پابندی لازم ہوگی۔
اس کو اپنے روزمرہ کے محاورات پر نظر کر کے سمجھا جائے پھر قرآن مجید سے اسکی مثال پیش کیجائے۔
مثلاً ایک شخص نے کہا کہ فلاں محفل میں جو گیا۔ دیکھا شیر بیٹھا ہے۔ ہاتھ پیروں میں لرزہ
پڑ گیا" محفل کا ذکر کرنا قرینہ ہے اس کا کہ "شیر" سے کوئی پُر رعب و ہیبت انسان مراد ہے
اصلی شیر نہیں ہے۔

اب اگر اس متکلم نے کسی دن یہ کہا کہ میں نے "سب جانور دیکھے شیر آج تک نہیں دیکھا" تو اس سے بطور اعتراض یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم نے ابھی اس دن کہا تھا کہ میں نے شیر دیکھا۔ یہ اعتراض ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ جب شیر سے مراد ایک مخصوص شیر صفت انسان ہو گیا تو اب شیر کے اصلی معنی سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا، نہ اسکے صدق و کذب کے لئے اصلی جانور شیر کا دیکھنا نہ دیکھنا معیار بن سکتا ہے۔ یہاں اصلی معنی بالکل نظر انداز ہو گئے اور بالکل قابل لحاظ نہیں رہے۔

اب دوسرا جملہ ملاحظہ ہو۔ ایک شخص کسی ایسے انسان پر تعریض کرتے ہوئے جس کی آنکھوں میں خدانخواستہ بصارت کم ہے یہ کہتا ہے کہ خدا کے فضل سے میری آنکھوں میں بصارت کم تھوڑی ہے۔ یقیناً اس سے یہ کہنا مقصود ہے کہ فلاں شخص کی آنکھوں میں بصارت کا پتہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی بنا پر وہ خود اپنے الفاظ کی پابندی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کا یہ کہنا جب ہی درست ہوگا جب حقیقۃً اس کی آنکھوں میں بصارت کم نہ ہو۔ لیکن اگر تھوڑی دیر میں اس نے خود ضعف بصارت کی شکایت کی تو اس کا یہ کلام لغو، مہمل اور غلط سمجھا جائیگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں اصلی معنی نظر انداز نہیں ہوئے ہیں اور ان کے محفوظ رہتے ہوئے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن میں ان دونوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں بہت باتیں ایاک اعنی و اسمعی یا جارۃ کے طور پر کہی گئی ہیں یعنی بظاہر خطاب کسی سے ہے اور مقصود کسی اور کو سنانا ہے جیسے یہ آیت۔

لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین۔

"(اے رسول) اگر تم شرک اختیار کرو تو تمہارا عمل رائگاں ہو جائے، اور تمہیں نقصان اٹھانا پڑے" حقیقۃً یہ تنبیہ رسالتمآب کے لئے نہ تھی بلکہ دوسرے اشخاص سے متعلق ہے جو رسول کو آواز دیکر کی جا رہی ہے۔

حقیقی مقصود دوسرے لوگوں کے متعلق کہنا ہے کہ شرک کرنے کے بعد کوئی عمل قابل اعتبار نہ ہوگا۔ اب کوئی شخص استدلال کرنا چاہے یا اعتراض کرے کہ کلمہ "ان" عربی میں محتمل الوقوع بات کیلئے آتا ہے رسول سے کہنا کہ لئن اشرکت پتہ دیتا ہے کہ آپ سے شرک کے وقوع کا احتمال تھا اور یہ آپ کی عصمت کے خلاف ہے" تو یہ استدلال یا اعتراض درست نہ ہوگا اس لئے کہ حقیقۃً یہ خطاب جب دوسروں کی تنبیہ کے لئے ہوگیا تو اس کے نتیجہ کا تعلق آپ کے ساتھ باقی ہی نہیں رہا بلکہ دوسروں کی جانب ہوگیا۔

۴۔ قرآن مجید میں بہت جگہ یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ کی لفظ ہے جس کے اصلی و ظاہری معنی نماز اور زکوٰۃ کے ہیں۔ اگر بعض روایات میں یہ نظر سے گذرے کہ اقامۂ صلوٰۃ اشارہ ولایت کے عقیدہ کی طرف ہے جو سبب درستی عبادات ہے۔ تو بے شک یہ اشارہ اپنی جگہ پر درست ہوگا اور حق و صدق لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ یہ آیت وجوب نماز کی دلیل ہی نہ ہے اور کہا جائے کہ اس سے تو "ولایت ائمہ معصومین" مراد ہوگئی اب اس کو نماز سے کیا تعلق۔ یہ مغالطہ ہوگا جو بالکل غلط ہے۔ اس آیت میں نماز کا حکم ہے اور پھر اشارہ وجوب ولایت کی طرف ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے معنی بالکل نظر انداز ہوگئے ہوں اور دوسرے معنی بطور استعمال لفظی مراد ہوں۔

تاویل آیات کی مختلف اقسام

آیات قرآن کی تفسیر و تاویل جو احادیث میں مذکور ہوتی ہے اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں جن میں اکثر اشخاص کو اشتباہ ہوتا ہے اور اسلئے نتائج کے اخذ کرنے میں دھوکا کھاتے ہیں

(۱) بعض احادیث ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں کسی آیت کے شان نزول اور مورد ورود کی تعیین کی جاتی ہے کہ یہ آیت کس موقع پر وارد ہوئی تھی۔ اس قسم کے احادیث سے ان آیات کے

عموم یا خصوص پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ الفاظ قرآن اگر عمومی حیثیت رکھتے ہیں تو شان نزول کے مخصوص ہونے کی وجہ سے ان میں خصوصیت پیدا نہیں ہوگی۔ بیشک اگر الفاظ آیت ہی کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اُن میں خود عموم نہیں پایا جاتا تو حدیث اس وقت میں ایک تاریخی حقیقت کے انکشاف کا فائدہ دے گی کہ آیت میں شخص خاص سے مراد کون ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

(۱) افمن کان مؤمنا، کمن کان فاسقا لا یستوون "کیا جو شخص مومن ہو وہ برابر ہے اس شخص کے جو فاسق ہو نہیں کبھی نہیں یہ دونوں برابر نہیں ہیں"۔ اس سے یہ کلیہ ثابت ہے کہ مومن اور فاسق عزت و احترام۔ احکام و حقوق میں مساوی نہیں سمجھے جا سکتے۔ بیشک ایسا ہی ہے۔ اگرچہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت شان امیر المومنینؑ میں وارد ہوئی ہے جبکہ آپ سے ولید بن عقبہ نے مفاخرت کرنا چاہی ہے مومن سے مراد امیر المومنینؑ اور فاسق سے ولید بن عقبہ مراد ہے۔

(۲) یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق نبأ فتبینوا۔

"اے جماعت مومنین اگر فاسق تمہاری طرف کوئی خبر لائے تو تحقیق ضروری سمجھو"۔

اس سے یہ کلیہ قائم ہو گیا کہ فاسق کی خبر بغیر تحقیقات قبول نہ کی جائے یعنی معتبر نہ سمجھی جائے حالانکہ روایات سے ثابت ہے کہ اس آیت کا مورد نزول ولید بن عقبہ ہے۔

دوسری قسم کی مثال جس میں پہلا جز و پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی	جائز ہے تمہارے لئے شب ماہ صیام مقاربت
نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس	کرنا اپنی عورتوں کے ساتھ وہ تمہارے لئے ہیں
لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون	اور تم اُن کے لئے خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کیا

انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم۔ کرتے تھے۔ اب خدا نے تمھیں معاف کر دیا۔

اس آیت میں پہلا جز حکم کی صورت رکھتا ہی جو آئندہ سے متعلق ہی۔ اس میں عموم ہی اگرچہ مورد نزول معین اشخاص سے متعلق تھا لیکن حکم عمومی حیثیت رکھتا ہی لہذا ہمیشہ کے لئے قائم ہے دوسرا جز وکہ "خدا کو معلوم ہے تم خیانت کرتے رہے مگر خدا تم کو معاف کرتا ہے"۔

یہ بیان واقعہ کی صورت رکھتا ہی جو ماضی سے متعلق ہی اس سے خود ظاہر ہے کہ وہ کچھ مخصوص افراد ہوں گے جو ایسا کرتے ہونگے اور اُن کو معاف کیا گیا ہی۔

روایات نے بھی انکے اسمار بتا دئے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں اس سے کوئی عمومی کلیہ نہیں قائم ہو سکتا اور نہ مورد آیت کے بعد آنے والے لوگ اُس سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں مثلاً مجرمیں اپنے لئے ایک عمومی پروانۂ عفو و مغفرت گذشتہ جرموں کا خیال کر لیں کہ جو کچھ جو کرے۔ معاف کیونکہ خدا نے گذشتہ خیانتوں سے درگذر کی ہی اور ظاہر ہے کہ ہر گناہ ہو چکنے کے بعد تو گذشتہ ہی میں داخل ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض آیتوں میں لفظی حیثیت سے عموم وشمول کا پہلو ہوتا ہے لیکن قرینۂ مقام اور سیاق کلام خود بتاتا ہے کہ اُس سے خاص اشخاص مراد ہیں یہاں بھی جو احادیث اُن خاص اشخاص کا مصداق بتائیں وہ حکم انہی افراد سے مخصوص سمجھا جائیگا۔ مثال

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔ تمھارا مالک بس خدا ہے اور اُس کا رسول اور وہ ایمان لانے والے جو نماز قائم کرتے ہوں اور زکوٰۃ دیتے ہوں ایسی حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔

الفاظ ظاہری حیثیت سے بیشک عموم رکھ سکتے ہیں یعنی ہر وہ شخص جو نماز پڑھنے کے ساتھ حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرے لیکن سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص قسم کے منصب حکومت

کی قراردادی جس کے لئے نامزدگی خصوصیت کی مقتضی ہے۔

اب اگر روایات نے بتادیا کہ یہ آیت امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے تو وہ کسی دوسرے شخص سے متعلق نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کسی درجہ تک صفت ایمان اور نماز گذاری کے ساتھ متصف بھی ہو اور حالت رکوع میں زکوٰۃ بھی ادا کرے۔

(۲) بعض احادیث کسی مفہوم وسیع کلی کے فرد اکمل یا فرد اہم کی تشخیص کرتے ہیں جو بوقت نزول آیت خاص طور سے منظور نظر ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہونگے کہ وہ آیت بالکل اُس شخص خاص سے مخصوص ہو گئی اور اُس میں عمومیت باقی نہیں رہی۔

ظاہر ہے کہ ہر مفہوم کلی جبکہ وہ بذریعہ لفظ زبان پر جاری ہو تو متکلم نیز مخاطب کی نظر کا اُسکے افراد کاملہ کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ دوسرے اشخاص بالکل اُس سے خارج ہی ہو جائیں بلکہ ان افراد کے اندازہ کے لئے اس مفہوم کے دامن کی وسعت پر نظر ڈالنا ضروری ہو گی۔

اسکی نظیر حسب ذیل ہے۔

(۱) بعض روایات میں یہ ہے کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں یا ایھا الذین امنوا کی لفظ ہے اُس سے منظور نظر ائمہ معصومین ہیں۔

بے شک کیا شبہ ہے اس میں کہ وہ حضرات اس مفہوم کے مصداق اصلی اور افراد کاملہ ہیں لیکن اس سے بعض اشخاص کا یہ نتیجہ نکالنا کہ اس صورت میں جو جو احکام واجبات و محرمات یا ایھا الذین امنوا کے خطاب سے مخاطب کر کے کہے گئے ہیں وہ سب ائمہ سے مخصوص ہو گئے اور ہم اُن احکام سے علیحدہ ہیں بالکل غلط ہے۔

ان اشخاص کو یا ایھا الذین امنوا کی لفظ کے استعمال کو اُس مقام پر دیکھ لینا چاہیئے

کہ جہاں اسکے بعد کا مذکور حکم ائمہ کی شان مخصوص کے بالکل خلاف ہے۔

جیسے یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کا تعلق باعتبار اپنے ذیل کے غیر ائمہ ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے ۔

اس کا منشا یہی ہے کہ یا ایھا الذین امنوا کے مفہوم کلی میں ائمہ معصومین کا فرد ممتاز ہونا دوسری بات ہے، اور اس کے بعد والے حکم کا ان کی ذات کے ساتھ مخصوص یا بالکل عام یا ان کے غیر کے ساتھ مخصوص ہونا دوسری چیز ۔

اس بیان سے بہت سے ان آیات کے متعلقہ روایات کا حل ہو جائے گا جن کے احکام کسی ذات سے مخصوص نہیں لیکن ان کے روایات میں یہ ہے کہ یہ آیات شان امیر المومنینؑ میں وارد ہوئے ہیں ۔

اور اسی سے ان روایات کا مطلب بھی واضح ہوتا ہے جنہیں یہ کہا گیا ہے کہ ثلث قرآن شان امیر المومنینؑ میں نازل ہوا ۔ اسکے معنی یہی ہیں کہ جہاں جہاں بھی کوئی صفت مدح قرآن مجید میں ہے اسکے فرد ممتاز ہونے کی بنا پر بحیثیت لفظ امیر المومنین کا منظور نظر ہونا ضروری ہے ۔

اسی طرح آیات مذمت کا تعلق اعدائے اہلبیت کیساتھ اگرچہ بسلسلہ تذکرہ امم سابقہ ہو ۔ ان تمام بیانات کی تطبیق مفصل طور سے ان آیات کے ذیل میں ہو گی جن کے متعلق اس قسم کے روایات وارد ہو گئے ہیں ۔

(۳) بعض احادیث بیشک ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں کسی عموم آیت کی تخصیص اور کسی اطلاق کی تقیید کی جاتی ہے ۔ ان احادیث میں صاف طور سے مذکور ہوتا ہے کہ آیت قرآنی میں عموم یا اطلاق مراد نہیں ہے بلکہ تخصیص ملحوظ ہے یہ احادیث اگر معتبر ہوں اور معیار اعتبار کے لحاظ سے قابل عمل ہوں تو یقیناً عموم یا اطلاق آیت کی تخصیص یا تقیید کا باعث ہوں گے ۔ مثال

ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم۔ — بیویوں کے لئے چوتھا حصہ ہے تمھارے متروکہ کا اگر تمھارے لئے اولاد نہ موجود ہو اور اگر تمھارے اولاد ہو تو اُن کو آٹھواں حصہ ملیگا۔

اس میں متروکہ کی لفظ مطلق ہے جس میں منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کی کوئی تفریق نہیں ہے لیکن اگر احادیث معتبرہ سے ثابت ہو جائے کہ یہ حکم اموال غیر منقولہ سے مخصوص ہے تو اس کا پابند ہونا ضروری ہوگا۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ متعدد آیات قرآن سے ملاکر کوئی مطلب نکالا جائے۔ اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اُن دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں کسی میں کوئی معنوی تصرف نہ کیا جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے ظاہری معنی پر برقرار رکھی جائے اور پھر بھی آیات کے مجتمع ہونے سے کوئی ایسا مطلب نکل آتا ہو جو اُن میں سے کسی ایک آیت میں خاص طور سے مذکور نہ تھا۔

یہ صورت درست ہے اور جو مطلب اس طرح سے پیدا ہو وہ یقیناً قابل اعتبار ہے۔

مثال۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے جس میں مدت رضاع یعنی بچوں کو دودھ پلانے کی میعاد مقرر کی گئی دو برس۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین۔ — بچہ والی عورتوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو دو برس تک دودھ پلائیں۔

دوسری آیت ہے جس میں کم از کم مجموعی مدت حمل اور رضاعت کی ڈھائی برس بتائی گئی ہے۔

وحملہ و فصالہ ثلثون شھرا۔ — اُس کے حمل اور دودھ بڑھائی تک تیس مہینہ ہیں

جس وقت ان دونوں آیتوں کو ملایا جائے تیس مہینہ مجموعی مدت حمل و رضاعت ان میں سے دو برس یعنی چوبیس مہینہ رضاعت کیلئے۔ باقی بچے ۶ مہینہ۔

یقیناً اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم مدت حمل کی چھ مہینہ ہے۔

یہ نتیجہ بالکل درست ہے اور یقیناً مفاد کلام الٰہی ہے اگرچہ دونوں آیتوں میں کسی ایک میں بھی یہ خاص طور پر مذکور نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ یہ نتیجہ اجتماعی معنی ظاہری پر مبنی نہ ہو بلکہ دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے قرآن مجید کی کسی ایک آیت میں احادیث کے اندر تفسیر کے لحاظ سے کوئی معنی باطنی بتائے گئے ہوں۔

انسان اس معنی باطنی کو لے کر کسی دوسری آیت میں جہاں اسی طرح کی کوئی لفظ مذکور ہو اُس معنی باطنی پر منطبق کرے اور اُس سے کوئی خاص نتیجہ نکال لے۔ یا کسی مشترک لفظ سے ایک جگہ بقرینۂ مقام ایک معنی مراد ہوے تو اب جہاں کہیں وہ لفظ آئے انسان اُسی معنی پر محمول کر دے اور یہ کہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا اُس جگہ اس لفظ کے یہی معنی مراد ہیں تو یہاں بھی یہی ہیں یا ایک جگہ بطور مجاز کسی معنی میں استعمال ہوا ہو اور دوسری جگہ قرینۂ مجاز کے معدوم ہوتے ہوئے بھی اسی پہلی آیت کے استعمال کو قرینہ قرار دیا جائے۔

یہ جوڑ توڑ آیتوں کا ہرگز درست نہیں ہے۔ اگر کسی ایک آیت میں کسی لفظ کے کوئی معنی باطنی مذکور ہو گئے تو یہ ضروری نہیں کہ دوسری آیت میں بھی وہی معنی مراد ہوں اُس دوسری آیت میں صرف قیاس کی بنا پر اُن معانی کو پیدا کرنا تفسیر بالرائے ہوگا۔

اسی طرح ایک جگہ مشترک لفظ کے ایک معنی بقرینہ مراد ہو گئے تو دوسری آیت میں اُس لفظ کے ضروری نہیں کہ وہی معنی ہوں یا ایک جگہ بطور مجاز ایک معنی میں استعمال ہوا تو یہ کیا ضروری کہ دوسری جگہ بھی وہی معنی ہوں۔

القرآن یفسر بعضہ بعضا۔ "قرآن مجید کی ایک آیت خود دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے"

درست ہے، لیکن یہ قرآن مجید کی کوئی خصوصی صفت نہیں ہے بلکہ جو کسی دانشمند اصول محاورہ تکلم کے واقف کار کا کلام ہو اس میں یہ صفت پایا جانا ضروری ہے اور یہ ایک چیز ہے جو اصول محاورہ و تکلم کی پابند ہے۔

عام کی تخصیص خاص سے مطلق کی تقیید مقید سے یہ چیزیں وہ ہیں جہاں ایک متکلم کا ایک وقت کا کلام دوسرے وقت کے کلام کا مبیّن و شارح ہو سکتا ہے ایسی ہی صورت جب قرآن مجید میں پیدا ہو تو بے شک ایک آیت سے دوسرے کی تشریح و تفسیر ہو جائے گی۔

لیکن اس کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک آیت کو دوسری آیت سے پیوند لگا کر معنی پیدا کئے جائیں خواہ وہ اصول محاورہ کے بالکل خلاف کیوں نہ ہوں۔

مثال قرآن مجید میں "صلوٰۃ" کی لفظ معنی درود مستعمل ہوئی ہے۔

ان اللہ و ملٰئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما ۵

مگر یہ یقیناً یہیں سے مخصوص ہے بعض مخالفین شریعت نے اس آیت کو قرینہ قرار دیکر جہاں جہاں قرآن مجید میں اقیموا الصلوٰۃ کا حکم تھا جو نماز سے متعلق ہے اُسے بھی درود کے معنی میں قرار دے لیا۔ بس اب کیا ہے۔ نماز سے چھٹکارا ہو گیا۔ درود پڑھ لیں گے وہ کوئی مشکل نہیں۔ یہ بالکل حقیقت سوزی اور باطل پروری ہے جو کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جا سکتی۔

واعظ لوگ اس طرح کے بہت جوڑ توڑ کیا کرتے ہیں۔ اس میں قدم قدم پر تفسیر بالرائے ہوتی ہے جو سخت ترین گناہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ بڑا نازک ہے اس میں وسعت بھی بہت ہے، جو بہت سے تنگ خیال افراد کے نقطۂ تصور سے آگے ہے۔ یہ لوگ اتنے تابع نقط ہوتے ہیں کہ ذرا غور و فکر

صرف کرکے جو کوئی نکتہ حکمت اور نقطۂ حقیقت قرآن سے نکالا جائے جو سابق کی کتابوں میں مذکور نہ ہو اُسے تفسیر بالرائے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو "تدبر فی القرآن" کے حکم کا کوئی نتیجہ نہ ہوتا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس میں ضیق اور نزاکت بھی ہے حالانکہ جو اُن لوگوں کے حدود تخئیل سے بہت تنگ ہے کہ جو قرآن مجید کے آیات کی آنکھ بند کر کے اپنے دل سے تفسیر شروع کر دیتے ہیں اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔

یہی باعث ہو کہ ہمیں اس تبصرہ کو اتنے طولانی بنادینے کی ضرورت پڑی۔ ہم نے اس میں جو اصول و قواعد قرار دئے ہیں اُن کو اگر انسان پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ وہ نقطۂ اعتدال پر قائم رہ کر تدبر فی القرآن کے فیوض و برکات سے بہرہ مند بھی ہوگا اور تفسیر بالرائے کے عمیق گڑھوں میں گرنے سے محفوظ بھی رہیگا۔

دسواں تبصرہ

کتاب تفسیر کے ضروری خصوصیات

اور

موجودہ متداول تفاسیر پر ایک نگاہ

مذکورہ بالا معیار کے مطابق جو ہم نے قرآن کے الفاظ و معانی و مطالب و ارشادات کے متعلق گزشتہ تبصرہ میں بیان کیا ہے ایک ایسی کتاب کے لئے جو تفسیر قرآن مجید کے طور پر تحریر کی جائے

حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ تحریر ہونے کی ضرورت ہے۔

(۱) سب سے پہلے خود قرآن مجید کے الفاظ پر نظر ڈالی جائے اُس کے مفردات الفاظ کو لغت و محاورہ کے مطابق حل کیا جائے جس کی بنیاد زیادہ تر ذاتی حیثیت سے عربی علم ادب کے ساتھ مزاولت اور موارد استعمال کے تتبع پر قائم ہو سکتی ہے صرف کتب لغت میں دیکھ لینے سے صحیح نقطہ حقیقت تک پہونچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

ایک معمولی لغت "لمس" اور "مس" کا ہے اس میں لغت کی کتابوں میں وہ خبط و خلط ہے جس کی انتہا نہیں "نہایۃ اللغۃ" میں لفظ "مس" کے معنی میں لکھا ہے مسست الشیئ اذا لمستہ بیدك۔

اسکے یہ معنی ہوئے کہ مس کے معنی ہیں "لمس" قاموس دیکھئے لمسہ مسّہ بیدہ ومسّہ ای لمسہ۔ لمس کے معنی ہیں ہاتھ سے مس کرنا اور مس کے معنی لمس کرنا۔

مصباح میں ہے مسستہ افضیت الیہ بیدی من دون حائل "مس کے معنی یہ ہیں کہ ہاتھ پہونچایا جائے کسی چیز تک بغیر کسی حائل کے"۔

"لمس" کو لکھا ہے افضی الیہ بیدہ۔

"اسکے معنی ہیں ہاتھ کا پہونچانا کسی شے تک"

ابن درید نے کہا ہے "لمس" کے معنی میں داخل ہے کہ ہاتھ سے مس کیا جائے اور پھر یہ کہا ہے کہ لمس کے معنی مس کے ہیں اور جو بھی کسی شے کو مس کرے تو اُس نے اُسے لمس کیا ہے"۔

فارابی کا قول ہے کہ لمس کے معنی ہیں مس۔ تہذیب میں ابن الاعرابی سے منقول ہے کہ لمس کسی شے کا مس کرنا ہے اور مس کو لکھا ہے کہ مس کے معنی ہیں کسی شے کا مس کرنا ہاتھ سے۔ جوہری نے کہا ہے لمس کے معنی ہیں مس۔

مصباح میں حل لغت کے بعد لکھا ہے ۔

اذا کان اللمس ھو المس فکیف تفرّق الفقھآء بینھما ۔

"جب کہ لمس اور مس ایک چیز ہے تو آخر فقہاء ان دونوں میں فرق کیوں قرار دیتے ہیں۔"

لیکن جیسا کہ علامہ بلاغی طاب ثراہ نے تفسیر "آلاء الرحمٰن" میں تحریر فرمایا ہے حقیقت یہ ہے کہ فقہاء معنی الفاظ کو صحیح طور سے سمجھنے میں ان لغویین سے زیادہ نظر رکھتے ہیں اسلئے کہ ان کی عمر گذرتی ہے کتاب و سنت کی سیر اور کلام عرب کے تتبع میں ۔

انھوں نے بہت خوب سمجھا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ لمس اور مس دونوں کے معنی بالکل ایک نہیں ہیں۔ ان دونوں میں باعتبار معنی کے فرق ہے۔

"لمس چھونا ہے کسی شے کا ایک ایسے حصہ جسم سے اپنے کہ جس میں احساس کی طاقت ہو اس قصد سے کہ اس شے کا احساس ہو۔"

اس میں نہ تو خاص ہاتھ سے چھونے کی خصوصیت ہے اور نہ ہر طرح سے چھونے کی تعمیم ہے بیشک اکثر یہ لمس ہاتھ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ وہ آسان ذریعہ ہے اور اس کا احساس زیادہ قوی ہے۔ اسکے برخلاف لفظ "مس" چھوجانے کا دوسری شے سے نام ہے قصد احساس کی خصوصیت نہیں ہے اور نہ ہاتھ کے ذریعہ سے ہونے کی ضرورت ہے۔

بے شک جو شخص موارد استعمال کا تتبع کرے اور اسکے ساتھ صحیح ذوق رکھتا ہو وہ تصدیق کریگا کہ لمس اور مس کے یہی معنی ہیں جو تحریر ہوے ۔ اور لغویین کی کوئی ایک بات بھی ٹھیک نہ تھی۔

اس ذیل میں بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اسلئے کہ انہیں غلط فہمی کا واقع ہو جانا کسی بڑے مختلف فیہ عقیدہ کا سنگ بنیاد بن جاتا ہے ۔

مثال کی حیثیت سے لفظ "توفی" ہے کہ اہل لغت نے اس میں وہ دھاندھلیاں کی ہیں جنکی انتہا نہیں کسی نے "اماتہ" مردہ بنانے کے معنی لکھدیے "توفی" اس کے اتباع میں بعض کوتاہ نظر اہل تفسیر نے یا عیسیٰ انی متوفیک کے معنی کہدیئے (ممیتک) یعنی اے عیسیٰ میں تمھیں موت دینے والا ہوں "۔

کسی نے کہا ممیتک حتف انفک "اسکے معنی ہیں اپنی موت مرنا"

کسی نے اسکے ساتھ اپنے عقیدۂ حیات مسیح کو سنبھالتے ہوئے یہ کہدیا کہ

ممیتک فی وقتک بعد النزول من السمآء"

"تمھیں موت دیجائے گی تمہارے وقت پر جبکہ تم آسمان سے اتر چکو گے "۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ اس لفظ کے "فلسفۂ لغوی" پر نظر ڈالی نہ اُس کے "مبدأ اشتقاق" پر۔ نہ انقلاب تصریفی" پر نہ قرآن مجید کے محاورات پر نہ عرب کے استعمالات پر۔ ورنہ ہرگز ہرگز وہ توفی کے معنی موت کے قرار نہ دیتے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ کسی ایک جگہ بھی قرآن یا غیر قرآن میں "توفی" بمعنی موت نہیں ہے۔ وہ ایک عام مفہوم ہے جو کبھی بحیثیت مصداق موت پر منطبق ہوتا ہے کبھی "نوم" پر اور کبھی زمین سے آسمان پر زندہ اُٹھالئے جانے پر۔

توضیح اور تشریح کے لئے خود اسی آیت کی تفسیر کا انتظار کرنا چاہیئے۔

(۲) مفردات الفاظ کو حل کر چکنے کے بعد اُن کے باہمی ارتباط و آویزش پر نظر ڈالی جائے یہ وہ چیز ہے جو علم نحو سے متعلق ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں بھی نحویوں کے بنائے ہوئے قاعدوں سے زیادہ ذاتی محاورات اور عربی کلام کے اسلوب سے انس اور واقفیت کو دخل حاصل ہے۔

علم نحو کی کتابیں اسوقت کیلئے خوب ہیں جبکہ انسان عربی سے ناشناس ہو اور عربی زبان کو حاصل کرنا چاہ رہا ہے اسوقت کیلئے نحو کے بنیادی قواعد بیشک ایسے ہیں جن کو پیش نظر رکھکر

وہ آگے بڑھے اور تحصیل علم عربی میں مصروف رہے لیکن جب لسان کو ملکہ عبارت کے دیکھنے اور صحیح پڑھنے کا پیدا ہو گیا۔ اب اُس کو نحو کی کتابوں اور نحویوں کی دور از کار باتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا وہ جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے سیر و تتبع کلام فصحا میں اُسکے سامنے نئے نئے اسلوب پیش کرتا جاتا ہے جو اُن حدود سے بالکل آگے ہیں جس تک نحوی لوگ پہونچ سکے ہیں۔

یقین سمجھنا چاہیئے کہ نحویین کی بہت سی باتیں بالکل ڈھکوسلے کی ہوتی ہیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک عربی شاعر کا کلام ہے۔

جاءوا بمذق هل رأيت الذئب قط

"لائے وہ دودھ جس میں پانی ملا ہوا تھا کیا تم نے بھیڑیا کبھی دیکھا ہے؟"

یہ ایک خاص انداز ہے کلام کا جس کا لطف زبان شناس افراد اُٹھا سکتے ہیں۔

اب ہمارے نحوی اصحاب اسکی ترکیب کہنے بیٹھے۔ سچ یہ ہے "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" کی مثل اصل ہو گئی۔

الفیہ کے شارحین نیز دوسری نحوی کتابوں کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کلام کی تقدیر یوں ہے۔

جاءوا بمذق مقول فيه هل رأيت الذئب قط

"وہ لوگ پانی ملا ہوا دودھ لائے جس کے بارے میں یہ کہا جائیگا کہ تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟"

اب خدا ہی کو معلوم کہ اس توجیہ سے شاعر کی روح پہ کیا گزری۔

وہ بیچارہ دودھ کی رنگت کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ رنگ پیش نظر ہو جائے جو پانی کی کثرت سے دودھ میں نظر آ رہا تھا۔

اُس نے یہ الفاظ ایک خاص مصوری کے انداز پر کہے تھے ذی علم محقق ارباب نحو نے اُس کو یوں کہا کہ "دودھ ایسا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے"۔

یہ "کبھی بھیڑیا دیکھا ہے" اس کلمہ مقدر۔
"مقول فیہ" جس کے بارے میں کہا جاتا ہے" کے ذریعے دودھ کی صفت قرار دیا گیا۔
لیکن کیا اس طرح شاعر کا اصلی مقصود حاصل ہوتا ہے۔ کیا شاعر یہی کہنا چاہتا تھا؟ نہیں
ہرگز نہیں آخر دودھ کے بارے میں اس کے جانے کے کیا معنی کہ کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟
واقعہ یہ ہے کہ یہ هل رأيت الذئب قط۔
"تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟"
بالکل مستقل استفہامی جملہ ہے جس کو سابق کلام سے ترکیبی حیثیت سے کوئی آویزش نہیں ہے
وہ صرف مبیّن ہے، شارح ہے۔ ظاہر کرنے والا ہے دودھ کی ایک صفت کا جو شاعر نے "مقدر" رکھی ہے
مذکور نہیں ہے۔ وہ یہ کہ لونہ کلون الذئب۔
"وہ دودھ ایسا تھا کہ جس کا رنگ ہو بہو بھیڑیے کے رنگ کا سا تھا۔
اس کو دل میں رکھکر اس نے کہا کہ هل رأيت الذئب قط "تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟"
یعنی اگر تم نے دیکھا ہو تو تم تصدیق کروگے کہ بے شک دودھ اسی رنگ کا ہے۔
اب دیکھیے کہ یہ معنی کہیں بھی نحویین کی ساختہ و پرداختہ ترکیب سے پیدا ہوتے ہیں؟
یہ علم نحو کے لال بجھکڑ قرآن مجید میں بھی ایسے ایسے تصرفات کیا کرتے ہیں اور اکثر اُن کی سمجھ میں
نہیں آتا کہ یہ ہے کیا؟ وہ اکثر جہاں اُن کے خود ساختہ قاعدے کسی لفظ کے سمجھنے کی طرف رہنمائی
نہیں کرتے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ کلمہ زائدہ ہے جس کی بنیاد پر آج مسیحیوں نے قرآن مجید کے خلاف یہ شور
بلند کر دیا ہے کہ اس میں زائد یعنی بے فائدہ و بے معنی الفاظ کثرت سے موجود ہیں جو فصاحت و حکمت
متکلم کے خلاف ہیں۔
لیکن یہ قصور کس کا ہے؟ ان بے سلیقہ نحویین کا جنھیں زبر و زیر و پیش کی بحثیں کرتے کرتے

نیچی سطح پر اڑنے اور ظاہری پہلوؤں پر چھپلتی ہوئی نظریں کرنے کی عادت پڑجاتی ہے وہ کبھی معانی کی گہرائیوں میں داخل ہی نہیں ہوتے اور سمجھتے ہی نہیں کہ اس کی تہہ میں کیا مضمر ہے۔

مثلاً قرآن مجید میں متعدد جگہ لا اقسم کی لفظ ہے۔

لا اقسم بمواقع النجوم۔ لا اقسم بهذا البلد۔ لا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون وغیرہ وغیرہ۔

ان آیات کی تفسیر میں جار اللہ زمخشری ایسا متبحر عالم نحو و لغت ایسا گھبرایا ہوا نظر آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

پہلی آیت لا اقسم بمواقع النجوم وانہ لقسم لو تعلمون عظیم۔

"میں نہیں قسم کھاتا ستاروں کے غروب کرنے کے مقامات کی حالانکہ یہ قسم اگر تم جاننا چاہو تو بہت عظیم ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ کلمہ "لا" زائدہ ہے اور اصلی معنی یہ ہیں کہ "میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے غروب کرنے کے مقاموں کی۔"

دوسری آیت لا اقسم بیوم القیامۃ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ،

"میں نہیں قسم کھاتا روز قیامت کی اور نہیں قسم کھاتا انسان کے نفس غافلہ کی جو معصیتوں پر ملامت کرتا ہے۔"

یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ

"لا نافیہ کا آنا فعل قسم پر کلام عرب میں بہت شایع و ذایع ہے۔

مثلاً امرأ القیس نے کہا ہے۔

ولا وابیك ابنۃ العامری   لا یدعی القوم انی افر

"نہیں قسم تیرے باپ کی اے عامری لڑکی قوم والے نہیں دعویٰ کر سکتے کہ میں جنگ سے فرار کرتا ہوں"

غویہ بن سلمہ نے کہا ہے۔

الا نادت امامۃ باحتمال　　لتحزننی فلا بک لا ابالی

"امامہ (شاعر کی معشوقہ) نے اعلان کیا ہے کہ وہ سفر کرے گی صرف اس لئے کہ مجھے رنج پہونچے تو نہیں قسم تمہاری میں پرواہ نہیں کروں گا"

اس کلمہ "لا" کا فائدہ قسم میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زائدہ ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ "لا" نفی ہی کے لئے ہوتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں اس شے کی قسم نہیں کھاتا اس لئے کہ اسکی عظمت ظاہر ہو۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے کہ فلا اقسم بمواقع النجوم وانہ لقسم لو تعلمون عظیم گویا حرف نفی کے داخل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ میرا اس شئے کی عظمت ظاہر کرنا قسم کھا کر قسم نہ کھانے کے برابر ہے کیونکہ وہ شئے خود ہی عظیم ہے اور اس سے زیادہ کی مستحق ہے"

یہ حضرت زمخشری کا کلام عجیب و غریب حیثیت کا ہے۔ کہاں فعل قسم یعنی اقسم پر لائے نفی کا داخل ہونا جیسا کہ قرآن کی محل بحث آیت میں تھا اور کہاں امرأ القیس اور دوسرے شاعر کے کلام میں حرف نفی یعنی واو اور رب کے اوپر کلمہ لا کا داخل ہونا جو شاہد میں پیش کیا گیا ہے۔

اس لا کو قسم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس جملہ کا جو اسکے بعد نفی کی صورت میں آئندہ آتا ہے پیش خیمہ ہے یا ایک جزو ہے جو مخاطب کو متوجہ کرنے کے لئے آگے رکھ دیا گیا ہے۔

یہ اردو میں اور ہر زبان میں اسی صورت سے مستعمل ہے "نہیں خدا کی قسم میں ہرگز وہاں نہیں جاؤں گا" یہاں شروع والا "نہیں" یقیناً "خدا کی قسم" سے متعلق نہیں ہے بلکہ اسکے بعد کے جملہ "وہاں نہیں جاؤں گا" ہی کی متعلقہ نفی ہے جسے کلام میں زور بڑھانے کے لئے شروع ہی سے کہہ دیا گیا ہے۔

اس کی نظیر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے کہ فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم "نہیں خدا کی قسم۔ یہ لوگ مومن نہیں سمجھے جا سکتے جب تک کہ تمہارے فیصلہ پر راضی نہ ہوا کریں اُن جھگڑوں میں جو انکے درمیان پیدا ہوتے ہیں"۔

اس کو کیا نسبت اُس کلمہ "لا" سے جو خود فعل قسم پر داخل کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہو گئے ہیں کہ "میں قسم نہیں کھاتا ہوں" اور جس کے بعد کوئی منفی جملہ ہے بھی نہیں بلکہ اثباتی جملہ ہے۔

کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ ارباب نحو لفظی جوڑ توڑ کی دھن میں معنی پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارا ہی نہیں کرتے اور صرف اپنے فکر و نظر کو الفاظ کی ظاہری صورت پر محدود رکھتے ہیں۔

اب ملاحظہ ہو:۔

تیسری آیت فلا اقسم بما تبصرون و ما لا تبصرون "میں نہیں قسم کھاتا اُن چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور اُن چیزوں کی جو تم نہیں دیکھ سکتے"۔

اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔

"یہ قسم ہے تمام اشیاء کی" کیونکر اور کس طرح؟ کچھ پتہ نہیں۔

چوتھی آیت سورہ بلد میں ہے لا اقسم بھذا البلد "میں نہیں قسم کھاتا اس شہر کی" اسکے معنی یہ ہیں کہ "قسم کھاتا ہوں"۔

چہ خوش! ایسے ہی عالم ان مفسرین کا جو علم نحو میں بال کی کھال کھینچنے کے مدعی ہوتے ہیں وہ کس طرح الفاظ کی بلاغت اور معانی کی لطافت کو بیدردی سے پامال کرتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

دوسرے مقامات ایسے بہت سے ہیں جہاں ان لوگوں نے "لا" کے کلمہ پر خط نسخ کھینچا ہے اور اسکو معنی کے عالم سے نکال پھینکا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

ان اللہ وعد الذین امنوا ویتقون اللہ	خدا نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور خدا سے
ویومنون برسولہ ان یؤتیھم کفلین من	تقوی اختیار کرتے ہیں اور اسکے رسول کا اقرار رکھتے ہیں یہ
رحمتہ ویجعل لھم نورا یمشون بہ ولیغفرلھم	کہ وہ عطا کرے انھیں دوہرا حصہ اپنی رحمت کا اور فرا دے
لئلا یعلم اھل الکتاب ان الذین	انکے لیے ایک روشنی جس کی مدد وہ راستہ طے کریں اور اُنکے
امنوا لا یقدرون علی شیئی وان الفضل	گناہوں کو معاف کرتے تاکہ نہ سمجھیں اہل کتاب کہ وہ لوگ جو ایمان
بید اللہ یوتیہ من یشاء "	لائے کچھ قدرت نہیں رکھتے اور فضل و احسان خدا کے ہاتھ میں ہے

ہر وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اس آیت میں یہ لوگ تصریح کرتے ہیں کہ لئلا یعلم اھل الکتاب کے فقرہ میں لا زیادہ ہے اور معنی یہ ہیں "تاکہ معلوم ہو اہل کتاب کو" ان لوگوں کی آخر سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اُس کو کہنا ہو کسی بات کے بارے میں کہ وہ اس طرح سے ہے مگر وہ اُس میں نفی کا کلمہ بڑھا کر جملہ ایسا کہدے جس کے معنی یہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔

یہ صرف سخن فہمی میں عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ اگر غور سے کام لیتے تو معلوم ہوتا کہ "لا" زائدہ نہیں ہے۔ وہ نفی کے معنی رکھتا ہے اور حقیقتہً متکلم کو وہی مقصود ہے۔

مطلب آیت کا کنجلک بھی نہیں ہے اور بالکل صاف ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے مومنین کو اپنی خاص رحمتوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور اُن کو نور عطا کیا اور اُنکی مغفرت کی ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلمین یہود و نصاریٰ جو اسوقت مسلمانوں کو ظاہری حیثیت سے بالکل بے بس بے اقتدار دیکھ رہے ہیں انھیں نتیجہ میں یہی علم نہ ہو اور یہی دکھلائی دے کہ حقیقتہً یہ بے بس ہیں اور ان کا کوئی اقتدار نہیں ہے اور نیز اسلئے کہ فضل و احسان تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے "

اب دیکھا آپ نے کہ کلمہ "نفی" رکن کلام ہے یا نہیں۔ اور بغیر اسکے معنی ناقص ہوجاتے ہیں یا نہیں
قدرت کو اہل کتاب کے سامنے مومنین کا بے بس اور بے اقتدار ہونا تھوڑی ظاہر کرنا منظور ہے بلکہ
اُسے تو یہی مقصود ہے کہ وہ اُنھیں بے بس اور بے اقتدار نہ سمجھیں ۔

ایسی نظیریں دوسری بھی بہت ہیں جہاں ان لوگوں نے حکم قضا مُبرم بعض کلمات کے زائدہ
ہونیکا جاری کردیا ہے حالانکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کلمات کو منظور نظر معنی کے پورے ہونے
میں بہت بڑا دخل حاصل ہے ۔

علامہ سید رضی طاب ثراہ نے اپنی تفسیر "حقائق التنزیل ودقائق التاویل" میں ایک
مستقل تبصرہ قرآن مجید میں حروف وکلمات زائدہ کے موجود نہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔
اور اس آخیری دور کے یگانہ روزگار متکلم آقا شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے کتاب "الہدیٰ الی دین المصطفےٰ"
اور اپنی کتاب تفسیر "آلاء الرحمن" میں اس پر بہت سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ اور ہم ان الفاظ کے متعلق
تفصیلی حیثیت سے تبصرہ خود ان آیات کے ذیل میں انشاء کرینگے جہاں اس قسم کے الفاظ وارد ہونگے ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کے آیات کی تفسیر میں ان نحویین اور ارباب عربیت کے بیانات پر
پورا اعتماد کرنا ہمیشہ انسان کو ٹھوکریں کھلوائیگا اور غلطیوں میں مبتلا کریگا ۔

علم نحو کے مسائل کا استنباط تو خود شعرائے عرب کے اشعار سے زیادہ قرآن مجید کی آیات کے
استعمال سے کیا گیا ہے پھر ہم ان ساختہ تخیلات کو قرآنی الفاظ کا معیار کیونکر بنا سکتے ہیں۔

بلکہ قرآنی الفاظ کے باہمی تعلق اور آویزش میں بہت زیادہ ضرورت خود ذاتی حیثیت سے قرآن
میں تدبر کرنے کی ہے جس کے لئے محاورات عرب کے پیش نظر ہونے اور عربی دانی کے خاص ملکہ کی
ضرورت ہے جس کے لئے انسان عربیت کے سمندر میں اس طرح پیر گیا ہو کہ وہ اس کے لئے کوئی
اجنبی چیز باقی نہ رہی ہو ۔

ایسے اشخاص بہت کم ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے آیات کی شرح صرف انہی کا حق ہو سکتا ہے اور کسی کا نہیں۔

(۳) مفردات کے حل اور الفاظ کے باہمی تعلق اور ارتباط کو بھی سلجھی ہوئی طبیعت سے سمجھنے کے بعد آیت کا لفظی ترجمہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وہ سمجھ میں ضرور ہی آجائیگا۔ اس ترجمہ کے بعد انسان کو غور کرنے اور سمجھنے کی ضرورت پڑے گی کہ ان میں سے کون الفاظ اور جملے ایسے ہیں جن کا تحت اللفظی ترجمہ ہی مراد ہے اور کون ایسے ہیں کہ وہ بطور محاورہ کنایہ کے طور پر وارد ہوئے ہیں۔ اسکے لئے نہ کتب لغویہ مدد دینگے اور نہ نحو وصرف کے قواعد بلکہ زیادہ تر تتبع محاورات عرب کے علاوہ ذوق سلیم میزان ہے نیز ایسے قرائن پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی جو الفاظ کو اصلی معانی سے پھیر سکتے ہیں۔ ایسا قرینہ کبھی عقلی ہوتا ہے۔ اسکے لئے عقلی سنجیدگی کی ضرورت ہے اور کبھی نقلی مثلاً ایک آیت کے مجاز کا قرینہ دوسری آیت میں۔ اسلئے ضرورت ہے کہ قرآن پر عبور اتنا ہو کہ کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت ذہن ان تمام آیات کی طرف متوجہ ہو جن کے ساتھ اس آیت کے مفہوم کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

اگر آیت کا تعلق احکام شرعیہ کے ساتھ ہو تو یہ دیکھ لینا ضروری ہوگا۔ کہ آیت کا عموم یا اطلاق احادیث کی بنا پر تخصیص اور تقیید کیساتھ تبدیل تو نہیں ہوگیا ہے؟ اسکے لئے احادیث ائمہ معصومینؑ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

لیکن احادیث میں سند کی جانچ پڑتال کرنا ضروری ہوگی کیونکہ اگر حدیث بجائے خود معتبر نہ ہوئی تو وہ قرآن کی تخصیص وتقیید کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

آیات کے شان نزول میں مستند اور معتبر علماء ومورخین کے بیانات سے تمسک کرنا چاہیئے۔

جو آیات واقعات اور قصص سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اتنی مقدار سے زیادہ کہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے کچھ اور تشریح وتفصیل کرنا ہو تو معتبر حدیثوں سے تمسک کیا جا سکتا ہے۔

عام مفسرین کی کتابوں میں جو بہت سے قصص "اسرائیلیات" میں سے داخل ہو گئے ہیں اُنکا نقل کرنا بغیر رد کئے ہوئے درست نہیں ہے۔ وہ اسلام کے روایات سے بالکل غیر متعلق ہیں حقیقت یہ ہے کہ رسالتماب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ نومسلم یہودیوں کو مسلمانوں میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ اُن کی روایتوں کو حدیث اور قرآن کا درجہ دیا جانے لگا اور اسلامی مفسرین کی کتابیں اُن سے لبریز ہو گئیں حالانکہ اُن سے اسلامی معتقدات کی صحت کو صدمہ پہونچا اور حقیقت واقعات مسخ ہو کر رہ گئی۔

آیات قرآن کے معانی کے سلسلہ میں کلبی، مدائنی۔ مقاتل سدی وغیرہ کے کثیر التعداد اقوال نقل کرنے سے سوائے طبیعت کے پریشان ہونے کے کوئی نتیجہ نہیں۔

اسلئے کہ یہ مفسرین کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتے اور نہ اُن کے اقوال کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی کوئی وجہ ہے۔

ایک امر یہ ضروری ہے کہ اکثر آیات کے معانی میں مختلف جماعتوں کی طرف سے جو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور مخالفین اسلام کی جانب سے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں اُن کا دفعیہ اور کلام الٰہی کی حقانیت کو توہمات کے گرد وغبار کو ہٹا کر صاف طریقے سے نمایاں کیا جائے۔

جہاں ضرورت ہو نکات فصاحت و بلاغت اور خصوصی محاسن کلام پر روشنی ڈالی جائے اس حد تک کہ جہاں تک الفاظ رہنمائی کر سکتے ہیں۔

بیشک اس طرح کی تفسیر کا مکمل ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت کا انجام پانا قرار پائیگا اور اس کیلئے بہت بڑی ربانی توفیق کی ضرورت ہے۔

افسوس ہے کہ موجودہ جتنی تفسیر کی کتابیں ہیں اُن میں سے زیادہ مذکورہ بالا خصوصیات سے

عاری ہیں۔ اُن میں سے بعض جو مختصر ہیں وہ تو اپنے اختصار کی وجہ سے اُن تمام جہتوں کی جامع ہو ہی نہیں سکتیں اور جو طولانی ہیں اُن میں خارج از بحث باتوں سے طول دیا گیا ہے، مثلاً اقوال کی بھرمار کر دی۔ بمناسبت حدیثیں اور روایتیں جو مضمون آیت سے کوئی ضروری آویزش نہیں رکھتیں ذکر کرنا شروع کر دیں۔ نحویین کے اقوال کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا اور خواہ مخواہ کی طول طویل تقریروں سے آیت کے متعلقہ مضمون کو خطیبانہ رنگ میں بیان کر دیا۔

علامہ فخر الدین رازی کی اتنی بڑی تفسیر اور اُس کے متعلق ارباب نقد و تبصرہ کو یہ رائے قائم کرنا پڑی کہ فیہ کل شیئ الا التفسیر" اس کتاب میں سب کچھ ہے تفسیر ہی نہیں ہے"۔

شیعوں کے موجودہ مکمل تفاسیر میں مجمع البیان سب سے بہتر ہے لیکن اُس میں غیر معتبر مفسرین اور مخالفین مذہب کے اقوال کی اتنی بھرمار کر دی گئی ہے کہ حقیقت گم ہو گئی اور اسکے برخلاف احادیث ائمہ علیہم السلام نظر انداز ہو گئے۔

وہ کتابیں کہ جنھوں نے آیات کی تفسیر میں احادیث ائمہ علیہم السلام کے تذکرہ کی پابندی کی جیسے علامہ سید ہاشم بحرینی کی تفسیر برہان۔ ملا محسن فیض کی تفسیر صافی انھوں نے ایک تو احادیث میں نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ بس صرف احادیث کے نقل کرنے پر اکتفا کر دی اور آیت کے لفظی و معنوی دوسرے پہلوؤں پر خود نظر نہیں ڈالی۔ اسکے علاوہ روایات میں تفسیر ظاہر و باطن کا فرق نہیں قرار دیا۔

اس طرح ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً اس طرح کی تفسیر اب تک تصنیف نہیں ہوئی ہے جو اُن خصوصیات و جہات کی جامع ہو جن کی ضرورت کا ہم نے "تفسیر قرآن" کی تصنیف کے لئے تذکرہ کیا ہے۔

——— ❁ ———

گیارھواں تبصرہ

علم تفسیر کی تدوین

اور

شیعوں کے خدمات

ہمارے اس تبصرہ کو زیر نظر رکھتے ہوئے جو تحریف قرآن کے سلسلہ میں ہم نے قلمبند کیا ہے ہمارے اس قول کو کچھ تعجب کی نظر سے دیکھنا نہیں چاہیے کہ علم تفسیر کی اصلی بنیاد خود وحی الٰہی سے قائم ہوئی ہے اور رسول ؐ کی زبانی مثل قرآن کے اسکی تبلیغ ہوئی۔

یعنی بہت سے آیات قرآن مجید کے ساتھ توضیحی تشریحات خود رسالتمآب ؐ کی زبان پر جاری ہوئے اور وہ وحی آسمانی کی حیثیت سے منزل من اللہ تھے جن کو ائمہ اہلبیت کے احادیث میں تنزیل قرآن یعنی قرآن کے معنی تنزیلی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلی کتاب جوان تنزیلی معانی پر مشتمل علم تفسیر میں تصنیف ہوئی وہ امیر المومنین ؑ کا جمع کردہ قرآن تھا جس کے بارے میں احتجاج طبرسی کی روایت میں حضرت امیرؑ نے فرمایا ولقد جئتھم بالکتاب کملا مشتملا علی التنزیل والتاویل۔

"میں نے پیش کیا اصحابہ کے سامنے مکمل قرآن جس میں تنزیل اور تاویل بھی موجود تھی" اسی کے متعلق محمد بن سیرین کا قول تھا کہ لو اصیب ذلک الکتاب کان فیہ العلم۔

"اگر وہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو ایک بڑا علمی ذخیرہ دستیاب ہوتا" (تاریخ الخلفاء ص ۱۸۴)

علم تفسیر کی جامعیت کے متعلق حضرت کا یہ قول مشہور ہے کہ

لو شئت لاوقرت سبعین بعیرا من تفسیر فاتحۃ الکتاب۔

"اگر میں چاہوں تو ستر اونٹوں کا بار صرف سورہ حمد کی تفسیر سے بھر دوں"

اس روایت کو محض شیعہ سنی علماء نے نہیں بلکہ فرقہ خوارج اباضیہ کے عالم شیخ جمیل سعدی اباضی نے بھی اپنی کتاب قاموس الشریعۃ ج ۳ ب ۱۱ (صفحہ ۲۷) میں تسلیم کیا ہے اور قرآن مجید کے جامعیت علوم و معارف اور وسعت معانی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وانظر الی ما روی عن علی بن ابیطالب انہ قال لو شئت لاوقرت حمل سبعین بعیرا من تفسیر فاتحۃ الکتاب فھو بالقوۃ فی معرفتہ لا بالفعل اذ لا یساعدہ الوقت واذ صح کذلک وھو صحیح اذ لا یقول کذلک الا ومعہ من تفسیرھا ما یبلغ ذلک فلابد وان یکون فی نفسہ انہ یوقر حمل سبعین بعیرا وانہ یمکن ان یکون معانیھا ما یبلغ اکثر من ذلک ایضا فاذا ساعدہ الوقت استطاع ان یوقر سبعین بعیرا اخری۔

دیکھو اُس حدیث کو جو علی بن ابیطالب سے منقول ہے کہ اُنھوں نے کہا اگر میں چاہوں تو ستر اونٹ کا بار تفسیر سورہ حمد سے بھر دوں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اسکی معرفت اتنی حاصل ہے کہ لکھ سکتے ہیں نہ یہ کہ بالفعل اُس کا لکھنا ممکن ہے کیونکہ وقت اور زمانہ اتنی گنجایش نہیں رکھتا اور جبکہ یہ مطلب درست ہوگیا اور حقیقۃً درست ہی ہے اسلئے کہ علی بن ابیطالب نے ایسا نہیں کہا جبتک کہ انکی نظر میں سورہ حمد میں اتنے ہی مطالب نہ تھے جو اس حد تک پہونچ جائیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بجائے خود سورہ حمد میں اتنے مطالب موجود ہیں کہ ستر اونٹوں کا بار لکھا جاسکتا ہے اور ممکن ہے کہ اُس میں اس سے زیادہ مطالب ہوں کہ اگر وقت مساعدت کرتا

تو آپ اس کے علاوہ اور ستر اونٹوں کا بار لکھ دیتے ۔

آپ کے علاوہ صحابۂ کرام میں ایسے گنتی کے لوگ اور بھی تھے جنھیں قرآن مجید کے معانی و مطالب کے متعلق واقفیت حاصل تھی جیسے ابی بن کعب اور جابر بن عبد اللہ انصاری جن کو ابو الخیر نے طبقات المفسرین کے طبقۂ اولیٰ میں ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں بزرگ بھی امیر المومنین کے شیعۂ مخلصین میں سے تھے ۔

لیکن افسوس ہے کہ اس گروہ کو اپنے معلومات پورے طور سے ظاہر کرنے کا موقع اسلئے نہیں ملا کہ ہوائے حکومت علمی ترقیوں کے خلاف چل رہی تھی مثل مشہور ہے "الناس اعداء لما جھلوا" کوئی شخص اگر تاویل و تفسیر کے متعلق ذرا گفتگو کرتا تو اس کو سزا دیجاتی تھی ۔

بیچارے ایک شخص کو جس کا نام صبیغ تھا صرف اسبات پر دُرّے لگائے گئے کہ وہ تاویل قرآن کے متعلق سوال کرتا تھا غیظ و غضب اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ شہر بدر کیا گیا اور مسلمانوں کو تاکید ہوئی کہ اس کے ساتھ نشست و برخاست نہ کی جائے اور کسی قسم کے تعلقات نہ رکھے جائیں۔

اس تسلط اور سخت گیری کے دور میں بھلا کسی کو علمی تحقیقات کا کیا شوق ہوتا اور تفسیر و تاویل قرآن کی کیا خدمت انجام پا سکتی تھی ۔

بے شک امیر المومنین حضرت علیؑ کی ذات تھی جو خاموشی کے ساتھ علوم کا ذخیرہ مہیا کر رہی تھی۔ آپ نے علاوہ اُس قرآن کے جو جمع فرمایا تھا اور جسے ہم نے بتایا کہ وہ حقیقتہً ایک مدوّن تفسیر کی حیثیت رکھتا مستقل طور سے اقسام علوم قرآن اور اُن کے امثلہ کو بسط و تشریح کے ساتھ ارشاد فرمایا جو قلمبند صورت سے اب تک موجود ہے۔ شیخ جلیل ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم بن جعفر نعمانی کی کتاب جو "تفسیر نعمانی" کے ساتھ مشہور ہے وہی ایک منفصل حدیث ہے جو امیر المومنین ؑ سے منقول ہے۔ اس میں حضرت نے آیات قرآن

کی ساٹھ قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کی ایک مثال ذکر فرمائی اور آیات کی تفسیر کی ہے۔

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ رح نے اس کتاب کا خلاصہ تحریر فرمایا جو شیخ حر عاملی تک پہونچا تھا اور انھوں نے وسائل الشیعہ میں احکام فقہیہ کے متعلق مضامین کو اس سے اخذ کیا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار کی اس جلد میں جو قرآن مجید سے متعلق ہے ایک باب قائم کیا ہے کہ

باب ما ورد عن امیر المومنین ع فی اصناف آیات القرآن وانواعها وتفسیر بعض آیاتها بروایة النعمانی وهی رسالة مفردة مدونة کثیرة الفوائد نذکرها من فاتحتها الی خاتمتها۔

"اس باب میں ذکر ہوگا وہ جو امیر المومنین ع سے منقول ہوا ہے آیات قرآن کے اقسام اور بعض آیات کی تفسیر میں نعمانی کی روایت کی بنا پر اور یہ ایک مستقل تدوین شدہ رسالہ ہے جو بہت فوائد پر مشتمل ہے۔ ہم اس کو شروع سے آخر تک پورا نقل کرتے ہیں۔"

اس کو مکمل طور سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ میری نظر سے ایک قدیم رسالہ گذرا ہے جس کی ابتدا یہ ہے:

حدثنا جعفر بن محمد بن قولویه القمیؒ قال حدثنی سعد الاشعری ابو القاسم وهو مصنفه الحمد لله ذی النعماء والآلاء والمجد والعز والکبریاء وصلی الله علی محمد سید الانبیاء وعلی آله البررة الاتقیاء روی مشایخنا عن اصحابنا عن ابی عبد الله ع قال قال امیر المومنین ع انزل القرآن علی سبعة احرف کلها شاف کاف امر وزجر وترغیب وترهیب وجدل وقصص ومثل۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے راوی جعفر بن محمد بن قولویہ ہیں اور انھوں نے اشعری سے نقل کیا ہے جو اس رسالہ کے اصلی مصنف ہیں انھوں نے مرسل طریقہ سے اپنے مشائخ حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اصحاب ائمہ ع کے واسطے سے امام جعفر صادق ع سے روایت کی ہے کہ امیر المومنین ع نے فرمایا قرآن سات قسم کی

آیتوں پر نازل ہوا جن میں ہر ایک ہر طرح مکمل ہے امر اور نہی اور ترغیب اور تخویف اور جدل اور قصص اور امثال اسکے بعد حدیث کو آخر تک درج کیا ہے۔

لیکن یہ نعمانی کی روایت سے ترتیب میں مختلف ہے اور اس میں مختلف قسموں کو ابواب کی صورت میں منقسم کر دیا گیا ہے اور درمیان درمیان بعض احادیث کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے اسطرح یہ متصل طور پر صرف امیر المومنینؑ کا کلام باقی نہیں رہا۔

فاضل نوریؒ مصنف مستدرک الوسائل کو اس کے سلسلۂ سند میں بھی یہ تردد پیدا ہوا ہے کہ سعد سے مراد بظاہر سعد بن عبداللہ اشعری قمی ہیں اور جعفر بن محمد بن قولویہ ان سے بلا واسطہ روایت نہیں رکھتے ہیں۔

بے شک ان کے والد محمد بن قولویہ سعد بن عبداللہ کے مخصوص اصحاب میں سے تھے اسلئے یہ ہو سکتا ہے کہ روایت میں درمیان سے (عن ابیہ) کا فقرہ سہواً چھوٹ گیا ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جعفر بن محمد بن قولویہ اپنے والد سے اور وہ سعد بن عبداللہ سے روایت رکھتے ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم کی ابتدا میں جو آیات قرآن کے اقسام و انواع تحریر کئے ہیں انھیں بھی جہاں تک دیکھا جائے اسی حدیث امیر المومنینؑ کا خلاصہ ہے جسے کاتب نعمانی اور سعد بن عبداللہ اشعری نے اپنے طریقہ سے تحریر کیا تھا۔

بہر حال سب سے پہلے علم تفسیر کے تدوین کی بنیاد امیر المومنینؑ کے ہاتھوں قائم ہوئی ہے۔

آپکے شاگردوں میں ترجمان القرآن امام المفسرین عبداللہ بن عباس تھے جنکی آپنے مثل اپنی اولاد کے تربیت کی تھی اور اُن کو علوم و کمالات سے آراستہ کیا تھا۔

ابن عبدالبر نے کتاب الاستیعاب میں لکھا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ان کو دعا دی تھی کہ اللّٰھم علمہ الحکمۃ و تاویل القرآن" خداوندا اس بچہ کو حکمت اور تاویل قرآن کا

علم عطا فرما"۔ اس کی برکت تھی اور امیر المومنین ؑ کے فیض تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ باوجود کمسنی کے اکابر صحابہ کے سامنے "ترجمان القرآن" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ عبداللہ بن مسعود ایسے جلیل القدر صحابی کا قول تھا کہ نعم ترجمان القرآن ابن عباس لو ادرک اسنا ننا ما عاشرہ منا رجل۔

"کیا کہنا ترجمان قرآن ابن عباس کا! اگر ہماری عمروں کو پہونچے ہوتے تو ان کے تبحر علمی کی وجہ سے کوئی ہم میں سے ان کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی قابل نہ ہوتا"

شقیق ابو وہل کا بیان ہے کہ ابن عباس نے حج کے موقع پر تقریر کی تو سورۂ نور سے بیان کی ابتدا کی اور برابر آیتیں پڑھ پڑھ کے ان کی تفسیر کرتے رہے۔ میں اسوقت کہتا تھا کہ میں نے آج تک کوئی ایسا متکلم نہ دیکھا اور نہ سنا اگر فارس اور روم اور ترک اقوام اس کو سن لیں تو سب اسلام قبول کر لیں[1]۔

حافظ ابو نعیم اصفہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء سے ابن عباس کے ایک خاص شاگرد ابو صالح کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ میں نے ابن عباس کی علمی صحبت جس شان کی دیکھی ہے وہ ایسی ہے کہ اگر تمام قبیلۂ قریش اسپر فخر کریں تو بجا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ لوگوں کا اژدہام اتنا ہوا کہ راستہ رک گیا۔ گلی میں کسی کا ایک طرف سے دوسری طرف جانا غیر ممکن ہو گیا۔ ابن عباس کو اطلاع ہوئی تو مجھ سے کہا کہ ذرا وضو کے لئے پانی رکھ دو۔

میں نے پانی رکھا ابن عباس نے وضو کیا اور بیٹھے۔ مجھ سے کہا جاؤ کہو کہ جو لوگ قرآن مجید کے قرأت الفاظ و حروف کے متعلق سوالات پیش کرنا چاہتے ہوں وہ گھر میں داخل ہوں میں باہر گیا۔ اور میں نے ان لوگوں کو اطلاع دی۔ یہ لوگ داخل ہوئے اور اس طرح کہ وہ کمرہ اور پورا گھر ان سے

[1] مذکورہ واقعات کے لئے ملاحظہ ہو استیعاب برحاشیہ اصابہ مطبوعہ مصر ج ۲ صفحہ ۳۵۰ - ۳۵۷

پھر گیا انھوں نے کوئی سوال نہیں کیا مگر یہ کہ ابن عباس نے اسکا جواب دیا اور کچھ بڑھا کر بتلایا۔

اسکے بعد کہا کہ اب اپنے دوسرے بھائیوں کو موقع دو۔ یہ لوگ باہر گئے۔ مجھ سے کہا کہ کہو جو لوگ تفسیر قرآن اور تاویل کے متعلق سوالات کرنا چاہتے ہوں وہ داخل ہوں۔ میں نے اُن لوگوں کو اطلاع دی وہ لوگ بھی داخل ہوئے اُنھوں نے بھی کوئی سوال نہیں کیا مگر یہ کہ ابن عباس نے اُن کے مقصود سے زیادہ اُس کے متعلق جواب دیا۔ پھر اُن لوگوں سے بھی کہا کہ اب اپنے دوسرے بھائیوں کو موقع دو۔ وہ لوگ بھی باہر گئے۔

اس روایت کو تفصیل سے سید مرتضیٰ زبیدی شارح قاموس نے اپنی کتاب "اتحاف السادۃ المتقین"[1] میں جو غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کی شرح میں لکھی ہے درج کیا ہے۔

ابن عباس کے اقوال تفسیر قرآن میں عام طور سے کتب تفسیر میں درج ہیں اُن کی طرف منسوب ایک تفسیر "تنویر المقباس فی تفسیر ابن عباس" بھی موجود ہے جو مصر میں متعدد بار طبع ہوئی ہے لیکن اس تفسیر کے متعلق ہرگز وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کے مذکورہ مضامین ابن عباس کی طرف صحیح نسبت رکھتے ہیں۔

امیر المومنینؑ کے تلامذہ باختصاص میں میثم بن یحییٰ تمار بھی ایک بڑے واقف اسرار بزرگ تھے ان کے متعلق رجال کشی میں یہ روایت ہے کہ انھوں نے ابن عباس سے کہا۔

سلنی ما شئت من تفسیر القرآن فانی قرأت تنزیلہ علی امیر المومنینؑ وعلمنی تاویلہ فقال یا جاریۃ الدواۃ والقرطاس۔

"مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہو تفسیر قرآن کے متعلق دریافت کرلو اسلئے کہ میں نے قرآن پورا امیر المومنین سے حفظ کیا ہے اور حضرت ہی نے مجھ کو اسکی تاویل کی تعلیم دی ہے۔ ابن عباس نے

---

[1] جلد اول صفحہ ۱۰۱ - ۱۰۲ مطبوعہ مصر۔

کنیز سے کہا کہ جا دوات اور کاغذ لے آ۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میثم تمار نے علوم قرآن کا استفادہ امیر المومنینؑ سے ابن عباس سے زیادہ کیا تھا جس کو عبداللہ بن عباس بھی تسلیم کرتے تھے۔

میثم صرف تشیع کے جرم کی بنا پر سنہ ۶۰ھ میں بحکم ابن زیاد کوفہ میں قتل ہوئے۔
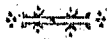
اسکے بعد دوسرا طبقہ ابن عباس کے شاگردوں کا ہے۔ ان میں علم تفسیر کے بڑے عالم سعید بن جبیر بن ہشام اسدی تھے جن کے متعلق حافظ سیوطی نے اتقان میں قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اعلم التابعین فی التفسیر یعنی علم تفسیر میں تمام تابعین میں سب سے بڑے عالم تھے۔ ابن ندیم نے فہرست (مطبوعہ مصر ص۵۱) میں علم تفسیر کے مصنفات کے تذکرہ میں ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے اور ان کے قبل کسی مدوّن تفسیر کا پتہ نہیں دیا ہے۔

ابن جبیر اپنے تشیع کے جرم پر سنہ ۹۴ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے حکم سے قتل ہوئے۔

دوسرے **ابوصالح** میزان البصری یہ بھی ابن عباس کے مخصوص شاگرد تھے اور علم تفسیر کے عالم تھے علامہ سید حسن صدر طاب ثراہ نے کتاب "الشیعۃ و فنون الاسلام" میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تابعین میں سے تھے اور شیعہ تھے۔ ان کے تشیع اور وثاقت کی تصریح شیخ مفید طاب ثراہ نے اپنی کتاب "الکافئۃ فی ابطال توبۃ الخاطئۃ" میں کی ہے۔ ابوصالح کا انتقال دوسری صدی کے ابتدائی دور میں ہوا۔

طاؤس بن کیسان ابوعبداللہ یمانی علم تفسیر میں یہ بھی ابن عباس کے شاگرد تھے۔ اتقان میں ہے کہ شیخ احمد بن تیمیہ نے ان کو "اعلم الناس بالتفسیر یعنی علم تفسیر کے سب سے بڑے علماء میں شمار کیا ہے طاؤس یمانی کا انتقال سنہ ۱۰۶ھ میں ہوا۔

اس طبقہ کے لوگ جنھیں ہم نے ابن عباس کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے اہلبیت میں سے امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں محسوب ہیں۔

تیسرا طبقہ امام محمد باقرؑ کے اصحاب کا ہے۔ اس زمانہ میں اہلبیت کے فیوض علمیہ ذرا آشکارا طور پر لوگوں کو پہونچ رہے تھے اور تقیہ کا پردہ ہلکا تھا علم تفسیر کو بھی اس زمانہ میں کافی ترقی حاصل ہوئی۔

خود امام محمد باقرؑ نے ایک کتاب تفسیر میں تحریر فرمائی جس کا پتہ ابن ندیم نے فہرست میں دیا ہے اور علم تفسیر کے مصنفات کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

کتاب الباقر محمد بن علی بن الحسین رواہ عنہ ابو الجارود زیاد بن المنذر رئیس الجارودیۃ الزیدیۃ۔	امام باقر محمد بن علی بن حسین کی کتاب جسے اُن سے ابو الجارود زیاد بن منذر رئیس جارودیہ نے نقل کیا ہے۔

ابو الجارود آخر عمر میں بے شک زیدی المسلک ہو گئے تھے اور فرقۂ امامیہ سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن اس زمانہ میں جب وہ اس جماعت سے علیحدہ نہیں ہوئے تھے ابو بصیر یحیٰی بن قاسم اسدی اور بعض دیگر معتبر رواۃ شیعہ نے اس کتاب کی اُن سے روایت حاصل کر لی تھی۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب مثل بہت سے علمی جواہر ریزوں کے محفوظ نہیں رہی بے شک کتابوں میں امام محمد باقرؑ سے تفسیر قرآن کے متعلق جو بہت روایات مذکور ہیں وہ ممکن ہے کہ اسی کتاب سے ماخوذ ہوں آپ کے اصحاب میں سے جابر بن یزید جعفی تھے جنھوں نے علم تفسیر امام محمد باقرؑ سے حاصل کیا تھا۔ اُن کی کتاب تفسیر کا تذکرہ نجاشی اور شیخ طوسی کی فہرستوں میں موجود ہے۔ ۱۲۸ھ میں انتقال کیا۔

عطیہ عوفی ایک بزرگ ابن عباس کے شاگرد تھے۔ انکی تفسیر پانچ جلدوں میں تھی

رُواسی محمد بن حسن بن ابی سارہ، ان کی کتاب معانی القرآن کا تذکرہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں موجود ہے۔

سب سے مشہور قدیم مفسر سدّی جن کا نام اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن کوفی ابو محمد قرشی تھا۔ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے امثل التفاسیر تفسیر اسمٰعیل السدی روی عنہ الائمۃ مثل الثوری وشعبۃ۔

"بہترین تفسیر اسمٰعیل سدی کی تھی جس کی ثوری اور شعبہ ایسے ائمہ فن نے روایت کی ہے"

انھوں نے تین اماموں کے زمانہ کا ادراک کیا۔ امام زین العابدینؑ۔ امام محمد باقرؑ۔ امام جعفر صادقؑ اور زیادہ فیوض امام باقرؑ سے حاصل کیے یہ سدی کبیر کہلاتے ہیں اور یقیناً شیعہ تھے۔

لیکن ایک دوسرے شخص سدی صغیر تھے جن کا نام محمد بن مروان ہے۔ وہ فرقۂ شیعہ سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ اور علم تفسیر سے تعلق انھیں بھی ہے اسلئے اکثر اقوال سدی کے جو کتب تفسیر میں درج ہیں اُن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سدی کبیر اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن ہی کے ہیں۔ اسمٰعیل سدی کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوئی۔

ابان بن تغلب یہ بڑے جلیل المرتبت بزرگ تھے۔ انھوں نے بھی تینوں اماموں سے استفادہ کیا۔

حافظ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ فی طبقات النحاۃ (مطبوعہ مصر صفحہ ۱۷۶) میں تصریح کی ہے۔

کان قاریا فقیہا لغویا امامیا ثقۃ عظیم المنزلۃ جلیل القدر روی عن علی بن الحسین وابی جعفر وابی عبداللہ وصنف غریب

وہ حافظ قرآن فقیہ۔ لغوی۔ امامی المذہب ثقہ بڑے بزرگ مرتبہ آدمی تھے علی بن حسین (زین العابدین) اور ابوجعفر (باقرؑ) اور ابوعبداللہ (صادقؑ) سے روایت کی غریب القرآن (قرآن کے مشکل الفاظ کا

القرآن وغیرہ ۔ حل) اور دوسری کتابیں تصنیف کیں ۔

ابن ندیم نے اپنی فہرست (مطبوعہ مصر ص۳۰) میں لکھا ہے ۔

لہ من الکتب کتاب معانی القرآن لطیف" ان کے مصنفات میں سے ایک کتاب

"معانی القرآن" عمدہ کتاب ہے، ۳۱۱ھ میں وفات پائی ۔

کلبی یہ مشہور مفسر ہیں ان کا پورا نام محمد بن سائب بن بشر کلبی تھا ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تقریب التہذیب میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے رامی

بالرفض یعنی ان کے متعلق رافضی ہونے کا الزام لگایا گیا" سمعانی نے لکھا ہے ۔

محمد بن السائب صاحب التفسیر کان من اهل الکوفۃ قائلا بالرجعۃ ۔

"ابن سائب صاحب تفسیر اہل کوفہ میں سے تھے اور رجعت کے قائل تھے"

رجعت خاص فرقہ شیعہ کا عقیدہ اور طرہ امتیاز ہے ۔

انکی کتاب علم تفسیر میں بہت مبسوط تھی ۔ ابن عدی نے لکھا ہے ہو معروف

بالتفسیر ولیس لاحد تفسیر اطول منہ ولا اشبع ۔

"ان کی تفسیر مشہور ہے کسی کی تفسیر اس سے زیادہ طولانی اور سیر حاصل نہیں تھی"۔

ابن ندیم نے اپنی فہرست (مطبوعہ مصر ص۱۴۲) میں ان کی کتاب تفسیر قرآن کا ذکر کیا ہے۔

نیز یہ واقعہ درج کیا ہے کہ سلیمان بن علی (بصرہ کے ایک رئیس) نے محمد بن سائب کو کوفہ

سے بصرہ بلوا کر اپنے گھر میں تفسیر قرآن کے درس کا سلسلہ جاری کرایا ۔ ابن سائب تفسیر بیان

کرتے تھے اور لوگ لکھتے جاتے تھے، یہانتک کہ سلسلۂ درس سورہ برات کی ایک آیت تک

پہونچا جس کی تفسیر ابن سائب نے عام معتقدات کے خلاف بیان کی ۔ لوگوں نے کہا ہم تو یہ تفسیر

نہیں لکھیں گے محمد بن سائب نے کہا جب تک اس آیت کی تفسیر اسی طرح جس طرح خداوند عالم نے

نازل فرمایا ہے لکھی نہیں جائے گی اسوقت تک میں ایک حرف آگے لکھواؤں گا نہیں۔

یہ قضیہ سلیمان بن علی کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلیمان نے کہا جو کچھ وہ کہتے ہیں اسی کو لکھواور چھوڑ دو ان باتوں کو جو اسکے مخالف ہیں۔

علامہ سید حسن صدر تحریر فرماتے ہیں کہ یہ امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کے مخصوصین میں سے تھے۔ (الشیعۃ وفنون الاسلام صہ) زمانہ کے لحاظ سے امام جعفر صادقؑ کے عصر سے پورے طور پر تعلق رکھتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ آخری دور میں برابر عراق میں قیام رہا ہو اسلئے امام جعفر صادقؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے ہوں ۱۲۶ھ میں وفات پائی۔

ابوحمزہ ثمالی ثابت بن ابی صفیہ دینار انکی کتاب علم تفسیر کا تذکرہ ابن ندیم نے فہرست (صہ) میں ان الفاظ سے کیا ہے۔

کتاب تفسیر ابی حمزۃ الثمالی واسمہ ثابت بن دینار وکنیۃ دینار ابوصفیۃ وکان ابوحمزۃ من اصحاب علی بن الحسینؑ من النجباء الثقات وصحب اباجعفر۔

ابوحمزہ ثمالی کی کتاب تفسیر۔ ان کا نام ثابت بن دینار تھا۔ اور انکے والد دینار کی کنیت ابوصفیہ تھی۔ ابوحمزہ علی بن حسین (امام زین العابدینؑ) کے اصحاب میں سے منتخب اور معتبر لوگوں میں سے تھے اور (امام) ابوجعفر (محمد باقرؑ) کی صحبت بھی حاصل کی تھی۔

شیخ طوسی نے امام زین العابدینؑ۔ امام محمد باقرؑ۔ امام جعفر صادقؑ۔ امام موسی کاظمؑ۔ چار اماموں کے اصحاب میں انکا تذکرہ کیا ہے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

یہ امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں ہیں جنھوں نے آپ کے قبل کے دور کو بھی پایا ہے۔ انھی میں سے **ابوبصیر** یحییٰ بن قاسم اسدی تھے علامہ سید حسن صدر تحریر فرماتے ہیں کہ انکی علم تفسیر میں ایک مشہور و معروف کتاب تھی جس کا تذکرہ نجاشی نے فہرست مصنفین شیعہ میں کیا ہے۔ شیخ طوسی نے

انکی بھی وفات ۱۵۰ھ میں بتلائی ہے۔

محمد بن علی بن ابی شعبہ حلبی ان کا بھی شیخ طوسیؒ نے اصحاب امام محمد باقرؑ میں ذکر کیا ہے اور جامع الرواۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے بھی روایت کی ہے۔ اُنھوں نے بھی ایک کتاب تفسیر میں لکھی۔

اب اُن اشخاص کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جو امام جعفر صادقؑ کے اصحاب ہیں اور آپ کے قبل دوسرے اماموں کی صحبت کو پانا اُن کا ثابت نہیں ہے۔

منخل بن جمیل اسدی کوفی نجاشی نے لکھا ہے۔

روی عن ابی عبداللہ لہ کتاب التفسیر، امام جعفر صادقؑ کے راوی ہیں اور کتاب التفسیر اُن کی تصنیف ہے۔

ابن غضائری کی تحریر کے موافق امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانہ تک رہے اور آپ سے بھی حادیث اخذ کئے۔

وہیب بن حفص ابوعلی حریری مولی بنی اسد فہرست مصنفین شیعہ میں نجاشی نے لکھا ہے۔

روی عن ابی عبداللہ وابی الحسن۔ وصنف کتبا کتاب تفسیر القرآن وکتاب فی الشرایع مبّوب۔

امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ سے احادیث اخذ کئے اور متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کتاب تفسیر قرآن ہے "

معلی بن محمد بصری یہ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں خود انکی حضوری خدمت امامؑ میں ثابت نہیں ہے لیکن انکے بھائی ابراہیم بن محمد بصری امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے معلی کی متعدد کتابیں تصنیف سے تھیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

کتاب الایمان، کتاب الدلائل، کتاب الکفر، کتاب شرح المودة فی الدین، کتاب التفسیر، کتاب الامامة، کتاب فضائل امیر المومنینؑ، کتاب قضایا امیر المومنینؑ، کتاب المودة، کتاب سیرة القائم۔

ہشام بن سالم فرقۂ شیعہ کے ممتاز متکلم اور مناظر تھے۔ شیخ الطائفہ نے ان کا امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے اصحاب میں شمار کیا ہے اور نجاشی نے اُن کے مصنفات میں کتاب التفسیر کا ذکر کیا ہے۔

حمزہ بن حبیب زیات کوفی قراء سبعہ میں سے امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے، انھوں نے کتاب متشابہ القرآن تصنیف کی جس کا ابن ندیم نے فہرست میں ذکر کیا ہے اور اس موضوع میں انکے پہلے کوئی تصنیف نہیں ہوئی تھی۔

امام جعفر صادقؑ کے بعض اصحاب میں آپ کی وفات کے بعد ایک خاص وبا واقفی فرقہ کی پیدا ہوئی تھی یعنی بعض اشخاص نے آپ کے بعد دوسرے اماموں کو تسلیم نہیں کیا یہ لوگ مذہبی حیثیت سے کتنے ہی قابل مذمت سمجھے جائیں لیکن بہرحال ان کے علمی خدمات کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان میں سے **علی بن ابی حمزہ بطائنی** تھے جو امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ابوبصیر یحییٰ بن قاسم اسدی کے مخصوص شاگرد تھے چونکہ ابوبصیر نابینا تھے۔ یہ اُنکے قائد یعنی ہاتھ پکڑ کر راستہ چلانے والے تھے۔ نجاشی نے اُن کے مصنفات میں سے کتاب التفسیر کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر حصہ اس کا ابوبصیر سے ماخوذ تھا۔

اسی طرح **حصین بن مخارق** ابو جنادہ سلولی یہ بھی واقفی تھے۔ شیخ طوسیؒ نے رجال میں اصحاب امام جعفر صادقؑ اور اصحاب امام موسیٰ کاظمؑ میں انکا ذکر کیا ہے۔ ابن ندیم نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

کان من الشیعة المتقدمین ولہ من الکتب کتاب التفسیر۔

"یہ قدیم شیعوں میں سے تھے اور انکے تصانیف سے کتاب تفسیر ہے۔"

عبداللہ بن عبدالرحمٰن الاصم المسمعی البصری اصحاب امام جعفر صادقؑ سے نجاشی نے انکے مصنفات میں کتاب الناسخ والمنسوخ کا شمار کیا ہے۔

جابر بن حیّان صدر اسلام کے یگانۂ روزگار فلسفی اور ریاضی داں امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے ان کے کثیر التعداد تصانیف میں ایک کتاب تفسیر ہے ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے وہ اصحاب ہیں جنھوں نے حضرت صادقؑ کے زمانہ کو نہیں پایا۔

عیسیٰ بن داؤد النجّار نجاشی نے لکھا ہے۔

کوفی من اصحابنا قلیل الرّوایۃ روی عن ابی الحسن موسیٰ لہ کتاب التفسیر۔	کوفہ کے رہنے والے ہمارے فرقہ امامیہ کے لوگوں میں سے تھے کم حدیثوں کے راوی ہیں انکی کتاب تفسیر قرآن میں ہے۔

کسائی علی بن حمزہ:- ابن ندیم نے ان کتابوں میں جو معانی قرآن کے متعلق لکھی گئی ہیں درج کیا ہے۔ کتاب معانی القرآن للکسائی ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

یونس بن عبدالرحمٰن امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ دونوں بزرگوں کی صحبت سے شرفیاب ہوئے۔ امام جعفر صادقؑ کو بھی دیکھا تھا مگر آپ سے استفادہ کا موقع حاصل نہیں ہوا۔

ابن ندیم فہرست (مطبوعہ مصر صفحہ ۳۰۹) میں انکے تذکرہ میں لکھا ہے۔

علامۃ زمانہ کثیر التصنیف والتالیف علی مذاہب الشیعۃ۔	اپنے زمانہ کے علامہ اور شیعی مذہب کے متعلق کثیر التعداد کتابوں کے مصنف تھے۔

نجاشی نے ان کے تصانیف میں کتاب تفسیر القرآن کو بھی تحریر کیا ہے ۲۰۸ھ میں وفات پائی۔

محمد بن خالد برقی یہ بھی امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ کے اصحاب میں سے تھے اور

نجاشی نے اُن کی کتابوں میں کتاب التفسیر اور کتاب التنزیل والتعبیر کا ذکر کیا ہے۔

حسن بن محبوب ابو علی سراد شیخ طوسی نے امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ دونوں بزرگوں کے اصحاب میں شمار کیا ہے اور ابن ندیم نے فہرست (ص ۳۰۹) میں لکھا ہے۔

من اصحاب مولانا الرضا و محمد ابنہ و لہ من الکتب کتاب التفسیر۔	یہ امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ان کی تصنیف سے کتاب تفسیر تھی۔

ان کا انتقال ۲۲۴ھ میں ہوا۔

اسی متصل وہ طبقہ ہے کہ جو امام رضاؑ کے مخصوص عہد اور آپ کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے **حسن بن علی بن فضال** جو امام رضاؑ کے مخصوصین میں سے تھے۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست (ص ۳۱۲) میں لکھا ہے کان من خاصۃ ابی الحسن الرضا و لہ من الکتب کتاب التفسیر۔

نجاشی نے اُن کے مصنفات میں سے کتاب الناسخ والمنسوخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بھی ۲۲۴ھ میں وفات پائی۔

دارم بن قبیصہ تمیمی دارمی یہ بھی امام رضاؑ کے اصحاب میں تھے اور کتاب الناسخ والمنسوخ تصنیف کی۔

حقیقۃً یہ عصر شیعی معارف و علوم کی ترویج کا زریں دور ہے۔

اسی دور میں ابو عبد اللہ **محمد بن عمر واقدی** نے "کتاب الرغیب فی علوم القرآن" لکھی اس کے متعلق علامہ سید حسن صدر کا خیال ہے کہ یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جس میں علوم قرآن کو جمع کیا گیا، ابن ندیم نے لکھا ہے کان یتشیع حسن المذہب یلزم التقیۃ' یہ شیعہ تھے اور خوش عقیدہ شخص تھے مگر تقیہ کے پابند رہتے تھے[1] کتاب منتخب فی تاریخ

---

[1] فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر ص ۱۴۴

آداب العرب (مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۱) میں بھی انکے تشیع کی تصریح کی ہے۔

۱۱ ذی الحجہ ۲۰۸ھ میں انتقال کیا۔

ہشام بن محمد بن سائب کلبی - ابن ندیم نے اُن کتابوں میں جو تفسیر قرآن میں تصنیف ہوئی ہیں لکھا ہے :-

کتاب تفسیر الآی التی نزلت فی اقوام باعیانھم لھشام الکلبی (یعنی) اُن ایات کی تفسیر جو خاص خاص جماعتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ہشام کلبی کی تصنیف (فہرست ابن ندیم صفحہ ۳۴۷)

مشہور نحوی فرّاء ابوزکریا یحییٰ بن زیاد اقطع کوفی نے کتاب معانی القرآن تصنیف کی جو چار جلدوں میں تھی۔ ابن ندیم نے فہرست صفحہ ۹۹ میں لکھا ہے :-

قال ابوالعباس ثعلب کان السبب فی املاء کتاب الفراء فی المعانی ان عمر بن بکیر کان من اصحابہ وکان منقطعا الی الحسن بن سھل فکتب الی الفراء ان الامیر الحسن بن سھل ربّما سألنی عن الشیئ بعد الشیئ من القراٰن فلا یحضرنی فیہ جواب فان رأیت ان تجمع لی اصولا او تجعل فی ذالک کتابا ارجع الیہ فعلت فقال الفراء لاصحابہ اجتمعوا

ابوالعباس ثعلب کا بیان ہے کہ فرا کے کتاب معانی القرآن تصنیف کرنے کا یہ سبب تھا کہ عمر بن بکیر ان کے شاگرد تھے۔ اور امیر حسن بن سہل کے مخصوصین میں سے تھے انھوں نے فراء کو خط لکھا کہ امیر حسن بن سہل اکثر مجھ سے قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے معنی دریافت کیا کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُس کا جواب میرے پیش نظر نہیں ہوتا اگر مناسب ہو تو آپ کچھ خاص اُصول میرے لئے قلمبند کر دیجیے یا ایک کتاب تصنیف کر دیجیے کہ میں اسکی طرف رجوع

حتی املی علیکم کتابا فی القرآن وجعل لهم یوما فلما حضروا خرج الیهم وکان فی المسجد رجل یؤذن ویقرأ بالنّاس فی الصّلوٰة فالتفت الیه الفرّاء فقال له اقرء بفاتحة الکتاب نفسرها ثم نوفی الکتاب کلّه فقرأ الرجل ویفسّر الفراء فقال ابو العبّاس لم یعمل احد قبله مثله ولا احسب ان احدا یزید علیه۔

کردیں۔ فراء نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ تم سب جمع ہو کر میں ایک کتاب قرآن مجید کے متعلق تم کو لکھوا دوں جب وہ لوگ جمع ہوئے تو فراء باہر آکے مسجد میں ایک شخص (حافظ قرآن) موذن تھا اور نماز پڑھاتا تھا فراء نے اس سے کہا کہ تم سورہ حمد کے شروع سے برابر قرآن پڑھتے جاؤ اور ہم اسکی تفسیر کرتے جائیں یہانتک کہ کتاب تمام ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تفسیر کی تصنیف فراء نے مکمل کی۔ ابو العباس ثعلب کا قول ہے کہ فرّاء کے قبل کسی نے ایسی کتاب تصنیف نہیں کی اور مجھے نہیں امید کہ اس کے بعد کوئی شخص اس سے بہتر تحریر کر سکے۔

فراء نے ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔

امام رضاؑ کے اصحاب میں سے حسن بن سعید بن حماد کوفی اہوازی بھی تھے۔ جو امام محمد تقیؑ کے زمانہ تک رہے اور آپ سے روایت کی۔ اُن کے مصنفات میں سے نجاشی نے کتاب تفسیر القرآن کا بھی ذکر کیا ہے۔

انکے چھوٹے بھائی حسین بن سعید بن حماد اہوازی بھی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ان دونوں بزرگواروں کے بعد امام علی نقیؑ کی خدمت میں بھی شرفیاب ہوئے تھے انکے بھی مصنفات میں کتاب التفسیر کا نام موجود ہے۔

علی بن اسباط کوفی یہ بھی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں تھے اور نجاشی نے

کتاب التفسیر کا ان کی ذکر کیا ہے۔

علی بن مہزیار الاہوازی بڑے جلیل المرتبہ کثیر الاحادیث بزرگ تھے امام رضاؑ امام محمد تقیؑ امام علی نقیؑ تینوں بزرگوں کی صحبت سے شرفیاب ہوئے۔ چالیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ہے کتاب التفسیر اور کتاب حروف القرآن۔

عبداللہ بن صلت ابوطالب قمی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے صحاب ہیں نجاشی نے کہا ہے۔

یعرف لہ کتاب التفسیر" انکی معروف کتاب تفسیر قرآن ہے"

ابوالعباس مبرد محمد بن یزید ازدی انکے تصانیف میں جو ابن ندیم نے ذکر کیے ہیں حسب ذیل کتابیں ہیں۔ کتاب معانی القرآن جو" الکتاب التام" کے نام سے مشہور تھی۔ کتاب اعراب القرآن۔ کتاب الحروف فی معانی القرآن۔ کتاب اتفقت الفاظہ واختلفت معانیہ فی القرآن ۲۸۵ھ میں وفات ہوئی۔

احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری قمی بزرگان علمائے شیعہ ہیں سے اور شہر قم کے مسلّم فقیہ تھے امام رضا۔ امام محمد تقیؑ۔ امام علی نقیؑ تینوں بزرگوں کے فیض سے بہرہ مند ہوئے۔ ان کے مصنفات ہیں سے کتاب الناسخ والمنسوخ ہے۔

اسکے بعد کا طبقہ وہ ہے جس نے امام محمد تقیؑ اور آپکے بعد کے ائمہ سے روایت کی ہے اور امام رضاؑ تک نہیں پہونچے ہیں ان میں سے **احمد بن محمد بن خالد برقی** ہیں شیخ طوسی نے ان کا امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کے صحاب میں ذکر کیا ہے یہ بڑے کثیر التصانیف تھے۔ نجاشی اور شیخ طوسی نے پوری ایک سو تک کتابیں انکے تصانیف سے ذکر کی ہیں۔ ان میں سے دو کتابیں علم تفسیر سے تعلق رکھتی ہیں کتاب الشواہد من کتاب اللہ عز وجل اور کتاب التاویل ۲۷۴ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اورمنہ ابوجعفر قمی امام علی نقیؑ کے زمانہ میں تھے اگرچہ روایت کسی امام سے حاصل نہیں ہی اور اسی لئے شیخ طوسیؒ نے باب من لم یروعنہمؑ (وہ اشخاص جنھیں کسی امام سے روایت حاصل نہیں ہی) میں درج کیا ہے انکے مصنفات میں سے ہے کتاب تفسیر القرآن۔

اسکے بعد کے طبقہ میں **علی بن حسن بن علی بن فضال** ہیں۔

امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں سے تھے شیخ طوسی و نجاشی نے ان کے تصانیف کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اُن کی تعداد تیس تک پہونچتی ہے ان میں سے کتاب التفسیر بھی ہے۔

بس اب یہ اصحاب ائمہ علیہم السلام کا آخری دور ہے۔

حسن بن خالد برقی سابق الذکر محمد بن خالد کے بھائی اور احمد بن محمد بن خالد برقی کے چچا تھے ان کے متعلق ابن شہر آشوب نے معالم العلماء میں لکھا ہے کہ امام حسن عسکریؑ کے افادات سے ایک تفسیر قرآن مرتب کی جو ایک سو بیس حصوں پر مشتمل تھی۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب اب بالکل نشان نہیں رکھتی۔

بے شک ایک کتاب "تفسیر امام حسن عسکریؑ" کے نام سے موجود ہے جو مشہور و معروف اور مطبوع و شایع شدہ ہی لیکن تحقیق کی بنا پر یہ کہنا ناگزیر ہے کہ یہ کتاب حضرت کی طرف صحیح نسبت نہیں رکھتی اور ضعیف و غیر معتبر نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔

نجف اشرف کے یگانۂ روزگار محقق عالم آقا شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ نے ایک مستقل رسالہ اس کتاب کے متعلق لکھا ہے جس میں اس کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

یہ رسالہ شایع نہیں ہوا لیکن ہم نے خود مصنف طاب ثراہ کے نوشتہ اصل مسودہ سے اس کتاب کو خود نقل کیا تھا۔ جو بحمد اللہ موجود ہے۔

یہاں سے ائمہ علیہم السلام کے ظہور کا دور ختم ہوجاتا ہے اور اصحاب ائمہ علیہم السلام کا سلسلہ بھی منقطع،
اب علماء کا دور ہے جو ائمہ معصومین علیہم السلام کی صحبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوئے ہیں اور ان سے
روایت حاصل کی ہے۔ ان میں سے پہلے طبقہ میں جو تیسری صدی ہجری یعنی زمانہ غیبت صغری
ہی سے تعلق رکھتا ہے حسب ذیل افراد ملتے ہیں۔

محمد بن ابو القاسم بن عبید اللہ بن عمران الجنابی البرقی ابوعبداللہ ماجیلویہ ان کا
زمانہ ائمہ علیہم السلام کے زمانہ کا آخری دور سمجھا جاسکتا ہے لیکن کسی امام کی خدمت میں شرفیابی ثابت نہیں ہے۔ احمد بن محمد بن خالد برقی کے داماد تھے اور انہی سے تمام احادیث حاصل کئے۔
انکے متعدد تصانیف تھے جن میں سے کتاب تفسیر ہے۔

سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی انھوں نے امام حسن عسکریؑ کے زمانہ کا
ادراک کیا مگر حضرت سے روایت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ نجاشی نے ان کے مصنفات میں کتاب
ناسخ القرآن و منسوخہ و محکمہ و متشابہہ کا ذکر کیا ہے سعد نے سنہ ۳۰۱ھ میں انتقال کیا۔

احمد بن صبیح ابوعبداللہ اسدی کوفی شیعہ اثنا عشری تھے۔ زیدی شیعہ ان کو اپنی
طرف منسوب کرتے ہیں لیکن درست نہیں ہے نجاشی نے لکھا ہے لہ کتب منہا التفسیر و کتاب
النوادر انکے مصنفات میں سے ایک کتاب تفسیر ہے اور دوسرے کتاب نوادر شیخ طوسی نے فہرست
میں اور ابن شہر آشوب نے معالم العلماء میں بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی کثیر التصانیف شخص تھے۔ شیخ طوسی اور نجاشی نے پچاس
سے زیادہ مصنفات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب تفسیر ہے ۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔

سلمۃ بن الخطاب براوستانی از دور قانی ان کا بھی تذکرہ شیخ طوسیؒ نے ان لوگوں
میں کیا ہے جنھیں ائمہ علیہم السلام سے روایت کا شرف نہیں حاصل ہوا۔ صفار یسعد بن عبداللہ

اشعری، احمد بن ادریس وغیرہ اُن سے نقل احادیث کرتے ہیں انھوں نے مستقل سورۂ یٰس کی ایک تفسیر لکھی تھی جس کا تذکرہ نجاشی نے اُن کے فہرست مصنفات میں کیا ہے۔

عیاشی محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمی سمرقندی مشہور و معروف مفسر قرآن ہیں انکی کتاب تفسیر کے حوالے برابر تفسیر عیاشی کے نام سے تمام کتب تفاسیر میں موجود ہیں۔ ابن ندیم نے فہرست میں ایک سو پچاس کتب ان کے تصنیف سے ذکر کیے ہیں اور شیخ طوسیؒ کا بیان ہے کہ ان کے مصنفات دو سو سے زائد تھے۔ علاوہ کتاب التفسیر کے اُنکے مصنفات میں ایک کتاب التنزیل بھی ہے وہ بھی غالباً معانی قرآن سے متعلق ہے۔

علی بن ابراہیم قمی انکی کتاب تفسیر بھی بہت مشہور ہے اور ابتک موجود ہے۔ نجاشی نے انکے مصنفات میں علاوہ کتاب التفسیر کے کتاب الناسخ والمنسوخ بھی ذکر کی ہے انکے وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔

بے شک یہ معلوم ہے کہ ۳۰۷ھ تک زندہ تھے اور اُسکے بعد انتقال ہوا ہے۔ محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ علی بن بابویہؒ یہ دونوں بزرگ جن کا انتقال ۳۲۹ھ میں ہوا ہے ان کے شاگرد تھے اور اُن سے احادیث اخذ کیے تھے۔

فرات بن ابراہیم کوفی یہ بھی بالکل اُسی زمانہ میں تھے۔ شیخ علی بن بابویہ نے ان سے بھی احادیث اخذ کیے تھے۔ انکی تفسیر زیادہ تر اُن احادیث کے مضامین پر مشتمل ہے جو ائمہ معصومین کے فضائل و مناقب میں وارد ہیں۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار میں لکھا ہے کہ تفسیر فرات بن ابراہیم کے مصنف کے متعلق اگرچہ علماء نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا ہے لیکن اس کے احادیث کا اُن اخبار کے مطابق ہونا جو ہمیں دوسرے ذرائع سے ائمہ معصومین کی جانب سے پہونچے ہیں۔ اسکے مصنف کے وثاقت و اعتبار کا شاہد ہے۔

محمد بن علی شلمغانی یہ شخص آخر عمر میں اگرچہ غالی ہو گیا تھا اور حسین بن روح وکیل ناحیہ مقدسہ سے حسد و عداوت میں گرفتار ہلاکت ہوا لیکن اس کے قبل اپنی زندگی بھر ممتاز علمائے شیعہ میں محسوب رہا۔ اسکے مصنفات میں ایک کتاب نظم القرآن ہے جس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ قرآن مجید کے معنوی تسلسل سے متعلق ہے جو علم تفسیر ہی کا ایک شعبہ ہے۔

ابن حجام محمد بن عباس بن علی بن مروان بن ماہیار ابو عبداللہ بزاز، ان کے مصنفات میں شیخ طوسی نے لکھا ہے۔ کتاب تاویل ما نزل فی النبیؐ، کتاب تاویل ما نزل فی شیعتہم، کتاب تاویل ما نزل فی اعدائہم، کتاب تفسیر الکبیر، کتاب الناسخ والمنسوخ، انکے انتقال کی بھی صحیح تاریخ معلوم نہیں بے شک سنہ ۳۲۸ھ تک زندہ تھے اور تلعکبری نے اسی سنہ میں ان سے روایت حاصل کی تھی۔

علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی مشہور شیخ صدوق محمد بن بابویہ کے والد بزرگوار بڑے عالی مرتبت اور جلیل القدر عالم تھے۔ فہرست شیخ طوسیؒ و رجال نجاشی میں انکے مصنفات کے ذیل میں کتاب التفسیر موجود ہے۔ ان کا انتقال سنہ ۳۲۹ھ میں ہوا کہ جس میں محمد بن یعقوب کلینی نے بھی انتقال کیا تھا جس سے غیر معمولی طور پر آسمانی ستارے کثرت سے ٹوٹے تھے اور اس لئے یہ سنہ سنۃ تناثر النجوم کے نام سے مشہور ہو گیا۔

آخر الذکر افراد کی وفات اگرچہ چوتھی صدی میں ہوئی ہے لیکن ان کا زیادہ تر زمانہ تیسری صدی میں گذرا ہے نیز ان کا دور حیات پورا غیبت صغریٰ سے متعلق ہے جن میں امامؑ اگرچہ نظروں کے سامنے موجود نہ تھے لیکن ان کے خصوصی نائبین موجود تھے بے شک اسی ۳۲۹ھ میں علی بن محمد سمری کے انتقال پر زمانہ غیبت کبریٰ کا شروع ہو گیا اور اب وہ طبقہ ہے جنہوں نے تیس برس سے زیادہ چوتھی صدی میں گذارے اور غیبت کبریٰ کے دور تک باقی رہے اگرچہ ان کا ابتدائی حصہ یقیناً غیبت صغریٰ سے متعلق ہے۔

عبدالعزیز بن یحییٰ بن احمد بن عیسیٰ الجلودی بہت بڑے کثیر التصانیف شخص تھے۔ نجاشی نے انکے ایک سو نوے ۱۹۰ تصانیف ذکر کئے ہیں ان میں سے تفسیر قرآن کے متعلق حسب ذیل کتابیں تھیں کتاب التفسیر عن علی کتاب التنزیل عن ابن عباس۔ کتاب التفسیر عن ابن عباس۔ کتاب الناسخ والمنسوخ عن ابن عباس ابن ندیم نے ان کی وفات کو ۳۳۰ھ کے بعد بتلایا ہے۔

حافظ ابن عقدہ ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید سبیعی ہمدانی مذہبی حیثیت سے زیدی شیعہ تھے لیکن اثنا عشری طبقہ کے علماء کے ساتھ بالکل وابستہ تھے یہانتک کہ کتابوں میں اکثر امامی اثنا عشری نقطۂ نظر کے احادیث درج کیے۔ نجاشی نے لکھا ہے کہ میں نے انکی کتاب تفسیر القرآن کا مشاہدہ کیا جو بہت عمدہ کتاب ہے۔ حافظ موصوف نے کوفہ میں ۳۳۳ھ میں انتقال کیا۔

ابوبکر صولی محمد بن یحییٰ اُن کے مصنفات میں جیسا کہ ابن ندیم نے ذکر کیا ہے کتاب الشامل فی علم القرآن ہے جو مکمل نہیں ہو سکی اُن کی وفات ۳۳۵ھ میں ہے۔

محمد بن حسن بن الولید القمی شیخ صدوق رح کے استاد تھے۔ فہرست شیخ طوسی میں اُن کے مصنفات سے کتاب الجامع اور کتاب التفسیر کا ذکر کیا ہے۔ نجاشی نے بھی لکھا ہے "له کتب منها کتاب تفسیر القرآن" اُن کی بہت سی کتابیں تھیں جن میں سے ایک کتاب تفسیر قرآن ہے موصوف نے ۳۴۳ھ میں انتقال کیا۔

عباد بن عباس یہ مشہور یگانہ روزگار ادیب صاحب بن عباد کے والد تھے۔ ابن ندیم نے انکے فرزند صاحب بن عباد کے حالات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اہل علم و فضل سے تھے اور انھوں نے ایک کتاب احکام القرآن میں لکھی ہے جس میں معتزلہ کے مسلک کی حمایت کی ہے۔

علامہ سید محسن عاملی نے اعیان الشیعہ میں لکھا ہے کہ ابن ندیم کا یہ فقرہ اس لحاظ سے ہے

کہ اصول دین میں شیعی عقائد اکثر معتزلہ کے عقائد سے متفق ہوتے ہیں اسی بنا پر بعض لوگوں نے صاحب بن عباد اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ تک کو معتزلی مذہب کا لکھ دیا ہے حالانکہ یہ سب لوگ شیعہ تھے۔

احمد بن محمد بن حسین بن حسن بن دول قمی ان کے تصانیف کی تعداد نجاشی کے قول کے مطابق ایک سو تک پہونچی تھی۔ ان میں سے ایک کتاب تفسیر ہے ۳۵۰ھ میں وفات پائی۔

علی بن احمد ابو القاسم کوفی علمائے امامیہ میں سے تھے۔ بے شک آخر عمر میں بعض غالیانہ اقوال کی وجہ سے غیر معتبر ہو گئے۔ ان کے مصنفات میں سے ایک کتاب تفسیر تھی جو مکمل نہیں ہوئی ۳۵۲ھ میں انتقال ہوا۔

محمد بن احمد بن ابراہیم بن سلیمان صابونی اکابر علمائے شیعہ میں سے تھے اور مصر میں قیام رکھتے تھے۔ ان کے مصنفات میں سے ہے کتاب تفسیر معانی القرآن وتسمیۃ اصناف کلامہ۔ بحر العلوم طاب ثراہ نے تصریح فرمائی ہے کہ انھوں نے غیبت صغریٰ اور غیبت کبریٰ دونوں زمانوں کو پایا ہے تاریخ وفات پورے طور سے معلوم نہیں کتاب "الشیعۃ وفنون الاسلام" اور کتاب "اعیان الشیعہ" میں ان کی وفات سنہ ۱۳ھ میں لکھی ہے مگر اس صورت میں ان کا غیبت کبریٰ کے زمانہ کو پانا صحیح نہ ہو گا۔

محمد بن احمد بن محمد بن حارث ابو الحسن حارثی تقریباً اسی زمانہ میں تھے۔ ان کے مصنفات سے ہے کتاب نوادر علم القرآن جس کا نجاشی نے تذکرہ کیا ہے۔

اسکے بعد کا طبقہ وہ ہے جو بالکل غیبت کبریٰ کے دور سے متعلق ہے لیکن اسی چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ختم ہو گیا ہے۔

ان میں سب سے نمایاں ہستی شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی کی ہے ان کی ولادت غیبت صغریٰ میں حسین بن روح کے واسطہ سے حضرت حجت عجل اللہ فرجہ کی دعا کی برکت اور بشارت کی بنا پر ہوئی تھی لیکن وہ بہت کمسن تھے جب زمانہ غیبت صغریٰ منقضی ہو گیا اور غیبت

کبریٰ کا دور آ گیا۔ شیخ صدوق دنیائے تشیع کے اُن بے نظیر افراد میں سے ہیں جن کے کارنامے حیات جاوید رکھتے ہیں اُنکے مصنفات کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی۔ اُنھوں نے تفسیر قرآن کے موضوع کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اُنکی حسب ذیل کتابیں اس شعبہ میں تصنیف کیں کتاب جامع تفسیر المنزل فی الحج۔ کتاب تفسیر القرآن۔ کتاب مختصر تفسیر القرآن ۳۸۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن علی بن عبدک ابو جعفر جرجانی ان کے متعلق نجاشی نے لکھا ہے جلیل القدر من اصحابنا فقیہ متکلم لہ کتب منہا کتاب التفسیر" ہمارے فرقہ کے جلیل القدر علماء میں سے فقیہ اور متکلم تھے ان کے مصنفات سے کتاب تفسیر ہے۔

ابو منصور صرام نیشاپوری یہ بھی اسی طبقہ میں تھے۔ نجاشی نے لکھا ہے لہ کتاب تفسیر القرآن کبیر حسن" اُن کے مصنفات سے تفسیر قرآن بڑی اور عمدہ کتاب ہے۔

موسیٰ بن اسمٰعیل اُنھوں نے ایک کتاب تفسیر قرآن میں لکھی۔ فہرست شیخ طوسی میں اسکا نام "جامع التفسیر" اور رجال نجاشی میں "جوامع التفسیر" ہے۔

نعمانی محمد بن ابراہیم بن جعفر ابو عبداللہ کاتب معروف با بن ابی زینب ان کی کتاب "غیبت" مشہور ہے اور تفسیر قرآن میں امیر المومنین کی طویل حدیث انواع علوم قرآن کے متعلق جس کا تذکرہ اس کے قبل آچکا ہے انہی کی جمع کردہ ہے جو "تفسیر نعمانی" کے نام سے مشہور ہے۔

عبدالرحمان بن حسن قاشانی ابو محمد ضریر نجاشی نے اُنکے نام کے ساتھ "مفسر" کی لفظ بھی لکھی ہے اور اُنکے حافظہ کی تعریف کی ہے۔

حسن بن موسیٰ نوبختی متکلم فلسفی بڑے جامع علوم و فنون شخص تھے۔ اُنھوں نے علم تفسیر میں کتاب "متشابہ القرآن" تصنیف کی جو آیات متشابہات کی تاویل میں ہے۔

اسکے بعد کا طبقہ شیخ صدوق کے تلامذہ کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ہوے ہیں اور پانچویں صدی کی ابتدا تک رہے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان معروف با بن المعلم البغدادی دنیائے تشیع کے سرآمد، روزگار فقیہ و متکلم ہیں۔ اُنھوں نے مستقل طور سے کوئی تفسیر تو نہیں تحریر فرمائی لیکن ان کے مصنفات میں حسب ذیل کتابیں علم تفسیر سے متعلق ہیں۔ کتاب البیان فی تالیف القرآن۔ کتاب فی تاویل قولہ فاسألوا اھل الذکر۔ کتاب الرد علی الجبائی فی التفسیر کتاب الکلام فی دلائل القرآن۔ کتاب البیان عن غلط قطرب فی القرآن شیخ مفیدؒ نے ۴۱۳ھ میں رحلت فرمائی۔

حسین بن علی بن الحسین بن محمد بن یوسف وزیر ابو القاسم مغربی سابق الذکر محمد بن ابراہیم بن جعفر کاتب النعمانی کے نواسے تھے۔ نجاشیؒ نے انھیں اپنا اُستاد کہا ہے اور اُن کے مصنفات سے کتاب خصائص علم القرآن کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۵ ماہ رمضان ۴۱۸ھ میں انتقال کیا۔

سید رضی محمد بن الحسین الموسوی مشہور کتاب نہج البلاغہ کے جامع شیخ مفیدؒ کے شاگرد تھے مگر کم عمر میں اپنے استاد کی زندگی ہی میں انتقال کیا انکی کتاب تفسیر "حقائق التنزیل و دقائق التاویل" وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جس کا سہرا قدرت نے اسی سر کے لئے مخصوص کیا تھا علامۃ الدہر آقا سید حسن صدر طاب ثراہ "الشیعہ و فنون الاسلام" میں تحریر فرماتے ہیں۔

کشف فیہ عن غرائب القرآن و عجائبہ وخفایاہ وغوامضہ وابان غوامض اسرارہ ودقائق اخبارہ وتکلم فی تحقیق حقایقہ وتدقیق	اس تفسیر میں قرآن مجید کے عجیب و غریب رموز و اسرار اور مخفی نکات اور باریک باتوں کا انکشاف کیا گیا اور حقائق و دقائق تفسیر و تاویل میں اس طرح بحث و تحقیق سے کام لیا گیا ہے جس کی

تاویلہ بما لم یسبقہ احد الیہ   نظیر اسکے قبل ناپید تھی اور نہ کسی کا طائر فکر

ولا حام طائر فکر احد علیہ۔   اس تک پہونچا تھا۔

اس تفسیر کا ایک حصہ قلمی صورت میں مشہد مقدس کے کتبخانۂ رضویہ میں موجود ہے جو بہت قدیم نسخہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے جس پر خود مصنف کے ہاتھ کی تحریر موجود تھی اس حصہ کی ابتدا سورۂ آل عمران کے شروع سے اور انتہا سورۂ نساء پر ہے اور اس پر تحریر ہے کہ یہ اس تفسیر کا پانچواں حصہ ہے۔ اس نسخہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تفسیر کی تصنیف سنہ ۴۰۲ھ میں ہوئی ہے جس کے چار ہی برس بعد علامہ سید رضی طاب ثراہ کا انتقال ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے کمال شباب علمی کی تصنیف ہے۔ اس نسخہ کے ختم کتابت کی تاریخ ۱۲ رجب سنہ ۵۳۳ھ ہے جو تصنیف سے صرف ایک سو اُنتیس برس بعد ہے اور جس کو اب تک آٹھ سو ستائیس (۸۲۷) برس کی مدت گذری ہے۔ اب اس تفسیر کا موجودہ حصہ نجف اشرف میں طبع بھی ہو گیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ مسلسل تفسیر نہیں ہے بلکہ متفرق آیات کی مختلف مقامات سے تفسیر لکھی گئی ہے۔

موصوف نے اس تفسیر کے علاوہ بھی اس شعبہ سے متعلق کتاب متشابہ القرآن اور مجازات القرآن تصنیف فرمائی۔

علامہ سید رضی کی ولادت سنہ ۳۵۹ھ میں اور وفات ۴۷ برس کی عمر میں روز یکشنبہ سنہ ۴۰۶ھ میں ہوئی۔

محمد بن احمد وزیر عمیدی ۔ ان کے مصنفات سے ہے کتاب متشابہ القرآن اور کتاب انتزاعات القرآن سنہ ۴۲۳ھ میں وفات پائی۔

علم الہدیٰ سید مرتضیٰ علی بن الحسین الموسوی طاب ثراہ، علامہ سید رضی کے بڑے بھائی اور شیخ مفید کے شاگرد آسمان تشیع کے آفتاب درخشاں تھے۔ آپ کے مصنفات جمیع علوم فنون

میں بکثرت ہیں۔ جن میں سے علم تفسیر کے متعلق حسب ذیل کتابیں ہیں۔

تفسیر سورہ حمد۔ تفسیر سورہ بقرہ جو مکمل نہیں ہوئی تفسیر آیۂ مبارکہ قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم۔ الکلام علی من تعلق بقولہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر۔ تفسیر آیۂ شریفہ لیس علی الذین امنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا۔ رسالہ محکم و متشابہ جو تقریباً پورا تفسیر نعمانی سے ماخوذ ہے۔ ۴۳۶ھ میں رحلت فرمائی۔

اب وہ طبقہ ہے جو بالکل پانچویں صدی سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے اس میں علم تفسیر کے سب سے بڑے مصنف شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی تھے جو شیخ مفید علیہ الرحمہ کے شاگرد اور اس حیثیت سے سید مرتضیٰ رحمہ اللہ کے ہمرتبہ تھے مگر خود سید مرتضیٰ رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں بھی شریک ہوئے تھے اس لئے شاگرد تھے۔ آپ کی تفسیر التبیان فی علوم القرآن وہ عظیم الشان تفسیر ہے جو دنیائے علم میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ طبرسیؒ کی کتاب مجمع البیان زیادہ تر اس سے ماخوذ ہے میں نے سنا ہے کہ نجف اشرف میں جو علمی انجمن قائم ہوئی ہے وہ اب اس کتاب کو طبع کرانا چاہتی ہے۔ خدا کرے ایسا ہو اس مستقل تفسیر کے علاوہ "مسائل رجبیہ در تفسیر بعض آیات قرآن" مسائل دمشقیہ جس میں ۱۲ مسئلے تفسیر قرآن کے متعلق حل کئے گئے ہیں۔ شیخ الطائفہ کی ولادت ماہ رمضان ۳۸۵ھ میں اور وفات ۴۶۰ھ میں ہوئی۔

علامہ کراجکی ابو الفتح محمد بن علی بن عثمان بن علی، یہ بھی شیخ مفیدؒ اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے اکابر تلامذہ میں سے تھے آپ کے مصنفات میں سے تفسیر میں کتاب الراشد المنتخب من غرر الفوائد ہے جو بعض آیات قرآن کی تفسیر پر مشتمل تھی اس کتاب کا حجم دو سو ورق کا تھا۔ اس کے علاوہ کتاب کنز الفوائد میں جو پانچ حصوں کے اندر متعدد علوم و فنون پر مشتمل ہے ایک شعبہ مستقل تفسیر کا ہے جس میں کثیر التعداد آیات قرآن کی شرح کی گئی ہے۔ آپ کی وفات ۴۴۹ھ میں ہوئی۔

اسمٰعیل بن علی بن حسین سمان اُنھوں نے مکمل طور سے ایک تفسیر دس جلدوں میں لکھی جس کا نام ہے "البستان فی تفسیر القرآن" شیخ منتجب الدین نے کتاب الفہرست میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ محمد بن احمد بن علی فتال نیشاپوری انکا بھی ذکر منتجب الدین نے کتاب الفہرست میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ صاحب التفسیر ثقۃ واى ثقۃ ۔ تفسیر قرآن کے مصنف اور بہت بڑے مستند شخص ہیں۔

شیخ ابو عبداللہ محمد بن ہر دن الکال ان کے حالات بالکل معلوم نہیں اُنھوں نے شیخ الطائفہ کی تفسیر تبیان کا خلاصہ لکھا اور ایک کتاب "متشابہ القرآن" تصنیف کی۔

سید ضیاء الدین ابو الرضا فضل اللہ بن علی حسنی راوندی۔ شیخ ابو علی ابن شیخ الطائفہ کے شاگرد اور منتجب الدین مصنف فہرست کے استاد تھے انکی علم تفسیر میں "کافی" ایک کتاب تھی جس کے متعلق منتجب الدین نے لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو دیکھا اور اُس کا کچھ حصہ خود مصنف سے پڑھا بھی ہے۔

محمد بن ابی الخیر علی بن ابی سلیمان ظفر ہمدانی ۔ ان کا بھی تذکرہ منتجب الدین نے کیا ہے اور لکھا ہے عالم مفسر صالح واعظ لہ کتاب مفتاح التفسیر ودلائل القرآن" وہ عالم مفسر واعظ تھے۔ ان کی تصنیف سے کتاب مفتاح التفسیر اور دلائل القرآن ہیں"۔

چھٹی صدی شروع ہو جاتی ہے اور ان علما میں جنھوں نے اس دور میں علم تفسیر کی خدمت کی حسب ذیل حضرات ہیں۔ شیخ جمال الدین ابو الفتوح رازی حسین بن علی بن محمد خزاعی یگانہ روزگار مفسر تھے انکی کتاب تفسیر قرآن میں "روض الجنان وروح الجنان" بیس جلدوں میں سرمایہ تحقیق ہے۔ یہ شیخ منتجب الدین اور ابن شہر آشوب دونوں بزرگوں کے اُستاد تھے۔

سید عز الدین علی بن ضیاء الدین ابی الرضا فضل اللہ الحسنی الراوندی یہ مذکورہ بالا سید

ضیاءالدین فضل اللہ بن علی حسنی کے بیٹے اور منتجب الدین کے معاصر ہیں منتجب الدین نے کتاب فہرست میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب تفسیر قرآن میں لکھی جو تمام نہیں ہوئی۔ تاریخ وفات پورے طور سے معلوم نہیں لیکن اتنا ثابت ہے کہ ۵۴۸ھ تک یہ زندہ موجود تھے۔

اسی زمانہ میں امین الاسلام شیخ ابو علی فضل بن حسن بن فضل طبرسی مشہور مفسر ہیں جنکی تفسیر مجمع البیان اس وقت دنیائے تشیع میں مرکز استفادہ ہے۔ یہ کتاب اصل تصنیف کے موقع پر دس حصوں میں منقسم کی گئی تھی جو ایران میں دو جلدوں میں طبع ہوئی اور اب مطبع العرفان صیدا میں پھر وہ بہت سی جلدوں میں پھیلا کر طبع کی جارہی ہے۔ اس تفسیر میں اللغۃ الاعراب اور پھر المعنی کے عنادین قائم کئے گئے ہیں اور اول الذکر دونوں عنوانوں کے تحت میں سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔

اس کتاب کے متعلق ایک عام اعتراض ہے جسے شیخ یوسف بحرینی نے "لؤلؤۃ البحرین" میں صاف ظاہر کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے بہت سی چیزیں تفاسیر اہل سنت سے نقل کی ہیں اور تفاسیر اہلبیتؑ کو بہت کم درج کیا ہے۔ بے شک کہیں کہیں تفسیر عیاشی اور علی بن ابراہیم قمی سے بعض احادیث نقل کر دئیے ہیں اور بس۔

علامہ طبرسی کی علاوہ مجمع البیان کی دو تفسیریں اور تھیں ایک متوسط جو چار حصوں پر منقسم تھی اور دوسری مختصر جو ایک جلد میں تھی۔ اس متوسط ہی کا نام "جوامع الجامع" تھا جو عام طور سے "جمع الجوامع" مشہور ہے۔ نیز ایک کتاب "الشافی الکافی من تفسیر الکشاف" علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کے تبصروں پر مشتمل تھی۔ آپ کا انتقال ۵۴۸ھ میں ہوا۔

اس طبقہ کے بعد اسی صدی میں۔

قطب الدین راوندی سعد بن ہبۃ اللہ بن حسن ہیں جنھوں نے "خلاصۃ التفاسیر" تحریر کی جو دس جلدوں پر مشتمل تھی اس کے علاوہ کتاب فقہ القرآن اور کتاب آیات الاحکام التصنیف

کی۔ شیخ حر عاملی کا امل الآمل میں یہ خیال ہے کہ شرح آیات الاحکام کتاب فقہ القرآن کے علاوہ ہے محدث نوری مستدرک الوسائل میں لکھتے ہیں کہ کتاب فقہ القرآن وہی کتاب آیات الاحکام ہے۔ اس کے علاوہ نہیں ہے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ آیات الاحکام یا فقہ القرآن یعنی قرآن مجید کے اُن آیات کی تفسیر جو احکام فقہیہ سے متعلق ہیں سب سے پہلے انہی قطب الدین راوندی نے تصنیف کی جو ۵۶۲ھ میں پایۂ اتمام کو پہونچی۔ ۵۷۳ھ میں اُنھوں نے انتقال کیا۔

شیخ محمد بن ادریس عجلی حلی مصنف سرائر مشہور فقیہ و عالم ہیں اُنھوں نے کوئی مستقل تفسیر نہیں لکھی مگر کتاب التعلیقات ایک کتاب تفسیر "تبیان" مصنفہ شیخ الطائفہ کے متعلق حواشی اور اعتراضات کے طور پر تحریر فرمائی۔ شیخ حر عاملی امل الآمل میں لکھتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب ایران میں خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی۔ آپ کی وفات ۵۹۸ھ میں ہوئی۔

محمد بن حسین فتال فارسی نیشاپوری آپ نے ایک کتاب "تنویر فی معانی التفسیر" تحریر فرمائی جس کا ابن شہر آشوب نے تذکرہ کیا ہے۔

شیخ رشید الدین محمد بن علی ابن شہر آشوب سروی مازندرانی مصنف کتاب المناقب بڑے پایہ کے مفسر تھے۔ علمائے اہلسنت میں سے شمس الدین محمد بن علی بن احمد داودی مالکی شاگرد جلال الدین سیوطی نے اُن کا طبقات المفسرین میں تذکرہ کیا ہے۔ اُن کے مصنفات سے جو علم تفسیر سے متعلق ہیں دو کتابیں ہیں کتاب الاسباب والنزول علی مذہب آل الرسول اور کتاب متشابہ القرآن اس دوسری کتاب کا قلمی نسخہ میں نے کتبخانہ آقا علی محمد نجف آبادی میں جو نجف اشرف کے حسینیہ شوستریاں کے اندر وقفی صورت سے موجود ہے مشاہدہ کیا ہے۔ ابن شہر آشوب نے ۵۸۸ھ میں انتقال کیا۔

ساتویں صدی ہجری میں۔

سید احمد بن موسیٰ بن طاؤس مشہور و معروف سید علی بن طاؤس کے بھائی تھے انھوں نے ایک کتاب "شواہد القرآن" تحریر کی جو دو جلدوں میں تھی ۶۷۳ھ میں انتقال کیا۔

علامہ حسن بن یوسف بن مطہر حلی حقیقۃً آیۃ اللہ (خدا کی نشانی) تھے۔ اتنے کثیر التعداد مصنفات کہ انسان متحیر ہو جائے علم تفسیر میں اُن کی دو کتابیں ہیں (۱) نہج الایمان فی تفسیر القرآن" اس میں انھوں نے کشاف تبیان وغیرہ تفاسیر کا خلاصہ ذکر کیا ہے۔ (۲) السر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز۔ ۷۲۶ھ میں دنیا سے رحلت فرمائی اور اُنکی ولادت ۲۹ ماہ رمضان ۶۴۸ھ میں ہوئی تھی اسکے معنی یہ ہیں کہ باون سال اُن کی عمر کے ساتویں صدی میں گذرے۔

آٹھویں صدی میں۔

ملا عبد الرزاق کاشی: ان کا ذکر آقا حاج شیخ عباس قمی دام ظلہ نے کتاب الکنیٰ والالقاب میں کیا ہے۔ اُن کی تصنیف سے ہی کتاب تاویل الآیات ۷۳۵ھ میں وفات پائی۔

شیخ قطب الدین محمد بن محمد رازی بوہی بڑے منطقی فلسفی فقیہ مفسر شہید اول اور فخر المحققین فرزند علامہ حلی کے شاگرد تھے علم تفسیر کے سلسلہ میں اُنکی تصنیف سے تفسیر کشاف زمخشری کے دو حاشیے تھے جو کثیر علمی تفسیری نکات پر مشتمل تھے ۷۶۶ھ وفات پائی۔

شیخ مقداد بن عبد اللہ سیوری حلی اسدی یہ بھی شہید اول کے شاگرد تھے تفسیر میں اُنکی کتاب کنز العرفان فی فقہ القرآن" ہے جو آیات الاحکام کی شرح میں تحریر فرمائی ہے آپ کی وفات ۷۹۲ھ میں ہوئی۔

شیخ جمال الدین احمد بن عبد اللہ بن سعید المتوّج معروف بہ ابن متوّج بحرانی

یہ بھی شہید اول اور فخر المحققین کے شاگرد تھے۔ فاضل مقداد اپنی کتاب "کنز العرفان" میں انکو "معاصر" کی لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

انھوں نے دو مستقل تفسیریں تحریر فرمائیں ایک مختصر اور ایک مطوّل اسکے علاوہ ایک رسالہ ناسخ اور منسوخ کے بیان میں۔ ایک کتاب "النہایۃ فی تفسیر الخمسمائۃ آیۃ" اس میں ان پانچسو آیتوں کی تفسیر ہے جو احکام شرعیہ کے متعلق فقہا نے منتخب کی ہیں۔

نویں صدی میں۔

سید بہاء الدین علی بن سید غیاث الدین عبدالکریم بن عبدالحمید حسینی انھوں نے تفسیر کشاف زمخشری پر آٹھ سو اعتراض تحریر کیے جنھیں دو جلدوں میں مجتمع کیا ایک "تبیان انحراف صاحب الکشاف"۔ دوسرے "النکت اللطاف الواردۃ علی صاحب الکشاف"۔

کمال الدین حسن بن محمد بن حسن استرآبادی نجفی انھوں نے "آیات الاحکام" کی تفسیر میں "معارج السئول و مدارج المامول" جس کا مشہور نام "کتاب اللباب" ہے تصنیف کی کہا گیا ہے کہ یہ آیات الاحکام کی شرح میں بہترین تصنیف تھی۔ اس کتاب کی تصنیف سنہ ۸۹۱ھ میں ختم ہوئی ہے۔

دسویں صدی ہجری میں۔

امیر غیاث الدین منصور حسینی شیرازی جو سید علی خاں شارح صحیفۂ کاملہ کے اجداد میں سے ہیں، ان کے تصانیف سے ہی تفسیر القرآن وفات سنہ ۹۴۸ھ میں ہوئی۔

شاہ طاہر دکنی جنھوں نے حیدرآباد میں تشیع کی بنیاد قائم کی ان کے مصنفات میں سے تفسیر بیضاوی کا حاشیہ ہے جو بہت نکات تفسیری پر مشتمل ہوگا۔ انھوں نے سنہ ۹۵۶ھ میں انتقال کیا۔

شہید ثانی شیخ زین الدین بن علی عاملی دنیائے تشیع کے مستند ترین علما میں سے تھے۔
اُنکے تصانیف کا بڑا حصہ علم فقہ و اصول سے متعلق ہے علم تفسیر میں انھوں نے ایک رسالہ بسم اللہ کی شرح میں اور ایک رسالہ آیۂ مبارکہ والسابقون الاولون کی تفسیر میں تحریر کیا ہے۔
آپ ۹۶۶ھ میں بجرم تشیع شہید ہوئے۔

ابو الغنائم عبد الرزاق کاشانی یہ شہید ثانی کے معاصرین میں سے تھے اُنھوں نے ایک کتاب "التاویلات" تفسیر آیات متشابہات میں لکھی تھی۔ یہ کتاب کتبخانۂ رضویہ مشہد مقدس میں موجود ہے جس کے متعلق فہرست کتبخانہ میں لکھا ہے "انصاف این است کہ مثل این کتاب تصنیف نہ شدہ" یہ عجیب لطیفہ ہے کہ فہرست مذکور کے بیان کے مطابق اس کتاب "تاویلات" کو ہندوستان میں محیی الدین ابن عربی کی طرف منسوب کرکے طبع کیا گیا ہے جو بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔

علی بن حسن زواری محقق ثانی علی بن عبد العالی کرکی کے شاگردوں میں سے تھے اُنھوں نے فارسی زبان میں کتاب "ترجمۃ الخواص" قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے متعلق تحریر کی۔

محمد بن احمد معروف بہ خواجگی شیرازی انھوں نے تفسیر مجمع البیان کا خلاصہ تحریر کیا جس کو ابراہیم قطب شاہ (سلطان حیدر آباد دکن) کے نام سے معنون کیا۔

ملا فتح اللہ کاشانی، ان کی تفسیر منہج الصادقین اور خلاصۃ المنہج دونوں مشہور ہیں ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔

اسی صدی کے اواخر میں **ملا احمد بن محمد مقدس اردبیلی** مشہور مجتہد تھے جنھوں نے تفسیر آیات الاحکام میں کتاب "زبدۃ البیان" تصنیف کی آپنے ۹۹۲ھ میں وفات پائی۔

ملا خلیل قزوینی مشہور شارح اصول کافی تھے جنھوں نے تفسیر مجمع البیان کا ایک حاشیہ تصنیف کیا شیخ حر عاملی امل الآمل میں لکھتے ہیں کہ میں نے موصوف کو اپنے پہلے سفر حج

ہیں کہ مقطع میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں مجاور تھے اور حاشیہ مجمع البیان کی تصنیف میں مشغول تھے۔
آپ کا انتقال سنہ ۱۰۰۱ھ میں ہوا۔

فیضی مشہور ابوالفضل کے بھائی۔ سلطان جلال الدین اکبر بادشاہ کے مشہور ارکان سلطنت میں سے بڑے ادیب اور مشکل پسند تھے۔ اُنھوں نے تفسیر قرآن صنعت اہمال یعنی غیر نقطہ دار حروف میں تصنیف کی جس کو "سواطع الالہام" سے نامزد کیا اس کتاب کی تصنیف سنہ ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی ہے اور یہ تفسیر موجود اور شایع ہے۔

اسی طبقہ میں جو دسویں صدی کے اواخر اور گیارھویں صدی کے اوائل میں موجود تھا۔

سید حسین خلخالی نے تفسیر بیضاوی کا حاشیہ تحریر کیا۔ کشف الظنون میں اس حاشیہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سورہ یٰسٓ کی ابتدا سے آخر قرآن مجید تک ہے، لیکن کتب خانہ امام رضا علیہ السلام میں اس حاشیہ کا ایک نسخہ موجود ہے جو ابتدائے قرآن مجید سے ہے۔ موصوف کا انتقال سنہ ۱۰۱۴ھ میں ہوا۔

قاضی نوراللہ شوستری جو ہندوستان میں شہید ثالث کے نام سے مشہور ہیں جن کا مزار آگرہ میں ہے اُنھوں نے تفسیر بیضاوی پر دو حاشیے تحریر کئے۔ سنہ ۱۰۱۹ھ میں بجرم تشیع جہانگیر کے حکم سے مقتول ہوئے۔

میرزا محمد استرآبادی مشہور مصنف رجال کبیر اُنھوں نے کتاب شرح آیات الاحکام یعنی احکام فقہیہ سے متعلقہ آیتوں کی تفسیر تحریر کی۔ سنہ ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی۔

سید محمد بن زین العابدین حسینی استرآبادی۔ ان کی تصنیف ہے تفسیر (ترجمۃ الخواص) میں نے اسکی دوسری جلد دیکھی ہے جو سورہ مریم سے آخر قرآن تک ہے، اور ۲۰ صفر کو سنہ ۱۰۱۶ھ کو اُس کی تصنیف سے فراغت ہوئی ہے۔ وفات کا حال معلوم نہیں۔

اب یہ وہ طبقہ ہے جو اسی گیارہویں صدی کے اواسط سے تعلق رکھتا ہے۔

احمد بن زین الدین علوی انھوں نے کتاب "لطائف غیبی" فارسی میں تصنیف کی جس میں اُن آیات قرآن کی تفسیر لکھی ہے جو اصول دین سے تعلق ہیں۔ اس موضوع میں غالباً ان کے پہلے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی تھی اور ان کے بعد بھی ہماری نظر سے تو کوئی کتاب ایسی نہیں گذری مشہد مقدس میں اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف شروع ۱۰۳۳ھ میں ہوئی ختم کا حال معلوم نہیں۔

معز الدین اردستانی ابن ظہیر الدین میر میران حسینی حیدرآباد میں مقیم تھے شیخ محمد بن خاتون عاملی کی فرمائش سے سورہ ہل اتی کی تفسیر لکھی اور اس کو سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ حیدرآباد کے نام سے معنون کیا اس کتاب کی تصنیف ۱۰۴۴ھ میں ہوئی۔

نعمت خان عالی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے شہرہ آفاق رکن سلطنت فاضل شخص تھے ایک کتاب تفسیر قرآن تحریر کی زبان فارسی میں۔

آقا رضی الدین محمد قزوینی آپ کے اکثر علوم میں تصانیف ہیں منجملہ اُنکے ایک کتاب تفسیر قرآن میں ہے اس میں ہر آیت کے ذیل میں اکثر علوم سے جو اُس سے تعلق رکھتے ہیں بحث کی گئی ہے۔

شیخ بہاء الدین عاملی مشہور جامع علوم و فنون مجتہد تھے علم تفسیر میں آپنے ایک بسوط کتاب "عروۃ الوثقی" تحریر فرمانا شروع کی تھی جس میں صرف تفسیر سورہ فاتحہ میں ایک جلد پوری تالیف ہو سکی اور بس۔ ایک دوسری تفسیر اس کے علاوہ "عین الحیوۃ" لکھی جس کا انداز پہلے کی بہ نسبت مختصر تھا۔ نیز تفسیر بیضاوی پر ایک حاشیہ لکھا وہ بھی مکمل نہیں ہوا ۱۰۳۱ھ میں رحلت فرمائی۔

میر محمد ہادی حسینی عشقی شوستری، قاضی نور اللہ شہید ثالث کے اعزا میں سے تھے

اُن کی تفسیر مشہور ہے۔ ۱۰۳۸ھ میں رحلت فرمائی ۔

تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی مشہور فاضل ہندی مصنف کشف اللثام کے والد تھے کتاب "بحر مواج" تفسیر میں فارسی زبان میں تحریر کی ۱۰۵۸ھ میں انتقال کیا۔

ملا نظام الدین ساوجی قریشی، شیخ بہائیؒ کے شاگرد تھے۔ ان کی تصنیف سے فارسی زبان میں ایک بڑی تفسیر ہے جس میں مفسرین کے اقوال در محاکمہ اسکے ساتھ بعض اسرار حروف درج ہیں۔

ملا بدیع الزماں، ہرندی اصفہانی شیخ الاسلام تبریز تھے انکی ایک تفسیر فارسی زبان میں ہے جس کے بعض اجزا اصفہان میں موجود ہیں ۱۰۵۹ھ میں وفات پائی ۔

ملا صدرا شیرازی جو سرآمد روزگار حکیم و متکلم فلسفی تھے انھوں نے اپنے مذاق پر ایک مجموعۂ تفسیر تصنیف کیا جس میں ابتدا میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے پھر سورۂ بقرہ اس آیت تک فقلنا لھم کونوا قردۃً خاسئین پھر تفسیر آیۃ الکرسی، تفسیر آیۂ نور، تفسیر سورۂ الم سجدہ، تفسیر سورۂ یٰسٓ، تفسیر سورۂ واقعہ، تفسیر سورۂ جمعہ، تفسیر سورۂ طارق، تفسیر سورۂ اعلیٰ، تفسیر سورۂ زلزال تفسیر آیہ (وتری الجبال تحسبھا جامدۃ) یہ سب کچھ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ صدر المتألہین شیرازی فلسفیات میں انتہائی شغف کی بدولت ظواہر الفاظ اور معانی متعارفہ سے اتنے بعید ہوگئے تھے کہ وہ الفاظ کے سیدھے معانی کے بجائے ہمیشہ حکمت و فلسفہ کے مذاق کے پیچ در پیچ معانی میں چلے جاتے تھے۔ اسلئے الفاظ کے بالکل ظاہری پہلو ان کی نظر سے مخفی رہجاتے تھے اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن کی شرح اصول کافی بھی ارباب فن کے لئے مضحکہ خیز ثابت ہوئی اور تفسیر قرآن بھی مقبولیت کا درجہ حاصل نہ کر سکی ۔

اسی صدی کے اواخر میں ۔

ملا محسن فیض کاشانی نے جیسا کہ امل الآمل میں ہے تین تفسیریں تحریر کیں۔ بڑی -

چھوٹی اور متوسط مگر خود موصوف نے جو اپنے مصنفات کی فہرست مرتب کی ہے اُسمیں دو ہی تفسیروں کا تذکرہ ہے ایک تفسیر صافی جو بہت مشہور و معروف ہے، اس میں انھوں نے احادیث ائمہ معصومین نقل کئے ہیں لیکن جابجا تاویل آیات اپنے مذاق عرفاں و تصوّف کے مطابق ذکر کی ہیں یہ کتاب سنہ ۱۰۷۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ دوسرے تفسیر اصفیٰ یہ ایران میں تفسیر صافی کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔

اسکے علاوہ کتاب تنویر المذاہب جس میں حواشی ہیں۔ اُس تفسیر پر جس کا نام ہے "مواہب"

شیخ فخر الدین طریحی نے کتاب "کشف غوامض القرآن" تصنیف کی اور ایک کتاب "نزہتہ الناظر و سرور الخاطر" جو خاص لغات قرآن مجید کی شرح میں "غریب القرآن" مصنفہ ابو حاتم سجستانی کے انداز پر ہے سنہ ۱۰۸۵ھ میں انتقال کیا۔

شیخ حسین بن شہاب الدین خاندان حسین عاملی کرکی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا سنہ ۱۰۷۶ھ میں وفات پائی۔

سید شرف الدین علی حسینی استر آبادی انکی کتاب "تاویل الآیات الظاہرہ" کا علامہ مجلسی نے بحار الانوار کے تمہیدی مقدمہ میں تذکرہ کیا ہے۔

محمد بن محمد محسن الفیض الکاشانی یہ صاحب تفسیر صافی کے صاجزادے ہیں "علم الہدیٰ" خطاب تھا اُنھوں نے علم تفسیر میں ایک کتاب "ذخیرہ" تحریر کی جس میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

نور الدین محمد، یہ ملا محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی کے بھتیجے تھے۔ انھوں نے کتاب "المبین" تفسیر میں تحریر کی جو بالکل مختصر ہے اور مثل ترجمہ کے سمجھنا چاہیئے۔

ملا محمد طاہر قمی تفسیر کئی جلدوں میں لکھی ہے۔ سنہ ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی۔

سید ہاشم بحرینی علامہ فخر الدین طریحی کے شاگرد اور مشہور کتاب "مدینۃ المعاجز" کے مصنف ہیں علامہ مجلسی کے بعد انکا سا وسیع النظر اس دور آخر میں کوئی نہیں گذرا۔ ان کی کتاب تفسیر "برہان" اپنے رنگ کی مخصوص تفسیر ہے جس میں بہت تتبع کے ساتھ احادیث ائمہ

علیہم السلام کو تفسیر قرآن کے متعلق جمع کیا گیا ہے۔ اس سے مختصر دوسری تفسیر "الہادی وضیاء النادی" تصنیف کی یہ بھی غالباً موجود ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔

شیخ جواد بن سعد اللہ بن جواد بغدادی کاظمی یہ شیخ بہاء الدین عاملی کے شاگرد تھے۔ آیات الاحکام کی تفسیر "مسالک الافہام" تحریر کی جس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ اس موضوع میں سب سے بڑی اور جامع تصنیف ہے۔ **شیخ حسام الدین طریحی**، یہ شیخ حر عاملی کے معاصر تھے ان کی کتاب "تفسیر قرآن" کا تذکرہ امل الآمل میں موجود ہے۔

شیخ حسین بن مطر جزائری یہ بھی شیخ حر عاملی کے معاصر ہیں اور انکی "تفسیر قرآن" کا تذکرہ بھی امل الآمل میں درج ہے۔

شیخ عبد علی بن جمعہ عروسی حویزی شیراز میں قیام رکھتے تھے۔ شیخ حر عاملی کے معاصر ہیں۔ انکی کتاب تفسیر "نور الثقلین" چار جلدوں میں تھی۔ اس میں بھی پابندی کی گئی ہے کہ احادیث ائمہ علیہم السلام کے سوا دوسرے مفسرین کے اقوال ہرگز نقل نہوں۔

شیخ عبد علی بن رحمہ حویزی شیخ بہائی کے شاگرد تھے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔

شیخ عبد القاہر بن حاج عبد بن رجب بن مخلص عبادی حویزی شیخ حر عاملی کے معاصر تھے۔ شیخ جواد کاظمی کی تفسیر آیات الاحکام پر جس کا تذکرہ ہو چکا حواشی تحریر کئے جنکا نام رکھا "سلوک مسالک المرام فی مسلک مسالک الافہام" نیز تفسیر بیضاوی پر بھی حواشی تحریر فرمائے۔

سید علی خان ابن خلف بن مطلب بن حیدر موسوی حویزی یہ حویزہ میں جو خوزستان کے علاقہ میں ہے حاکم تھے اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے تفسیر قرآن چار جلدوں میں تحریر کی جس کا نام ہے "منتخب التفاسیر" اس میں پہلے ان مفسرین کے اقوال نقل کرتے ہیں جن کی تفاسیر انکے پاس موجود تھے جیسے کشاف۔ بیضاوی۔ مجمع البیان۔ عیاشی۔ علی بن ابراہیم

پھر خود تائیدی یا اعتراضی صورت سے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں نیز جو نکات اور اشارات آیت کے خود انکی نظر میں ہیں انھیں ذکر فرماتے ہیں۔ اس کتاب کی ابتدا جمادی الثانی ۱۰۸۶ھ میں ہوئی ہے اور ربیع الاول ۱۰۸۸ھ میں سورۂ رحمٰن کی تفسیر تک پہونچی۔

شیخ فرج اللہ بن محمد بن درویش بن محمد حسین بن حماد بن اکبر حویزی۔ یہ بھی شیخ حر عاملی کے معاصر تھے۔ ایک کتاب لکھی "تذکرۃ العنوان" جو عجیب و غریب صورت رکھتی ہے اس کے بعض الفاظ سیاہی سے ہیں اور بعض دوسرے رنگوں سے جو طول میں بھی پڑھے جاتے ہیں اور عرض میں بھی۔ پوری کتاب دیکھنے میں ایک ہے لیکن اسکے مختلف رنگوں کے الفاظ سے مختلف کتابیں مختلف علوم کی پیدا ہوتی ہیں ایک کتاب نحو میں ایک منطق میں۔ ایک عروض میں۔ ہیئت میں شرح تشریح الافلاک مصنفہ شیخ بہائی اور ایک منظومہ معانی و بیان میں اور ایک تفسیر اور ایک تاریخ اور ایک دیوان اور ایک رسالہ حساب میں اور اسکے علاوہ بعض دوسری چیزیں سب اس کتاب میں داخل ہیں اور واقعہ اس کا یہ تھا کہ کسی نے علمائے اہلسنت میں سے کتاب لکھی تھی "عنوان الشرف" جس میں مذکورہ بالا علوم تھے اور امام شافعی کی فقہ اور ایک تاریخ تھی۔ یہ تذکرہ شیخ فرج اللہ کے سامنے ہوا تو انھوں نے اسکے بعد ہی اس کتاب کو دیکھے بغیر "تذکرۃ العنوان" کتاب تصنیف کی جس میں یہی صنعت مدنظر رکھی ہے۔

بہرحال اس کتاب میں علم تفسیر کا ایک شعبہ مستقل رکھا گیا ہے۔

سید محمد رضا حسینی منشی الممالک ساکن اصفہان۔ شیخ حر عاملی کے معاصر تھے۔ امل الآمل میں ہے کہ انھوں نے کتاب تفسیر القرآن تصنیف کی تیس جلدوں سے زیادہ میں جو عربی اور فارسی پر مشتمل ہیں اور اس میں احادیث کو ترجمہ کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

احمد بن حسن حر عاملی مشہور شیخ حر عاملیؒ کے بھائی تھے۔ شیخ حر نے اپنی کتاب امل الآمل

میں انکا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک کتاب "تفسیر قرآن" میں اُن کی تصنیف ہے۔

محمد حسین بن محمد قمی یہ قاضی سعید قمی کے بھائی اور رجب علی تبریزی فلسفی کے شاگرد تھے اعیان الشیعہ میں ہے کہ اُن کی کتاب تفسیر قرآن میں بڑی مبسوط فارسی زبان میں ہے جو اُن کے تبحر علمی کا پتہ دیتی ہے۔

محمد مومن سبزواری یہ بھی شیخ حر عاملی کے معاصر تھے اور "تفسیر قرآن" کے مصنف۔

امیر محمد مومن بن محمد زماں طالقانی قزوینی اسی زمانہ میں تھے۔ سورہ ملک کی تفسیر لکھی اور اپنے زمانہ کے بادشاہ کے نام سے معنون کی۔

شیخ علی بن شیخ حسین کربلائی اُنکی کتاب "ازوار الہدایہ" مشہد مقدس کے کتبخانہ امام رضاؑ میں موجود ہے اسکی تین فصلیں ہیں پہلی تفسیر آیۂ (و لقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ) دوسری تفسیر آیۂ (واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ) تیسری بیان علوم دینیہ میں۔ کتاب کے خاتمہ میں شیخ بہائی اور ابن خاتون کے بعض اقوال نقل کیے ہیں اسکے قلمی نسخہ کی جو کتبخانہ میں موجود ہے تاریخ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ ہے۔

میرزا محمد رضا قمی ان کے تصانیف سے کتاب "کنز الدقائق" ہے جو تفسیر قرآن میں ہے روضات الجنات میں خیال قائم کیا ہے کہ غالباً یہ ملا محسن کاشانی کے شاگردوں میں سے تھے۔ علامہ سید محسن عاملی نے اُن کا تذکرہ اس نام سے کیا ہے کہ "میرزا محمد مشہدی ابن محمد رضا القمی" اور لکھا ہے کہ اُنکی تصنیف ہے کنز الدقائق و بحر الغرائب تفسیر قرآن میں اور قولِ نبیا میں لکھا ہے (المائۃ الثانیۃ عشر) یعنی وہ بارہویں صدی میں تھے۔

اب بارہویں صدی کا ابتدائی دور ہے۔

سید نعمت اللہ جزائری مشہور محدث اور علامہ مجلسیؒ کے شاگرد تھے آپ کی

ایک تفسیر "العقود والمرجان" بہت مختصر تھی جو قرآن مجید کے حواشی پر اکثر تحریر کی جاتی رہی ہے۔

امیر محمد صالح خاتون آبادی علامہ مجلسی کے داماد تھے ایک رسالہ تفسیر سورہ حمد و تفسیر سورہ قل ہو اللہ میں تحریر کیا ۱۱۱۶ھ میں انتقال کیا۔

امیر محمد اسمٰعیل خاتون آبادی ایک بڑی تفسیر تحریر فرمائی جو ۴۴ جلدوں میں تھی۔ انھوں نے بھی ۱۱۱۶ھ میں وفات پائی۔

امیر ابراہیم بن محمد معصوم قزوینی تفسیر آیات الاحکام مصنفہ ملا احمد اردبیلی کی شرح لکھی جس کا نام رکھا "تحصیل الاطمینان فی شرح زبدۃ البیان" اس کا کچھ حصہ آپنے اپنے استاد آقا جمال خوانساری کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بہت پسند کیا اور گرانقدر الفاظ میں پشت کتاب پر تقریظ تحریر فرمائی جس کی تاریخ ۱۱۱۷ھ تھی۔

شیخ سلیمان بن عبد اللہ ماحوزی بحرینی، انکی کتاب تفسیر میں علامہ سید ہاشم بحرینی کی تفسیر برہان کے طرز پر ہے ۱۱۲۱ھ میں انتقال کیا۔

محمد بن عبد الفتاح سراب تنکابنی علامہ مجلسی کے شاگردوں میں سے ہیں کتاب تفسیر آیات الاحکام اردبیلی کے اوپر حواشی تحریر کئے ۱۱۲۴ھ میں انتقال کیا۔

شیخ عبد اللہ بن نور اللہ البحرانی مصنف تکمل عوالم، علامہ مجلسی کے شاگرد تھے اور ایک کتاب تفسیر میں بھی لکھی ہے۔

ملا عبد اللہ مجلسی یہ علامہ مجلسی کے بھائی تھے تفسیر کے مصنف ہیں۔

میرزا عبد اللہ آفندی مصنف ریاض العلماء ان کی ایک کتاب تفسیر میں تھی جو وسط قرآن کے حدود تک پہونچی تھی اسکے بعض اجزاء اصفہان اور شیراز میں موجود ہیں ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی۔

سید نورالدین بن سید نعمت اللہ جزائری کی کتاب تفسیر میں لکھی جو مکمل نہیں ہوئی۔

سید عبداللہ بن سید نورالدین شوستری بڑے جامع علوم و فنون بزرگ تھے۔ ایک کتاب تفسیر میں بھی لکھی ہے۔

سید بہاء الدین محمد بن محمد باقر حسینی مختاری نائینی ان کی تفسیر تقریباً پانچ جلدوں میں ہے سنہ ۱۱۳۰ھ میں وفات ہوئی۔

فاضل ہندی بہاء الدین محمد بن تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی انھوں نے ایک مبسوط کتاب تفسیر قرآن میں تحریر کی سنہ ۱۱۳۷ھ میں انتقال فرمایا۔

سید محمد حیدر موسوی عاملی مکی آپ نے تفسیر آیات الاحکام تحریر کی جسے بادشاہ وقت سلطان حسین صفوی کے نام پر معنون کیا۔ اور آپ نے عجیب و غریب طریقہ یہ اختیار کیا کہ آپ نے آیات احکام فقہیہ کے ساتھ اُن آیتوں کو بھی داخل کر لیا ہے جن سے کوئی اصولی مسئلہ علم کلام کا یا اصول فقہ کا یا عقلی و نقلی مسائل ہیں کا مستفاد ہوتا ہے اور پھر اس میں نقض و ابرام اور احتجاج و استدلال بہت تفصیل کے ساتھ ہے۔ ایک رسالہ مستقل سورہ یوسف کی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ (اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم) سنہ ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی۔

یہ اس صدی کا وسطی دور ہے۔

ملا ابو الحسن شریف فتونی عاملی۔ صاحب جواہر کے نانا بڑے بلند مرتبہ عالم تھے۔ ایک تفسیر "مرآۃ الانوار" سورہ بقرہ کے وسطی حصہ تک تحریر کی جو کثیر الفوائد ہے۔ فاضل نوری مصنف مستدرک الوسائل کا بیان ہے کہ عجیب و غریب واقعہ یہ ہے کہ اس تفسیر "مرآۃ الانوار" کے تمہیدی مقدمات جو خود ایک مستقل جلد میں ہیں اور اصل مصنف کے قلم کے لکھے ہوئے صاحب جواہر کے کتبخانہ میں موجود ہیں میں نے انھیں عاریت لیا اور بہت زحمت اور مشقت

کیا تھا انھیں نقل کیا یہ نسخہ کتاب کا طہران کے ایک سفر میں میرے ساتھ تھا اس کو مجھ سے بعض ارکان سلطنت نے لے لیا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ تفسیر "برہان" مصنفہ سید ہاشم بحرینی کو طبع کرائیں مگر چونکہ اُس میں صرف نقل احادیث پر اکتفا کی ہے اور بیان و تشریح نہیں ہے اس لئے خیال کیا کہ اس کتاب کو بطور ضمیمہ شایع کر دیا جائے۔

اس طرح اس کتاب کی نقل اُنھوں نے بھی حاصل کر لی۔ میں عراق واپس ہوا اور اتفاق کی بات کہ وہ شخص جو اس طبع کے بانی تھے اُن کا انتقال ہو گیا۔ کتاب کے مطبوعہ حصہ اور تفسیر "مرآۃ الانوار" کے اُس قلمی نسخہ کو بعض ارباب مطبع نے خرید کیا اور اُن ناقص اجزا کو تمام کر کے مکمل تفسیر کو طبع کیا اور "مرآۃ الانوار" کو ایک علیحدہ جلد میں چھپوایا۔ یہ مطبوعہ نسخہ جب میری نظر سے نجف اشرف میں گذرا تو میں نے اُس کے سرنامہ پر حسب ذیل عبارت لکھے ہوئے دیکھی۔

"کتاب مرآۃ الانوار ومشکوۃ الاسرار وھو مصباح الانظار الابرار ومقدمۃ للتفسیر الذی صنفہ الشیخ الاجل والنحریر الانبل العالم العلامۃ والفاضل الفہامۃ الشیخ عبداللطیف الکازرانی مولدا والنجفی مسکنا"

اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب مرآۃ الانوار تصانیف سے شیخ عبداللطیف کے ہے جو کازران میں متولد ہوئے تھے اور نجف میں قیام کیا۔

یہ دیکھا تھا کہ میں ششدر ہو گیا۔ میں نے صاحب مطبع کو اطلاع دی کہ یہ تفسیر ملا ابوالحسن شریف کی ہے۔ اور شیخ عبداللطیف کا تو کوئی نام ہی کبھی میں نے نہیں سنا ہے۔ غالباً جاہل کاتب اور مہتمم مطبع نے یہ عبداللطیف کے نام کا استنباط دیباچہ کے ان الفاظ سے کیا ہے۔ جو خطبہ کے بعد ہیں (یقول العبد الضعیف الراجی لطف ربہ اللطیف خادم کلام اللہ الشریف) اس سے یہ خیال کیا کہ انھوں نے اپنے نام کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے لیکن کازران کی طرف نسبت کی

بنیاد ابتک سمجھ میں نہیں آئی۔

صاحب مطبع نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کا تدارک کر دینگے مگر افسوس ہے کہ ابتک یہ وعدہ وفا نہیں ہوا اور کتاب اسی صورت سے شایع ہے۔ لہذا میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ تفسیر جو ۱۲۹۵ھ میں طہران میں طبع ہوئی ہے جس کے سرورق پر مذکورہ بالا عبارت ہے۔

یہ ملا ابو الحسن شریف کی ہے جن کو صاحب جواہر "جدی العلامۃ" کی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں عبد اللطیف کازرانی کی نہیں ہے جن کی غالباً ولادت بھی ابتک نہیں ہوئی ہے۔"

ملا ابو الحسن شریف کی وفات ۱۱۴۰ھ کے حدود میں ہوئی۔

شیخ احمد بن اسمٰعیل جزائری انھوں نے کتاب تفسیر "آیات الاحکام" تصنیف کی جو ایران میں طبع ہو چکی ہے اس میں انھوں نے احادیث کی پابندی کی ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی کتاب تفسیر میں لکھ رہے تھے جو مکمل نہیں ہوئی۔ ۱۱۵۰ھ میں انتقال کیا۔

ملا محمد اسمٰعیل مازندرانی خاجوئی "زبدۃ البیان" یعنی تفسیر آیات احکام مصنفہ محقق اردبیلیؒ پر حواشی تحریر کئے۔ انکا انتقال ۱۱۷۳ھ میں ہوا۔

شیخ محمد رضا بن محمد امین ہمدانی انکی تصنیف ہے "الدر النظیم فی تفسیر القرآن الکریم" جس کا تذکرہ علامہ سید محسن عاملی کی کتاب اعیان الشیعہ میں مندرج ہے۔

سلطان محمد بن حیدر بن محمد جنابذی ان کی تفسیر بیان السعادۃ چھپ چکی ہے۔

شیخ علی حزیں مشہور عالم اور شاعر ہیں انکے کثیر التعداد تصانیف میں سے تفسیر بھی ہے۔ ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

سلیمان جرجی غالباً اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی ہے جس میں ملا محسن کاشانی اور علامہ مجلسیؒ کے حوالے دیئے ہیں اس لئے باعتبار زمانہ مجلسی سے متاخر ضرور ہیں۔

تیرھویں صدی کا ابتدائی دور وہ ہے جب ہندوستان میں صوبۂ اودھ کے شہر لکھنؤ کا آفتاب کمال افق پہ طلوع ہو گیا تھا یعنی جناب غفرانمآب طاب ثراہ کے فیوض علمیہ پھیل رہے تھے جو آپ کے مصنفات میں تفسیر قرآن تو مستقل طور سے موجود نہیں ہے لیکن آپ کے تلامذہ میں سے مولوی یاد علی صاحب نصیر آبادی جو آپ کے قریبی اعزا میں سے تھے انھوں نے فارسی میں تفسیر تحریر کی جو دو جلدوں میں ہے۔ اسی زمانے میں میرزا محمد اخباری نیشاپوری تھے انکے تصانیف سے بھی ایک تفسیر ہے یہ سنہ ۱۲۳۲ھ میں قتل ہوئے۔

حاج میرزا یوسف طباطبائی تبریزی، آغا باقر بہبہانی وغیرہ کے شاگرد تھے ایک بڑی تفسیر کے مصنف ہیں سنہ ۱۲۴۲ھ میں انتقال فرمایا۔

جناب مولانا سید علی صاحب نے جو جناب غفرانمآب کے منجھلے صاحبزادے تھے تفسیر "توضیح مجید" اردو زبان میں تحریر فرمائی جس میں ادبی و دقیق نکات درج کیے ہیں اور عوام کی خاطر سے ہے اسلئے دقیق و غامض معانی درج نہیں ہیں آپ نے سنہ ۱۲۵۹ھ میں کربلائے معلی میں انتقال کیا۔

مفتی محمد قلی صاحب نیشاپوری کنتوری یہ بھی جناب غفرانمآب کے ممتاز شاگرد تھے۔ انھوں نے کتاب "تقریب الافہام" تفسیر آیات الاحکام میں تحریر فرمائی سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔

سید عبداللہ شبر کاظمی بڑے کثیر التصانیف مجتہد تھے۔ آپ نے ایک کتاب "صفوۃ التفاسیر" تحریر فرمائی جو بتیس ہزار بیت پر مشتمل تھی (بیت پچاس حرفوں کی ہوتی ہے) دوسری کتاب "جوہر ثمین فی تفسیر القرآن المبین" ۴۳ ہزار بیت۔ ایک تیسری کتاب تفسیر میں ۱۸ ہزار بیت سنہ ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی۔

حاج میرزا لطف علی بن میرزا احمد تبریزی۔ انھوں نے ایک مبسوط تفسیر لکھی ہے دو جلدوں میں جو قرآن مجید کے وسطی حصہ سے آخری تہائی کے قریب تک ہے۔ اور اسمیں علم کلام کے مسائل میں اکثر بہت تفصیل سے کام لیا ہے سنہ ۱۲۶۲ھ میں رحلت ہوئی۔

آخوند ملا مہر علی تبریزی خوئی تخلص بفدوی ان کی تفسیر تصوف و عرفان کے مسالک پر ہے ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔

حاج ملا عبدالوہاب قزوینی ان کے مصنفات میں تفسیر بھی ہے ۱۲۶۱ھ میں وفات ہوئی۔

جناب علیین مکان سید العلماء السید حسین اعلی اللہ مقامہ۔ جناب غفرانمآب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے آپکی تصنیفات سے حسب ذیل کتابیں ہیں۔ امالی فی التفسیر و المواعظ تفسیر سورہ فاتحہ تفسیر سورہ قل ہو اللہ تفسیر سورہ دہر تفسیر قولہ تعالی کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تفسیر آیات ابتدائی سورہ بقرہ ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔

آپکے بعد آپکے صاحبزادے جناب جنت مآب ممتاز العلماء السید محمد تقی طاب ثراہ نے شہرہ روزگار تفسیر "ینابیع الانوار" تصنیف فرمائی۔ اتنی مبسوط تفسیر موجودہ شیعی کتب تفسیر میں نایاب ہے ہر پارہ کی تفسیر ایک جلد میں ہے۔ اگر یہ پایہ تکمیل کو پہونچ جاتی تو تیس جلدوں میں ہوتی لیکن صرف تین جلدیں اسکی لکھی گئیں جو سورہ آل عمران تک پہونچی ہیں۔ اس میں احادیث بہت جستجو سے لکھے گئے ہیں اور ان آیات میں جو اختلافی حیثیت رکھتے ہیں امام فخر الدین رازی اور دوسرے مفسرین کے اقوال سے مکمل بحث کی گئی ہے۔

یہ تفسیر آپکے انتقال کے بعد جب علامہ کنتوری مولانا سید غلام حسنین صاحب اعلی اللہ مقامہ نے مدرسہ ایمانیہ قائم کیا ہے اور لکھنؤ سے اخبار جاری کیا ہے تو چھپنا بھی شروع ہوئی تھی جس کے بعض اوراق چھپے ہوئے ہم نے دیکھے ہیں مگر نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ پھر طباعت ملتوی ہو گئی وفات ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔

آقا محمد حسین باشندہ طالقانی ان کے تصانیف سے ایک بڑی تفسیر ہے ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی۔

اسی عصر میں مولانا سید رجب علیخاں جگراؤں (پنجاب) کے ذی علم رئیس تھے انھوں نے "کشف الغطاء فی تفسیر سورہ ہل اتی" اور "السر الاکبر فی تفسیر سورۃ الفجر" تصنیف کی موصوف کا انتقال ۱۲۹۶ھ میں ہوا۔

ملا علی قاریوز آبادی قزوینی مقیم زنجان بزرگ مرتبہ عالم تھے آپکے مصنفات میں سے ایک کتاب تفسیر قرآن ہے جو سورہ یسین سے آخر قرآن تک ہے ۱۰ محرم ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔

حاج محمد نجف کرمانی نسابہ۔ ایک کتاب تفسیر میں لکھی ہے ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا۔

اسی زمانہ میں حاج ملا محمد صالح برغانی مشہور شہید رابع ملا محمد تقی برغانی صاحب مجالس المتقین کے بھائی قزوین کے مستند عالم تھے انھوں نے تفسیر قرآن سات جلدوں میں تحریر فرمائی۔

محمد بن سلیمان تنکابنی مصنف قصص العلماء نے چند آیات قرآنی کی تفسیر آٹھ ہزار بیت میں لکھی۔

ملا حسن علی تویسرکانی ایک کتاب تفسیر میں لکھی ہے ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی۔

ملا محمد تقی ہروی حائری صاحب جواہر اور شیخ مرتضیٰ انصاری کے شاگرد تھے علم تفسیر میں حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں خلاصۃ البیان فی تفسیر مشکلات القرآن۔ خلاصۂ تفسیر آیۃ الکرسی مصنفہ سید کاظم رشتی تفسیر آیۂ مبارکہ فکان قاب قوسین او ادنیٰ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔

سید مہدی قزوینی بڑے بلند مرتبہ جلیل القدر عالم۔ صاحب جواہر وغیرہ کے شاگرد تھے۔ ان کے مصنفات میں حسب ذیل کتابیں ہیں تفسیر سورہ حمد۔ تفسیر سورہ قل ہو اللہ تفسیر سورہ انا انزلناہ کتاب آیات الاصول جس میں آپنے اصول فقہ کے تمام مباحث میں آیات قرآن سے استدلال کیا ہے ۱۳۰۰ھ میں سفر حج سے واپسی میں وفات پائی۔

حاج ملا رضا ہمدانی مصنف مفتاح النبوۃ آن کی کتاب الدر النظیم فی تفسیر القرآن العظیم" طبع ہو چکی ہے۔

ملا سلطان گونابادی مشہور صوفی شخص تھے جن کے نام سے ایک فرقہ ایران میں موجود ہے۔ ان کی ایک بڑی تفسیر عربی زبان میں چھپی ہوئی موجود ہے جو انہی کے خیالات کے مطابق ہے۔

فردوس مکان سید العلماء حجۃ الاسلام مولانا سید محمد ابراہیم طاب ثراہ ہمارے جد امجد نے اپنے والد ماجد جناب جنت مآب کی تفسیر ینابیع کا تکملہ دو جلدوں میں تحریر فرمایا۔ نیز سورۂ تفسیر سورۂ یوسف مستقل طور سے تحریر کی۔ آپ کی وفات ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔

شیخ محمود مشتمی عراقی۔ ایک کتاب تفسیر میں تحریر کی ۱۳۰۸ھ میں رحلت ہوئی۔

تاج العلماء مولانا السید علی محمد طاب ثراہ۔ آپ کی کثیر التعداد تصانیف میں سے جن کی تعداد دو سو کے قریب ہے حسب ذیل کتابیں مخصوص علم تفسیر سے متعلق ہیں۔

احسن القصص تفسیر سورۂ یوسف جو مطبوع اور شائع ہے اور معلومات کا ذخیرہ ہے۔

انوار الانظار در تفسیر سورۂ نور۔ حواشی قرآن جو سر سید احمد خاں کی طبعزاد تفسیر قرآن کی ردمیں ہیں ۱۳۱۲ھ میں انتقال کیا۔

مولوی عمار علی صاحب سونی پتی مرحوم جناب جنت مآب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اردو میں تفسیر "عمدۃ البیان" تین جلدوں میں تحریر کی جو طبع ہو چکی ہے۔

اب یہ ہماری چودھویں صدی ہے۔

شیخ محمد حسین اصفہانی نجفی یہ مشہور محقق شیخ محمد تقی مصنف ہدایۃ المسترشدین کے پوتے اور حاج شیخ محمد باقر اصفہانی کے بیٹے تھے۔ ایک کتاب تفسیر میں لکھنا شروع کی جو اواسط سورۂ بقرہ تک پہونچی اور اتنا ہی حصہ ایک جلد میں طبع کر دیا گیا جو موجود ہے آپ نے ۱۳۰۸ھ میں انتقال کیا۔

حاج میرزا محمد علی قراچہ داغی ایک بڑی تفسیر لکھی۔ ۱۳۱۰ھ میں دنیا سے رحلت کی۔

محقق شہرستانی حاج میرزا محمد حسین حائری بڑے جامع علوم و فنون علامہ

روزگار کثیر التصانیف بزرگ تھے منجملہ تصانیف کے ایک بڑی تفسیر بھی ہے۔ ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا۔

شیخ حسن شترودی تبریزی۔ ان کی تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ۱۳۱۱ھ میں رحلت فرمائی۔

مولانا ابوالقاسم قمی لاہوری پنجاب کے جلیل المرتبت عالم تھے۔ لکھنؤ میں جناب سلطان العلماء اور جناب جنت مآب سے تحصیل علم کی پھر عراق گئے اور آخر میں لاہور میں قیام فرمایا۔ آپ نے تفسیر لوامع التنزیل فارسی میں تحریر فرمائی جس میں یہی پابندی ہے کہ ایک پارہ کی تفسیر ایک جلد میں شاید تیرہ پاروں کی تفسیر آپ نے تحریر فرمائی اور بعض مجلدات اُس کے آپ کے بعد آپ کے خلف الصدق

شمس العلماء مولانا سید علی صاحب حائری دام ظلہ نے جو اس وقت پنجاب میں مرجعیت رکھتے ہیں تصنیف فرمائے علامہ ابوالقاسمؒ نے ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا۔

ملا حسین سجاسی مقیم زنجان آپ کے تصانیف سے حسب ذیل کتابیں ہیں تفسیر سورہ رحمٰن تفسیر سورہ زمر تفسیر سورہ شمس جو طہران میں ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوئی ہے۔

مولانا سید محمد محسن زنگی پوری مولانا سید محمد علی قائمۃ الدین کے شاگرد تھے اور اُس زمانہ میں جب انتزاع سلطنت کے بعد سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم کلکتہ میں تھے تو آپ وہاں قیام فرما تھے۔ کتاب تفسیر سورہ رحمٰن اور ازہار التنزیل تصنیف فرمائی۔ ۱۳۲۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا سید احمد حسین صاحب امروہوی جناب مفتی صاحب قبلہ کے شاگرد تھے آپ کی تصنیف "معارج العرفان فی علوم القرآن" فارسی میں طبع ہو چکی ہے ۱۳۲۸ھ

میں انتقال فرمایا۔

شیخ مرتضٰی نظام الدین حلی کاظمینی - ان کی کتاب تفسیر قرآن میں ناتمام ہے ۱۳۳۶ھ میں وفات پائی۔

آقا فتح علی زنجانی، نجف اشرف سے ہجرت کرکے کوفہ چلے گئے تھے اور خلق خدا سے الگ زندگی بسر کرتے تھے اس دوران میں ایک تفسیر لکھنا شروع کی جس کی دو جلدیں مکمل ہوئیں ۱۳۳۹ھ میں عالم آخرت کی طرف رہسپار ہوئے۔

سید علی طباطبائی یزدی حائری ان کی ایک کتاب تفسیر میں بڑی بسوط ہے اور ایک کتاب ہے رق منشور در تفسیر آیۂ نور۔

مولانا سید اعجاز حسین صاحب امروہوی جناب مفتی صاحب کے شاگرد تھے۔ اور مولانا سید احمد حسین صاحب سے بھی تلمذ رکھتے تھے۔ ایک کتاب تفسیر آیات میں تحریر فرمائی ۱۳۴۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری مرحوم نے منجملہ کثیر التعداد تصانیف کے توحید القرآن - امامۃ القرآن - علوم القرآن - اردو زبان میں تصنیف کی ہیں اور جب مدرسۃ الواعظین قائم ہوا تو موصوف تصنیف و تالیف کے کام پر اس مدرسہ کی جانب سے مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں آپنے عربی زبان میں ایک کتاب "خلاصۃ التفاسیر" تحریر فرمانا شروع کی جس کی ایک قلمی جلد مدرسۃ الواعظین کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۳۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

آخوند ملا حبیب اللہ کاشانی، آپکے تصانیف سے ہے تفسیر سورۂ بقرہ تفسیر سورۂ قدر تفسیر آیۂ نور، تفسیر سورۂ اخلاص - درۃ الدر فی تفسیر سورۃ الکوثر اور ایک کتاب تفسیر

قرآن فارسی۔ سنہ ۱۳۴۱ھ میں وفات پائی۔

انکے بھائی آخوند ملا محمد تقی کاشانی سادجی نے بھی ایک کتاب تفسیر میں بڑی بھاری کئی جلدوں میں لکھی ہے۔

سید عبد الحسین حسینی آل کونہ نجفی انھوں نے دو جلدوں میں ایک تفسیر نہایت اختصار کے ساتھ لکھی ہے اور ہر آیت کے ذیل میں متعلقہ روایات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

شیخ محمد حسین بن محمد خلیل شیرازی تفسیر میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ انکے مصنفات اس سلسلہ میں حسب ذیل ہیں تفسیر سورہ یٰسٓ تفسیر سورہ نبا تا آخر قرآن تفسیر سورہ مریم تفسیر سورہ حمد تفسیر سورہ کوثر۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی۔ حاشیہ کشاف وغیرہ۔

آقا سید ابو تراب خوانساری نجف اشرف کے بڑے بلند پایہ مجتہد تھے آپنے "البیان فی تفسیر بعض سور القرآن" اور "لب الالباب فی تفسیر احکام الکتاب" تصنیف فرمائی۔ سنہ ۱۳۴۶ھ میں جبکہ ہم نجف اشرف ہی میں تھے آپنے انتقال فرمایا۔

سید محمد رضا حسینی کاشانی نیشت مشہدی۔ ایک بڑی تفسیر کے مصنف ہیں سنہ ۱۳۴۷ھ میں انتقال فرمایا۔

آقا حسین نجم آبادی طہرانی۔ اکابر علمائے ایران میں سے تھے ہمارے زمانہ قیام نجف میں ان کے انتقال کی خبر آئی تھی ان کے تصانیف سے تفسیر قرآن بھی ہے سنہ ۱۳۴۷ھ میں ۱۶ رجب کو وفات پائی۔

شیخ علی اصغر بیرجندی ایران کے ممتاز عالم تھے لیکن کچھ تصوف کا مذاق غالب تھا! آپنے ایک تفسیر لکھی جس میں بعض مقامات پر محیی الدین ابن العربی کی موافقت کی ہے۔ ایک کتاب "التفسیر بالماثور" سید ہاشم بحرینی کی تفسیر برہان کے انداز پر تحریر کی۔

یہ دو جلدوں میں تھی لیکن پھر بھی تفسیر برہان کی بہ نسبت مختصر ہے۔

اسی دور آخر میں عراق کے بلند پایہ مجاہد متکلم مناظر

آقا شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ جن کی عمر خدمت مذہب اور نصرت دین میں گذری اپنی آخر عمر میں تفسیر قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوئے مگر افسوس ہے کہ سورہ نساء تک پہونچنے پائے تھے کہ انتقال کیا۔ اس تفسیر کا نام "آلاء الرحمٰن" ہے اور صیدا۔ سوریا کے مطبع العرفان میں اس کی پہلی جلد شایع ہوئی ہے۔ اپنے رنگ میں یہ تفسیر بہت خوب ہے، افسوس ہے کہ پایۂ اتمام کو نہ پہونچنے پائی۔ موصوف نے ۱۳۵۲ھ میں انتقال کیا۔

آقا شیخ محمد باقر بیرجندی طاب ثراہ۔ ہمارے شیخ الحدیث تھے آپ کے مصنفات سے تفسیر آیات الاحکام" ہے ۱۳۵۳ھ کے حدود میں وفات پائی۔

موجودہ دور میں ان حضرات میں سے کہ جو ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔

آقا میرزا ہادی خراسانی دام ظلہٗ کربلائے معلّٰی کے متبحر عالم ہیں آپ نے تفسیر علی بن ابراہیم قمی پر حواشی تحریر کئے ہیں جن میں جستجو کے ساتھ اہلسنت کے روایات کو بطور تائید درج فرمایا ہے۔

مولانا سید راحت حسین صاحب قبلہ گوپالپوری دام ظلہٗ بزرگ مرتبہ عالم، ہمارے والد ماجد، اعلی اللہ مقامہٗ کے بڑے یکجہت دوست، شریک درس اور ہم مباحثہ ہیں۔ آپ کتاب "انوار القرآن" کی تصنیف میں مشغول ہیں جس کے بہت سے اجزاء مطبع اصلاح کھجوہ ضلع سارن سے شایع ہوئے ہیں اردو زبان میں یہ تفسیر مکمل ہونے پر بڑے مبسوط ذخیرہ کا اضافہ کرے گی۔

شیخ محمد نہاوندی، علمائے خراسان میں سے سربرآوردہ فرد ہیں اور تفسیر قرآن

کی تحریر میں مصروف ہیں۔

شیخ محمد اشکوری نجفی:۔ ہمارے ہمعصر ہیں تفسیر سورۂ حمد اور تفسیر سورۂ نور کے مصنف ہیں۔

فرقۂ شیعہ کو ہر دور میں جن سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے اُن کو دیکھتے ہوئے اس فرقہ کے علماء اور ارکان مذہب کے مذکورہ بالا خدمات اتنے اہم اور گرانقدر ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ساتوں آسمان وزن نہیں رکھتے۔

لیکن پھر بھی جیسی تفسیر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے وہ صرف فرقۂ شیعہ کے تصانیف میں نہیں بلکہ مجموعۂ عالم اسلامی میں بھی موجود نہیں ہے۔

خدا اپنی توفیق جس کسی کے شامل حال کرے وہ اس فرض کو انجام دے۔ والسلام۔

علی نقی النقوی عفی عنہ

۲۳/ شعبان سنہ ۱۳۵۴ھ
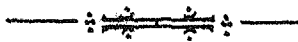
ضمیمہ

قرآن مشکل ہے یا آسان

ہماری کتاب کے نویں تبصرہ میں اس قسم کے بیانات موجود ہیں جو اس بحث کا تصفیہ کر دیتے ہیں پھر بھی چونکہ اس سلسلہ میں مزید بحث کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اس لئے ذیل میں اس تنقیح پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

"قرآن آسان ہے" اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہر شخص ترجمہ پڑھ کر قرآن سے مطلب نکال لے یہ اس کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرے اور اہل علم کی تشریح کا پابند ہو۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(پہلی دلیل) قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں مگر اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کے معنی اور مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں اور اس کی ذمہ داری علمائے مذہب پر ہے جنھوں نے عام لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانسے رکھنے کے لئے عجیب و غریب معنی اور تفسیریں لکھنا شروع کیں۔ عجیب و غریب مسئلے گڑھے۔ ان مسئلوں کو قرآنی آیات سے مطابق کرنے کی کوشش میں قرآنی آیتوں کے وہ معنی پہنائے گئے جو کہ کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے لہذا یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے معنی اور مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس طرح سے اس گروہ نے مسلمانوں کو قرآن مجید سے دور رکھا حالانکہ اگر اس کے معنی عوام نہیں سمجھ سکتے تھے تو لوگ

اسلام کیسے لائے تھے۔ یاد رہے کہ رسول کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ ہر فرقہ اپنے اصولوں کی پیچ میں یا بادشاہت کی لاگ میں قرآن کے آیات کو اپنے منفید مطلب معنی پہنانے لگا اور کچھ دن بعد وہ اُس کا ایمان ہو گیا۔

(دوسری دلیل) کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور آسان زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے اگر نہ سمجھ سکے تو لکھنے والا قصوروار ہے کہ پڑھنے والا۔ لہذا کسی کتاب کا مشکل زبان میں ہونا اُس کا عیب ہے نہ کہ خوبی۔ قرآن بلیغ ہے اور بلیغ وہی کلام ہے جس سے کہنے والے کا مقصد سننے والے کے دماغ میں صحیح طور سے پہونچے۔

(تیسری دلیل) ہم خود قرآن سے پوچھیں کہ وہ اس معاملہ میں کیا کہتا ہے؟ قرآن میں ہے کہ ہم قرآن کو ایسی کھلی اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں جس کو تم سمجھ سکو۔ اگر اس کو ایسی زبان میں نازل کیا جاتا جس کو تم نہ سمجھ سکتے تو کوئی ایمان نہ لاتا۔ عربی کے معنی خود صاف اور کھلی ہوئی زبان کے ہیں۔

الٓر کتاب احکمت ایاتہ ثم فصّلت من لدن حکیم خبیر۔ ولقد جئناھم بکتاب فصّلناہ علی علم ھدی ورحمۃ لقوم یومنون۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے کتاب بھیجی ہے وہ حکیم بھی ہے۔ واقفکار بھی۔ اس نے ہر طرح سمجھ بوجھ کر کتاب کو تفصیل وار بیان کر دیا ہے۔

(۱) حٰمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم کتاب فصلت ایاتہ قرآناً عربیاً لقوم یعلمون بشیراً ونذیراً فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون۔

(۲) ولو جعلناہ قرآناً اعجمیاً لقالوا لولا فصّلت ایاتہ ءاعجمیّ وعربی۔

ان آیتوں سے دو باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔

(۱) قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں ہے جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے۔

(۲) ایمان نہ لانے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ لوگ سمجھتے نہ تھے بلکہ منہ پھیر کر چل دیتے تھے اور سنتے ہی نہ تھے یعنی صحیح طور سے متوجہ نہیں ہوتے تھے۔

ولقد یسّرنا القرآن للذّکر فھل من مدّکر "ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔ تو ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے"

اس ایک آیت کو ایک سورہ کے اندر چار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ کیا اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن آسان ہے۔

(چوتھی دلیل) ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔

قرآن کے لفظی معنی لیکچر کے ہیں قرآن میں ۱۱۴ سورے ہیں ہر سورہ بجائے خود ایک لیکچر ہے ایسا بھی ہوا ہے کہ ان لیکچروں کے درمیان میں لوگوں نے سوال کر دیئے ہیں۔ ان کا جواب دیکر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے موضوع قرآن حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک خدا کی عبادت کرو (توحید)

(۲) ایک ایسے دن پر ایمان لاؤ جس دن لینے کیے دھرے کا جواب دینا ہوگا یعنی قیامت)

(۳) ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے اور لڑائی کے وقت کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے اور لڑائی کیسے لڑنی چاہیئے یعنی معاشرتی و جنگی احکامات وغیرہ)

(۴) ذیل کے اعتراضات اور انکے جوابات۔ ان میں کے دو اعتراض محمدؐ پر ہیں اور دو قرآن پر

الف۔ رسولؐ خدا پر دو اعتراض۔

(۱) چونکہ محمدؐ ایسے انسان ہیں جیسے اور انسان ہوا کرتے ہیں لہذا محمدؐ رسول نہیں ہو سکتے۔

(۲) چونکہ محمدؐ معجزہ نہیں دکھاتے ہیں لہذا رسول نہیں ہو سکتے۔

ب۔ قرآن پر دو اعتراض۔

(۱) قرآن نازل وازل کچھ نہیں ہوا۔ محمدؐ کی من گھڑت ہے۔

(۲) پہلے خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں موجود ہیں لہذا اب ایک اور کتاب نازل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

(۵) پرانے رسولوں کے قصے۔

ان لیکچروں کا مضمون بہت چھوٹا سا ہے۔ ان مضمونوں کو ہر لیکچر میں دہرایا گیا ہے۔ کہیں لوگوں نے سوالات بھی کئے ہیں۔ خاص معاملات بھی آپڑے ہیں سوالات کے جوابات اور معاملوں کے متعلق حکم بھی دیدیے گئے ہیں۔

اوپر بیان کئے ہوئے موضوع قرآن کو مدنظر رکھکر قرآن کو پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ قرآن سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ قرآن میں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ کسی طرح سے تو بات لوگوں کے دماغوں میں سمائے۔ اگر ایک لفظوں میں بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوسرے لفظوں میں بیان کیا گیا۔ اگر ایک طریقے سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا۔ اگر اصول سمجھ میں نہ آیا تو مثال دی گئی۔ ان اصولوں کو قصوں کی شکل میں بیان کیا گیا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم دونوں کے لئے ہے۔

دوسرا اصول قرآن کو بلکہ ہر کتاب کو سمجھنے کا اس کے معنوں پر غور کرنا ہے۔

ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا۔

تیسری بات ۔ مترجم قرآن میں بریکٹ (   ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ

ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے۔ قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔

چوتھی بات۔ اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں۔

پانچویں بات۔ آیتوں کے شان نزول کے جھگڑے بھی عام طور سے بے کار ہیں کیونکہ ہر فرقہ نے شان نزول اپنے مطلب کے موافق گڑھ رکھی ہے۔ آیت میں اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ اصول جب کبھی ایسا واقعہ ہو گا اس پر چسپاں ہوں گے۔

یہ بات بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ بے جوڑ آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں۔ عام طور سے سورے نازل ہوتے تھے۔

اس کے ذیل میں قرآن کے موضوع کے متعلق حوالے پیش کئے گئے ہیں بہت سی آیات قرآن کے تراجم کے۔

یہ تھیں وہ اصولی باتیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن بالکل آسان چیز ہے۔ اور اس کے لئے تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر کیا یہ نتیجہ درست ہے؟ اس کے لئے ایک ایک کر کے مذکورہ پہلوؤں پر آپ کے سامنے روشنی ڈالی جاتی ہے۔
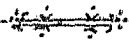
(۱) قرن اوّل کے مسلمانوں کا عمل بالقرآن

کیا یہ سچ ہے کہ قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقی حاصل کی؟ شخصیتوں سے مرعوب ہوئے بغیر دل کی لگتی کہنا، قرآن کو سامنے رکھکر بتانا کہ کیا قرآن میں کہیں اس کا حکم ہے کہ تلوار لے کر آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کر دو، امن و امان کو غارت کر دو اور لوگوں کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرو۔ اگر یہ سب "عمل بالقرآن"

ہی تھا تو غیر مسلمین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ اسلام خونریزی کا حامی ہے اور وہ تلوار کے زور سے اپنی اشاعت کرتا ہے۔ کیا اپنے کسی دعوے کی حمایت کے لئے اسلام کے دامن کو داغدار بنا دینا گوارا کیا جا سکتا ہے؟

کیا قیصر و کسریٰ کے نظام حکومت کا رواج تعلیم قرآن کے مطابق تھا؟

کیا سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کا رواج جس کے خلاف ابوذر غفاری احتجاج کرنے اٹھے تھے عمل بالقرآن کا نتیجہ تھا؟

کیا دمشق اور بغداد کی جہانداریاں صاف اور ستھرے اور سادے اسلام اور تعلیم قرآن کے موافق تھیں؟

کیا عیش و عشرت کی گرم بازاریاں اور توبہ شکن حلقوں میں "مقدس" درباروں کی آتش آشامیاں قرآن کے رو سے بالکل مناسب تھیں؟

کیا جمل اور صفین کی میدان داریاں، خود مسلمانوں کے گلوں پر مسلمانوں کی شمشیر آزمائیاں اور آپس کی فتنہ سامانیاں بہرصورت تعلیم قرآن کا مظاہرہ تھیں؟

حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ الفاظ میں اتنی طاقت ہرگز نہیں کہ وہ انسانی حافظہ سے واقعات کی یاد محو کر سکیں۔

کیا کربلا کا تاریخی واقعہ کسی عبارت آرائی کے زور سے مٹ سکتا ہے؟ اور کیا جنگ حرّہ اور مدینہ و مکہ کی شرمناک داستانیں فنا ہو جائیں گی؟

ممکن ہے کہ "خیر القرون" کو سراہنے والے مسلمان آج ناواقف غیر مسلموں کے سامنے پرانے زمانہ کے مسلمانوں کو قرآن کا جامہ پہنا دیں اور ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا لیں مگر تاریخ کی دوربین سے اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے "گھر کے بھیدی"

مسلمان بھی کیا اس فریب خیال کا شکار بن سکیں گے ؟

بڑے نیک طینت بڑے پاک باطن ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں

گنتی کے آدمیوں کو چھوڑ کر جن کی بدولت خواہ اُس زمانہ کو خیر القرون کہہ لو اور خواہ جو مقدس نام چاہو بنا لو، جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے اتنی تاریکی نظر آرہی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا "دور جہالت" اُس کے سامنے مات ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ عام طور پر نہ مسلمانوں نے قرآن میں تدبر کیا، نہ قرآن کے معانی کی تشریح میں حقیقی رہنماؤں کا دامن تھاما، نہ اُن عملی مثالیوں پر نظر ڈالی جنھوں نے اپنی سیرت کو قرآنی تعلیمات کی تصویر بنا رکھا تھا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کو اپنی ناقص سمجھ، ذاتی خیالات اور نفسانی خواہشوں کا جولانگاہ بنا لیا اسی کا نتیجہ تھا مسلمانوں کی وہ ابتری، پراگندگی اور پریشانی جس کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اب آج بھی مسلمانوں کو اس پردہ میں کہ "قرآن مشکل نہیں، آسان ہے" اسی کی تلقین کی جائے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی ترقی یا اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بے شک اپنی من مانی باتوں کو از روئے قرآن جاہلوں کے ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوگی۔

وہ ناواقف بارہے کا سید جو عربی کے سر پیر سے واقف نہیں یہ سنکر خوش ہو جاتا ہے کہ قرآن میں میرے وطن کا نام بڑی مہربانی سے "برادر" کی لفظ کے ساتھ موجود ہے۔ یومئذ تحدث "اخبارھا" اس بیچارے کو کیا خبر کہ یہ "اخ" برادر کے معنی میں نہیں اور وہ "بارھا" شہر کا نام نہیں ہے بلکہ "اخبار" ایک لفظ ہے جو خبر کی جمع ہے اور وہ "ھا" کی طرف مضاف ہے جو مؤنث کی ضمیر ہے۔ مگر یہ باتیں اُس کے سامنے کہو تو

وہ سمجھے گا کہ عالموں کی اُلٹی سیدھی تاویل ہے اور لہک لہک کر بار بار علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھے گا ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند

اُس کے نزدیک جمع اور مضاف اور مؤنث کی ضمیر کی بحثیں اتنی دشوار ہیں کہ "پاژند" معلوم ہوتی ہیں اُسے تو آسانی اسی میں معلوم ہوگی کہ وہ کہے "اخ بادھا" یعنی بار با جو سادا کی لبستی ہے یا قرآن میں انگریزی زبان کی لفظ تلاش کرنے والا خوش ہو جائے یہ آیت سنکر

ولم یکن لہ کفُ ۔ واً ۔ احدٌ ۔

وہ اسے یوں سمجھتا ہے کہ ولم یکن لہ کف one احد

سمجھتا ہے کہ وَنْ انگریزی کا لفظ ہے ۔

اب اگر کسی بیچارے عالم کی شامت آئی اور اُس نے کہا یہ وَنْ انگریزی کا لفظ نہیں ہے یہ تو کفو کی لفظ کا جزو ہے اور تنوین سے نون کا تلفظ پیدا ہوا ہے جو اعرابی حرکت ہے کوئی مستقل لفظ نہیں ہے تو وہ فوراً کہنے لگے گا ۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند

اُس کے نزدیک یہ عالمانہ تشریح تاویل اور پاژند ہے اور سیدھی سادھی بات جو قرآن سے نکلتی ہے وہ یہی کہ وَنْ بمعنی واحد انگریزی ہے اور اُس کی تفسیر ہے لفظ "احد" اور اس طرح اُس کے نزدیک ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن خود اپنا مفسر ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں ۔

بتائیے اس "بوالہوسی" کا کیا علاج کیا جائے اور اب "شیوۂ اہل نظر" کی آبرو کہاں رہ سکتی ہے ۔

یہ بھی دیکھ لیجیے کہ قرآن کے عجیب و غریب معنی اور تفسیریں جو لکھی گئیں، عجیب و غریب مسئلے جو گڑھے گئے، قرآنی آیتوں کو وہ معانی پہنائے گئے جو کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سب اُسی دور کی پیداوار ہیں جسے قرن اول کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں۔

بعد کے مسلمان تو سب زلہ خوار ہیں انہی اگلے زمانہ کے مفسروں کے اور انہی کی تفسیروں میں سے کسی ایک کو لے کر اُس پر اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مگر وہ مفسرین جنکی تفسیروں نے عجیب و غریب معانی کی بنیاد رکھی اور عجیب و غریب مسائل کی داغ بیل ڈالی وہ یہی صدر اسلام کے مفسرین ہیں جیسے مجاہد، ضحاک، سدی، کلبی، مقاتل وغیرہ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے اقوال سے کتب تفاسیر بھرے پڑے ہیں۔

پھر یقین جانئے کہ عجیب و غریب معانی کی ایجاد اور تاویلوں کی تراش خراش سب اسی اصول کے ماتحت تھی کہ قرآن آسان ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ سے اُسکے معنی بنا سکتا ہے۔ یہی وہ خیال تھا جو جمہور اسلام میں عام طور پر پھیلایا گیا اور اسی کے ماتحت قرآن کے آیات بازیچۂ اطفال بنائے گئے۔ اس کے برخلاف اہلبیت رسولؐ کا یہ اعلان تھا کہ قرآن کے معنی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اور اس کے لئے بڑے معلومات کی ضرورت ہے۔ ان کا اعلان یہ تھا کہ قرآن فہمی آسان نہیں، بہت مشکل ہے اور اسکے لیے خاص رہنمایان دین کے ساتھ جن کو رسولؐ کے تشریحات براہ راست پہونچے ہیں تمسک کی ضرورت ہے۔

جمہور اسلام نے ائمہ اہلبیت کی اس تعلیم کو نہ پہلے کبھی مانا، اور نہ بعد میں اب تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اُس ترقی و تنزل کو جو جمہور مسلمین کے ساتھ متعلق ہے اس عقیدہ سے کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے؟

مسلمانوں نے کسی وقت انتہائی ترقی کی اور اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہو گئے۔
یہ ممکن ہے بجائے خود حقیقت ہو مگر اسے قرآن فہمی کے کسی نظریہ سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔
اس کا سبب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کہ مسلمان شروع شروع اس سادہ اور مساویانہ نظام زندگی پر بربنائے عادت چلتے رہے جس کو پیغمبر اسلام نے رائج کیا تھا اور فطرت کے اس پیغام کو لے کر آگے بڑھے جو دلوں پر قبضہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا، اس لئے وہ فتوحات حاصل ہوئے جنھیں آج ان کی بہت بڑی ترقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن یہی ترقی تنزل کا پیش خیمہ بن گئی اس لئے کہ ان میں ملوکیت کا دور دورہ ہو گیا اور سلطنت و کامرانی نے عیش و عشرت کا عمل دخل کر دیا۔ کچھ دن تک لوں پر بیٹھی ہوئی دھاک نے قوموں کا سر اٹھنے نہ دیا لیکن جب ان کی عملی کمزوریاں طشت از بام ہوئیں اور آنکے "رازہائے درون خلوت" افسانۂ ہر انجمن بن گئے تو سرگرم عمل قوموں کی جرأت بڑھی ان کی آپس کی رقابتوں اور داخلی کمزوریوں نے دشمن کی امداد کی اور آخر وہ ہوا جس کی بنا پر آج کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔
اگر وہ ان کی ترقی سچے قرآن کے اصول کو سمجھ کر انہی حدود و قواعد کے باعث ہوتی تو وہ کبھی تنزّل سے تبدیل نہ ہوتی۔
وہ جماعت جو اقلیت میں تھی، جس کے سرگروہ اہلبیت معصومین تھے انھوں نے قرآن کے بارے میں مطلق العنانی اور غیر مشروط آزادہ روی کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کئے اور ان کے تحت میں تدبّر فی القرآن کا حکم دیا۔ ان کے مختصر گروہ نے ہزاروں مادی شکنجوں کے اندر گرفتار رہ کر بڑے روحانی فتوحات کئے اور دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس نے اتنے مشکلات اور مصائب کے باوجود اس طرح اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہو اور اپنے دائرہ میں توسیع جاری رکھی ہو۔ یہاں تک کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں کچھ نہ کچھ افراد

اُس کے ایک اصول، ایک مسلک اور ایک طریقہ کے پابند موجود ہیں۔ ان کی چاہے یہ ترقی سمجھیے یا تنزل، بہرحال وہ ایک محدود اور معتدل سطح پر ہمیشہ رہے۔ نہ دور نکر زیادہ چلے اور نہ گرے اور وہ ہمیشہ ایک راستہ پر قائم رہے کہ قرآن فہمی کوئی آسان بات نہیں مشکل ہے اور اسلئے انھوں نے تنہا قرآن کو اپنی رہنمائی کے لئے کافی بھی نہ سمجھا بلکہ اہلبیت کے دامن سے تمسک ضروری خیال کیا۔ اب ان میں اگر روحانی حیثیت سے کچھ تنزّل نظر آرہا ہو تو اس کا سبب یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جو "ہمرنگ جماعت" بن کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور ہر شخص بذات خود اُس سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اُسکے لئے کسی غیر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔

دوستو! یہ خیال ہماری قومی زندگی کے لئے راس نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ "رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا"

غالبًا اس ادعا کے موقع پر پیش نظر ایران یا پنجاب اور حیدرآباد کے بابی وہابی، قادیانی، چکڑالوی اور مہدوی فرقے ہیں جو انھی آخری دنوں کے پیداوار ہیں۔ ورنہ جہاں تک اسلام کے اُن فرقوں پر نظر ڈالی جاتی ہے جن کے عقائد کتابوں میں مدوّن ہیں اور جن کے اختلافی مسائل پر بحث سے علم کلام کی تشکیل ہوئی ہے۔ وہ تمام فرقے رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی پیدا ہو رہے ہیں۔

اسکے علاوہ اگر آپ صدر اسلام کے واقعات پر نظر ڈالیے تو ان سے بھی معلوم ہوگا کہ اُس زمانہ میں بھی قرآن کی مختلف تاویلیں کی جاتی تھیں اور اسکے معانی میں اکثر دشواری محسوس کی جاتی تھی۔

پھر بتائیے کہ کون سا وہ دور ہو سکتا ہے جب قرآن کے معانی و مطالب بالکل چیستاں کی حیثیت رکھتے تھے اور اُن میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

بے شک قرآن کے مشکل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل "چیستان" ہے یعنی اُسے کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

یقیناً اہل زبان اُس کے ظاہری معانی سے بہرہ اندوز ہوے اور اسی کا اثر تھا کہ مشرکین مسلمان ہوے اور انھوں نے اُسکے غیر معمولی اعجاز کا اندازہ کیا مگر غیر عربی داں طبقہ کے لئے یہ بات بھی مفقود ہے۔ ان کے لئے قرآن کو آسان کہہ دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں۔

(۲) بلاغت کا مفہوم

"کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور سادہ زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے۔"

سوال یہ ہے کہ پڑھنے والا کون؟ ہر پڑھنے والا خواہ وہ زباں داں ہو یا غیر زباں داں؟ سمجھ دار ہو یا ناسمجھ؟ حاضر الذہن ہو یا پریشان دماغ؟ اگر بلاغت کا معیار یہ ہے اور کسی کتاب کی خوبی یہی ہے تو عالم امکان میں کوئی کتاب بلکہ کسی متکلم کا ایک جملہ بھی اس معیار پر ٹھیک نہیں اترتا۔

جب تک دنیا میں زبانیں مختلف ہیں۔ جب تک کہ دل و دماغ کی طاقتیں جداگانہ ہیں۔ جب تک سننے والوں کی کیفیتوں میں اختلاف ہے اُس وقت تک تو یہ ناممکن ہے کہ کسی کلام سے ہر پڑھنے والا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اس لئے کم از کم آپ کو یہ قید تو لگانا ہی پڑے گی کہ جس زبان میں وہ کلام ہے اُس زبان کے واقف کار اُس کلام کو سمجھ سکیں اور اس

قید کے لگانے کے ساتھ ہی قرآن کی اس آسانی سے اردو داں طبقہ کی محرومی ظاہر ہے۔

خود ایک زبان میں مختلف مقامات کے محاوروں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک کلام سب کے لئے مساوی نہیں ہو سکتا مختلف شہروں کی زبان جدا، شہر اور دیہات کی زبان بالکل الگ، بلند اور سفید پوش طبقہ اور بازاری لوگوں کی زبان علیحدہ اور مردوں عورتوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے زبان کے اکثر فقرے ایسے ہوں گے جو کسی کے لحاظ سے آسان اور کسی کے لحاظ سے مشکل ہوں۔ نتیجہ صاف ہے کہ سب کے لئے اُن کی آسانی قائم نہیں رہ سکتی۔

اب میں نہیں سمجھتا کہ بلاغت کے مذکورہ معیار پر کونسا کلام وہ ہوگا جسے بلیغ کہا جاسکے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جو مخصوص مخاطبین کے لحاظ سے جن کو براہ راست متوجہ کر کے وہ کلام کیا جارہا ہے دشوار گزار نہو مگر اس صورت میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر شخص کے لئے آسان ہی ہوگا اور کسی کو اس کے سمجھنے کے لئے شرح اور تفسیر کی ضرورت نہو گی۔
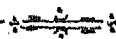
پھر قرآن کی اگر وہ حیثیت ہے جیسا کہ معترض نے کہا ہے کہ وہ لکچروں کا مجموعہ اور اُن لکچروں کے ضمن میں جو خاص سوالات ہوئے ہیں اُن کا جواب بھی ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ لکچر کے ماحول، حاضر الوقت اشخاص کے معیار فہم اور سائلین کی ذہنیت کا لحاظ ضروری ہے یہی بلاغت کا حقیقی تقاضا ہے۔

اس سے عمومی آسانی کا نتیجہ کہیں بر آمد ہو سکتا ہے؟
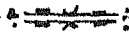
اس پر بھی غور کر لیجئے کہ زبان میں زمانہ کے امتداد سے کتنے انقلابات ہو جاتے ہیں۔ قرآن کی تنزیل کو ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ ہوئے ہیں غیر ممکن ہے کہ اس مدت میں تمام محاورات اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے خالص عرب اہل زبان بھی قرآن کے معانی کو صرف اپنی زبان دانی کے بھروسے پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ انھیں بھی قدیم محاورات عرب کے تتبع، قدیم ذخیرہ ادب پر عبور، اور آیات واحادیث کے مختلف استعمالات میں غور و خوض کی ضرورت ہے اور اس لحاظ سے قرآن اُنکے لیے بھی بالکل آسان نہیں ہے۔

اس کے بعد جہاں تک فصاحت اور سلاست کا تعلق ہے وہ الفاظ کے لغوی معانی اور کلام کے عرفی مفاہیم ہو سکتے ہیں لیکن جو کسی خاص شعبہ کے اصطلاحات ہوتے ہیں وہ بہر حال اُس شعبہ کے ماہرین کی تشریح پر موقوف ہوں گے۔ قرآن ایک خاص شریعت کا ترجمان بن کر آیا تھا اس لئے اس میں اس قسم کے الفاظ اور معانی کی کمی نہیں ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج، خمس، انفال، جہاد وغیرہ سب اصطلاحی لفظیں ہیں۔ اس کی تشریح ہرگز صرف زباں دانی کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ماہرین شریعت کی تفسیر کی ضرورت ہوگی۔

اس صورت میں کیسے کہا جاسکے گا کہ قرآن بالکل آسان ہے اور ہر شخص اُسے سمجھ سکتا ہے۔

پھر اب غور کیجئے کہ کلام کا مشکل ہونا جو بلاغت کے خلاف ہے اور جس کے لحاظ سے کلام کو آسان ہونا چاہیئے وہ کیا ہے؟

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ ہو جس کی وجہ سے اصول محاورہ کے واقف اہل زباں اُس کے معنی کو نہ سمجھ سکیں خواہ وہ الجھاؤ

ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہو۔ اس کو اصطلاحاً "تعقید" کہتے ہیں یا الفاظ ایسے صرف کیے گئے ہوں جن کے مفہوم کے لیے عام طور پر فصحاء اہل زبان کچھ دوسرے الفاظ صرف کرتے ہیں اور ان الفاظ سے وہ واقف نہیں ہیں اس کو "غرابت" کہتے ہیں۔

لیکن اگر کلام بجائے خود اصول محاورہ کے مطابق ہے اور اُنہی الفاظ پر مشتمل ہے جو اُس کے دورِ ورود میں فصحاء کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے مگر اب ہمارے لئے مشکل ہے اس وجہ سے کہ ہم اُس زبان سے یا اُس دور کی زبان کے خصوصیات سے ناواقف ہو گئے ہیں تو اس طرح مشکل ہونا ہرگز کلام کا عیب نہ ہوگا بلکہ ہمارا نقص ہوگا کہ ہم اُسکے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ایک ہوتے ہیں کلام کے لفظی معنی، یہ تو ایک کلام سے جو کہ سلیس زبان میں ہو ہر زبان داں جو اُن محاورات سے واقف ہو سمجھ لے گا اور اگر نہ سمجھے تو خیر مان لیجئے کہ کلام کا نقص ہو لیکن ایک ہوتے ہیں وہ مطالب جو لفظی معانی کی تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں، جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا غور کیا جائے اُتنے نتائج اور حقائق کلام سے زیادہ منکشف ہوتے جائیں۔ یہ وہ چیز ہے جو متکلم کی بلندی اور قابلیت کے لحاظ سے گہری ہوتی چلی جاتی ہے اور کلام کے اس حیثیت سے سمجھنے کے لحاظ سے انسانی جماعت کا مجمع اُتنا ہی چھٹتا جاتا ہے جتنے بلند متکلم کا وہ کلام ہے۔

اب اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن ایک غیر معمولی درجہ کا کلام ہے تو ضرور اُس میں یہ بلندی موجود ہوگی اور یقیناً انسانی دماغ کی ایک بلند سطح ہی وہ ہوگی جو اُس کے معانی و نکات کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔

اگر اُس میں یہ بات نہیں ہے اور وہ بالکل ہی سطحی باتوں پر مشتمل ہے جن کو ہر معمولی انسان پوری طرح سمجھ لیتا ہے اور اس کے آگے اس میں کچھ نہیں ہے تو یہ "آسانی" یقیناً اُسکا نقص ہو۔

اس صورت میں وہ بلند طبقہ کے انسانوں سے اپنی عظمت تسلیم نہیں کرا سکتا اور نہ اُن سے اپنی فوقیت کا اقرار لے سکتا ہے۔

(۳) قرآن سے ثبوت

اب خود قرآن سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اپنے کو آسان بتاتا ہے یا مشکل؟ اس کیلئے ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) متعدد آیات میں رسول کے فرائض میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ پ یتلوا علیھم ایاتك ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔
پ۲ یتلوا علیکم ایاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ۔
سورہ آل عمران پ۴ وسورہ جمعہ پ۲۸ یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ
اس سے ظاہر ہے کہ رسول کا کام تھا آیات کتاب کو پڑھ کر سنانا (یہ کام الفاظ سے متعلق ہے) اور اُس کتاب کو تعلیم دینا (یہ معانی سے متعلق ہے)۔
اگر قرآن آسان ہوتا اس طرح کہ ہر شخص اُس سے خود ہی سب کچھ سمجھ لیتا تو تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔

(۲) ھو الذی انزل علیك الکتاب منہ ایات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب۔

"اُس نے تم پر کتاب اتاری جس میں کچھ تو کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو "ام الکتاب" ہیں اور کچھ "متشابہ" آیتیں ہیں۔ پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہوتی ہے وہ پیروی کرتے ہیں انھی اجزاء کی جو متشابہ

ہیں فتنہ پردازی اور تاویل سازی کے لئے، حالانکہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو مگر خدا اور راسخین فی العلم، کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے اور نہیں یاد داشت حاصل کرتے مگر وہ لوگ جو سمجھدار ہوں"۔

اب آپ دیکھئے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ اس میں دو قسم کی آیتیں ہیں کچھ آسان اور کچھ مشکل۔ اور یہ کہ مشکل آیتوں کی اصلی تاویل کو سب نہیں جانتے بلکہ اس کے جاننے والے مخصوص ہیں۔ ہم نے ترجمہ میں "ام الکتاب" اور "متشابہ" کی اصلی لفظوں کو اس لئے لکھ دیا کہ قرآن کو آسان کہنے والے خود ہی اس کے معنی سمجھ لیں تفسیر کی کیا ضرورت ہے۔

(۳) سورۂ ص پ۲۳ کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا ایاتہ ولیتذکر اولوا الالباب۔
یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، بابرکت تاکہ یہ لوگ اس کے آیات میں غور کریں اور تاکہ صاحبان عقل اس سے یاد دہانی قبول کریں"۔

جو شے بالکل کھلی ہوئی اور آسان ہو اسکے لیے غور کی ضرورت نہیں ہوتی نیز صاحبان عقل و فہم سے مخصوص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل سطحی مطالب پر مشتمل نہیں ہے۔

(۴) سورۂ محمد پ۲۶۔ افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا۔
اس آیت میں لوگوں کا شکوہ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے، کیا انکے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں اگر قرآن بالکل سطحی ہوتا تو غور و خوض کی ضرورت نہ ہوتی۔

(۵) ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔
"اس میں یاد دہانی ہے اس کے لئے جو دل و دماغ رکھتا ہو یا کان لگائے اس حالت میں کہ حاضر الذہن ہو" جو چیز بالکل سطحی اور آسان ہوتی ہے اسکے لئے ان شرط کی ضرورت نہیں ہر شخص خود ہی آسانی سے سمجھ لیتا ہے اب اگر کچھ آیتیں ایسی ہیں جو بتلاتی ہیں کہ قرآن آسان ہے تو اس کے معنی وہی سمجھنا چاہیں جو ہم نے

"بلاغت" کی بحث میں اس کے پہلے لکھے ہیں یعنی اس کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ نہیں ہے جس کی وجہ سے اصول محاورہ کے واقف اہل زبان اس کا مطلب سمجھ سکیں اور یہ کہ اسکی زبان آسان ہے نہ یہ کہ اس کے مطالب بالکل سطحی ہیں جن کو ہر شخص بغیر کسی غور و تامل کے سمجھ سکتا ہے۔

پھر ذرا ان آیات پر نگاہ بھی ڈال لیجئے۔

کچھ وہ آیتیں ہیں جن میں کتاب مجید کے "مفصّل" ہونے کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس تفصیل میں خود قید موجود ہے (لقوم یعلمون) ملاحظہ ہو آیت حم تنزیل من الرحمن الرحیم کتاب فصلت آیاتہ قرآناً عربیا لقوم یعلمون —

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ونفصّل الآیات لقوم یعلمون ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا مفصل ہونا ہر شخص اور ہر جماعت کے لحاظ سے نہیں ہے۔

پھر ان آیات سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن ہر شخص کے لئے آسان ہے اور اہل علم کی تشریح و تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔

کچھ وہ آیات ہیں جن میں قرآن کی زبان کو "مبین" کے وصف سے یاد کیا ہے مگر ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ خود قرآن کو آسان کہنے والوں کی زبان سے سن لیجئے۔

"قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے"۔

اب بتائیے کہ اس آسانی سے غیر عربی داں طبقہ کو بلکہ اُن کو جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ وہ بہر حال اہل زبان کی تشریح و تفصیل کے محتاج ہوں گے اور تفسیر کی ضرورت باقی رہیگی۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ جو ایک زبان میں زیادہ آسان ہوگا وہی دوسری زبان میں زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔

بات یہ ہے کہ زبان کی آسانی، روزمرہ کے محاورات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور محاورے ہی وہ

ہوتے ہیں جن کا ترجمہ بعض اوقات مشکل اور بسا اوقات غیر ممکن ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر اپنی زبان میں مشکل عبارت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں استعارے کنائے صرف ہوئے ہیں یا دقیق مطالب ہیں اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دوسری زبان میں منتقل ہو سکتی ہیں۔

پھر اگر قرآن کو عربی زبان والوں کے لئے آسان کہا بھی گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکل سکتا ہے کہ وہ سب کے لئے آسان ہے اور مطلب تو یہی تھا کہ ہمارے اردو داں طبقہ کو آسانی پیدا ہو اور انھیں علماء سے دریافت کرنے اور تفسیر و تشریح کی جستجو کی ضرورت نہ ہو مگر یہ مطلب قرآن کی آیتوں سے کسی طرح نہیں نکلتا۔

(۴) قرآن کا مطالعہ

"ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں"

مجھے نہیں معلوم قرآن کو پڑھکر دیکھنے کا کیا مطلب ہے۔ اصل الفاظ قرآن کو دیکھکر؟ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سمجھنا عربی دانی پر موقوف ہے اور غیر عربی داں ہرگز نہیں سمجھیں گے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ترجمہ کو پڑھ کر؟ بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے ثبوت میں بہت سا وقت قرآن کی آیتوں کے ترجمے پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ یہ ترجمے سب عربی داں لوگوں کے کئے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سمجھ میں آجاتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ترجمے آسان ہیں لیکن یہ نہیں ثابت ہوگا کہ قرآن بالکل آسان ہے۔

آسان ہونے کے ثبوت میں اپنی سمجھ کا مظاہرہ اس طرح کرنا کہ قرآن کے معنی لکچر کے ہیں (یہی غلط ہے۔ قرآن کے لفظی معنی "لکچر" کے نہیں ہیں بلکہ "ریڈنگ کے" ہیں)

اور ان لکچروں کا موضوع یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ قیامت پر ایمان لاؤ وغیرہ یہ سب باتیں، بالکل آسان ہیں لہذا قرآن آسان ہے۔

میرے خیال میں اگر آسان ہونے کا یہی معیار ہے کہ اس طرح کا ایک خلاصہ آدمی سمجھ لے تو دنیا کی کوئی کتاب مشکل نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی دقیق فلسفہ کی کتاب آسان ثابت کی جا سکتی ہے یہ کہہ کر کہ اس کا موضوع یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کن باتوں کے کیا اسباب ہیں۔ اور منطق کی کتاب اسکا موضوع یہ ہے کہ کن طریقوں سے نامعلوم باتیں معلوم کی جائیں وغیرہ وغیرہ مگر کوئی کتاب جو مشکل ہوتی ہے وہ اُن جزئیات اور خصوصی مطالب کے لحاظ سے جو اُس عام موضوع کے تحت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس لئے قرآن کو اُس مجمل خلاصہ کے اعتبار سے نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اُس کے تفصیلی مضامین کے لحاظ تب آسان اور مشکل ہونے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کی آسانی کے ثبوت میں بہت سی آیتوں کے تراجم پیش کئے گئے ہیں مگر یاد رکھنے کہ تراجم سب تفسیر کے ماتحت ہیں یعنی جس قسم کی تفسیر کو مترجم نے قبول کیا ہے اُسکے مطابق آیت کا ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم سے مدد لینا حقیقۃً تفاسیر کا پابند بننا ہے۔ پھر تفسیر سے بے نیازی کا دعویٰ کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

ترجمے صرف تحت اللفظی معنی پر مشتمل نہیں ہوا کرتے ورنہ بعض اوقات شاید اُن سے کچھ بھی مطلب سمجھ میں آئے بلکہ بریکٹ میں توضیحی الفاظ یا محذوفات کی خانہ پری کے لئے ضمیمے درج کئے جاتے ہیں۔ اس کا اقرار خود سالقہ دلائل کے ذیل میں موجود ہے کہ "مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے۔ قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے"۔

اس طرح کے ترجموں کو حقیقۃً ایک مختصر تفسیر سمجھنا چاہیئے پھر ان ترجموں کی مدد سے اگر قرآن آسان ہو گیا تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکلے گا کہ وہ بغیر تفسیر کی مدد کے خود آسان ہے۔

بے شک اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں مگر یہ اُس وقت ہے جب کوئی شخص تنہا الفاظ قرآن سے معنی سمجھ لے لیکن اگر اُس نے مترجمین کی تفسیروں سے مدد لے کر معنی سمجھے تو تفاسیر بے کار کہاں ثابت ہوئے؟

شان نزول کو بے کار سمجھنا یہ کہکر کہ عام طور سے اصول بیان کیے جاتے ہیں اور اصول شان نزول کے پابند نہیں ہوتے، بالکل غلط ہے۔ اکثر آیتیں بنیادی حیثیت سے شان نزول ہی سے مخصوص ہیں مثلاً قرآن میں کہا گیا الیوم اکملت لکم دینکم الخ آج میں نے تمہارے دین کو کمل کیا۔"

جب تک کہ معلوم نہو آیت کس دن اتری "آج" سے کیا مطلب سمجھا جائے ۔

یا یہ آیت کہ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصّلٰوۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون اگر خصوصیت واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ عام اصول کہاں ہے کہ جو حالت رکوع میں زکوٰۃ دیدے اُسکے واسطے ولایت ضرور ثابت ہوگی ۔

یا یہ آیت کہ علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم ۔

آخر کس عام اصول کی حامل ہے۔

یہ کہنا کہ "عام طور پر سورے نازل ہوتے تھے متفرق آیتیں نہیں اترتی تھیں "۔

حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ چھوٹے سورے تو خیر اکثر ایک ساتھ اترے ہوئے بھی ہیں مگر جو بڑے سورے ہیں اُن میں خود آیات کا مضمون صاف بتلاتا ہے کہ وہ مختلف موقعوں پر اتری ہوئی ہیں۔ اگر سورے ایک ساتھ نازل شدہ ہوتے تو آیتوں میں ناسخ اور منسوخ آیت ایک ہی سورے میں موجود نہ ملتی خصوصاً اسطرح کہ ناسخ پہلے اور منسوخ بعد کو۔ نیز مکی اور مدنی آیتیں مخلوط نہ ہوتیں۔ حالانکہ موجودہ ترتیب قرآن میں یہ سب کچھ باتیں ہیں ۔

اس کا ذکر ہمارے رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

اب مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کیجیے کہ قرآن مشکل ہے یا آسان ؟

واللہ یحق الحق بکلماتہ

علی نقی النقوی

۷ رجب ۱۳۶۰ھ لکھنؤ

۱۳۔ نزہتہ اہل الحرمین فی عمارۃ المشہدین (عربی) خاتمۃ المحدثین علامہ سید حسن صدر الدین کاظمینی اعلی اللہ مقامہ کی گرانقدر تصنیف ہے، جسے پہلی بار ادارۂ الرضوان لکھنؤ نے شایع کیا .... قیمت علاوہ محصول ۴ر

۱۴۔ حاشیۂ کفایت الاصول (عربی) مصنفۂ حجۃ الاسلام آقا میرزا ابوالحسن مشکینی نجفی طاب ثراہ .... قیمت علاوہ محصول .... للعہ

۱۵۔ الذریعہ الی تصانیف الشیعہ (عربی) مصنفۂ علامہ شیخ محسن طہرانی دام ظلہٗ

.... جلد اوّل ... قیمت علاوہ محصول .... للعہ

۱۶۔ .... جلد دوم ... ” ” ” ” .... للعہ

۱۷۔ .... جلد سوم ... ” ” ” ” .... للعہ

۱۸۔ مجلہ الرضوان (عربی) .... سال اول .... ہے ر

۱۹۔ الرضوان (عربی) .... سال دوم .... ہے ر

۲۰۔ الرضوان (عربی) .... سال سوم .... ہے ر

۲۱۔ الرضوان (عربی) .. (بعض اعداد) .. سال چہارم و پنجم .... عہ ر

مرکز اصلاح کا لٹریچر

ذاکری کی پہلی کتاب حصۂ اوّل، اس میں عشرۂ محرم کے لیے دس مجلسیں ہیں، مختصر ذاکری کرنے والے حضرات کے لیے .... قیمت علاوہ محصول ۳ر

ذاکری کی پہلی کتاب حصۂ دوم، اس میں اربعین کے زمانے کے لیے دس مجلسیں ہیں مختصر ذاکری کرنے والے حضرات کے لیے .... قیمت علاوہ محصول ۳ر

شادی خانہ آبادی، اس میں شادی کے رسوم پر عالمانہ اور مصلحانہ تبصرہ کیا گیا ہے .... قیمت علاوہ محصول ۲ر

ان تمام کتابوں کے ملنے کا پتہ

"ادارۂ علمیہ" نمبر ۲۵۹۲

عبد العزیز روڈ، لکھنؤ